

پہلوپال

تحریکات آزادی کے آئینہ میں

سید عابد علی وجدی اجمینی

(قاضی شہر پٹوہ پال)

کیمیاۃ اللہ

414

پٹوہ پال، ملک شاہ پور، پٹوہ پال

جھوپال

تحریک آزادی آئینہ میں

سید عابد علی دہلوی اسیٹنی
(قاضی شہر جھوپال)

جھوپال بک ہاؤس بدھوارہ جھوپال

بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں

(C) مصنف

ایک ہزار

پہلا ایڈیشن

۱۹۸۶ء

سالِ اشاعت

کلاسیکل پرنٹرس دہلی

طباعت

قیمت

ساتھ روپے

عبدالباسط خاں

ناشر

بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ - بھوپال

فہرست مضامین

۳	فہرست
۱۱	دیباچہ
۱۳	پیش لفظ
۲۲	مشرق و مغرب کا تقابلی مطالعہ
۲۵	مشرق و مغرب کی تاریخی کشمکش
۳۶	تاریخ اسلامی ہند کے تین دور
۶۱	مسلم دور حکومت میں دینی تحریکات
۷۳	دعوت دلی الہی کا ظہور
۷۸	دعوت دلی الہی کا پس منظر
۸۱	ایرانی و تورانی آدیزش
۸۲	ادزنگ زیب کی اصلی شخصیت
۸۸	شاہ دلی اللہ کا تعارف
۹۱	دلی الہی دعوت کا ماحول
۹۳	انیسویں صدی کی مادیت
۹۶	قانون اشارہ و قرابانی
۹۹	اشتراکیت کا نظریہ
۱۰۰	روس میں اشتراکیت کی کامیابی
۱۰۳	شاہ صاحب کا انقلابی پروگرام
۱۰۵	دلی الہی حکمت اور اس کے اصول

۱۰۵	قرآنی رہنما اصول
۱۰۷	۴ اقتصادی توازن دلی الہی حکمت کی روشنی میں
۱۱۰	اسلامی معاشیات کا معتدل نظام
۱۱۵	اقترابات و ارتفاقات
۱۱۶	مذہب کے اصل الاصول
۱۱۸	مرزا مظہر جان جاناں کے تصدیقی کلمات
۱۱۹	شاہ صاحب کے اقتصادی اصول
۱۲۰	سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول
۱۲۱	مذہبی حقوق
۱۲۳	شاہ صاحب کی دعوت کی اساس
۱۲۹	دلی الہی پارٹی کا اقدام
۱۳۰	دلی الہی دعوت کی کامیابی
۱۳۲	دلی الہی پارٹی کی تشکیل
۱۳۸	مالوہ کی مختصر تاریخ
۱۴۱	پرمار خاندان
۱۴۲	پون دار خاندان
۱۴۶	خط بھوپال کی پھیلی تاریخ
۱۴۷	بھوپال کے آثار قدیمہ کی دریافت
۱۴۷	عہد مانسی کے تین حکومتی دور
۱۴۸	شہر بھوپال کی پہلی تشکیل
۱۴۹	بھوپال تال

۱۵۰	ریاست بھوپال کی اجمالی تاریخ
۱۵۲	حکومت مغلیہ کا زوال اور ریاست بھوپال
۱۵۴	سیاست ہند میں سرحدی چٹھاؤں کا داخلہ
۱۵۷	بانی ریاست سردار دوست محمد خان
۱۵۸	سردار صاحب کی خوش آئند ترقیات کا عروج
۱۵۹	نواب یار محمد خان
۱۶۱	ماں جی مولابی
۱۶۱	نواب فیض بہادر شاہ
۱۶۳	نواب حیات محمد خان
۱۶۴	دیوان چھوٹے خاں کے کارنامے
۱۶۴	نواب وزیر الدولہ
۱۶۵	نواب نظر محمد خان
۱۶۶	نواب قدسیر بیگم
۱۶۶	نواب جہانگیر محمد خان
۱۶۸	نواب سکندر جہاں بیگم
۱۶۹	نواب شاہجہاں بیگم
۱۷۲	شاہجہانی تعمیرات
۱۷۳	تحریک جہاد اور نواب صدیق حسن خان
۱۷۵	نواب صاحب کے خاندانی تعلیمی حالات
۱۷۸	دلالت و تعلیمی زندگی
۱۸۰	عملی زندگی کا آغاز
۱۸۳	

۱۸۴	۶	بھوپال آمد
۱۸۴		سفر حجاز
۱۸۵		دور ارتقار
۱۸۶		تحریک جہاد کا منصوبہ
۱۸۶		انقلابی اقدامات
۱۹۱		باغیانہ لٹریچر اور اس کی اشاعت
۱۹۲		نواب صاحب کے خلافت گورنمنٹ کی دازنگ
۱۹۸		نواب صاحب کی نوابی سے معزز دلی و برطانی
۱۹۸		تحریک کی ناکامی کے اسباب
۲۰۲		وفات
۲۰۴		سراج الہند شاہ عبدالعزیز اور بھوپال
۲۰۸		دلی الہی دعوت کا دوسرا دور اور بھوپال
۲۱۷		دعوت جہاد کی ناکامی کے دہوہ اور اسباب
۲۲۲		مولانا مولوی شاہ ضیاء الدین بھوپالی
۲۲۴		مفتی الہی بخش کا ندھلوی
۲۲۶		شاہ رؤف احمد مجددی
۲۲۸		منشی جمال الدین مدار الہام بھوپال
۲۳۰		دلی الہی دعوت کے پہلے مدبر و منتظم
۲۳۰		مدار الہام صاحب کا عظیم کارنامہ
۲۳۳		مولانا سید رسل فیض آبادی
۲۳۵		مولانا شاہ عبدالقیوم صاحب محدث بھوپال

۲۳۷	مولانا محمد یوسف صاحب
۲۳۷	مولانا محمد اسماعیل صاحب
۲۳۸	مولانا اظہار علی منظر صادق پوری
۲۴۰	مولوی یعقوب علی خاں بانس بریلی
۲۴۱	تحریک شیخ الہند اور بھوپال
۲۴۲	تحریک شیخ الہند کا موقف
۲۴۴	ریشمی سادش کی حقیقت
۲۴۶	علماء کا سیاست سے کیا واسطہ
۲۴۹	تحریک شیخ الہند کا تعارف
۲۵۲	تحریک شیخ الہند کا آغاز
۲۵۲	مولانا سندھی کون تھے
۲۵۴	شیخ الہند کی برہمادھین کیلئے خفیہ سفارتش
۲۵۵	مولانا برکت اللہ بھوپالی تحریک کے قائد
۲۵۶	علماء سیاست میں کب آئے
۲۵۸	کپنی کی تعلیمی پالیسی
۲۶۰	برطانوی سامراج کی نئی تعلیمی پالیسی
۲۶۱	سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک
۲۶۶	تقسیم بنگال کا تفسیر
۲۶۶	شیخ الہند کی مالٹا میں نظر بندی
۲۷۰	برطانیہ کے عباسی نظام کی شکست دناکانی
۲۷۴	تحریک شیخ الہند پر تبصرہ

۲۷۸	۸	مالٹا کے بعد شیخ کی حکمتِ علمی
۲۸۲		شیخ الہند کا سانچہ ارتحال
۲۸۶		نواب محی الدین خاں مراد آبادی قاضی ریاست بھوپال
۲۹۰		قاضی محمد حسن مراد آبادی
۲۹۱		مولانا محمد فاضل پھلیتی
۲۹۳		مولانا عبدالرشید صاحب مکیں
۲۹۴		علامہ سید سلیمان ندوی
۲۹۷		مولانا عبدالحلیم صدیقی
۲۹۹		تاریخ آزادی ہند میں بھوپال کا حصہ
۳۰۰		تاریخ آزادی کا اجمالی خاکہ
۳۰۲		بیسویں صدی اور مغربی اقوام کا عروج
۳۰۴		بیسویں صدی کا ہندوستان
۳۱۳		ریاست بھوپال بیسویں صدی میں
۳۱۴		عہدِ سلطانی اور بھوپال
۳۱۸		دورِ حمید کی سیاست
۳۲۱		ریاستوں کے قیام کی تاریخ
۳۲۳		دورِ حمیدی ۱۹۲۶ء
۳۲۹		انجمن رعایائے بھوپال
۳۳۱		انجمن خدامِ وطن کی تشکیل
۳۳۵		ریاست میں پہلی انتخابی کشمکش
۳۳۷		پریس ایکٹ کا نفاذ
۳۳۸		بھوپال نیشنل لیگ کا قیام

سیاسی رہنماؤں پر بے جا مقدمات

۳۴۰

بھوپال کا دوسرا انتخابی ہنگامہ

۳۴۲

پر جانڈل کا قیام

۳۴۳

دیسی اور پردیسی کامنڈ

۳۴۴

مزدور تحریک اور بھوپال

۳۴۷

ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک اور بھوپال

۳۴۹

آزادی سے پہلے کی ہندوستانی سیاست

۳۵۷

بھوپال میں کشنری راج

۳۶۱

جمیعتہ علماء بھوپال کا قیام

۳۶۶

بھوپال ایم پی کی راجدھانی

۳۷۰

بھوپال ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی

۳۷۲

تاریخ آزادی کا گم کردہ درق

۳۷۴

کتابیات و حوالہ جات

۹-۱۰-۱۱

فہرست کتابیات و حوالہ جات کتاب ہذا

- | | | |
|-----------------------------|-------|---------------------------|
| ڈاکٹر محمد یوسف علیگ | از | ۱۔ خزائن الفتوح |
| مولوی وقار اللہ دہلوی | | ۲۔ تاریخ ہندوستان |
| مولوی غلام ربانی سنٹرلہ | ترجمہ | ۳۔ تمدن عرب |
| ڈاکٹر گیٹا دیبان | | |
| سید علی بلگرامی | ترجمہ | |
| غلام محمد | | ۴۔ سیر المتاخرین |
| ڈاکٹر جمیس ہارڈی ورا بن سین | | ۵۔ ترجمہ تاریخ مغربی یورپ |
| جے گرانٹ | | ۶۔ ترجمہ تاریخ یورپ |
| آر ایچ ایف بلیم | | ۷۔ تاریخ روم |
| ارجان لی مرخدا اسکوائر | | ۸۔ قسطنطین اعظم |

۹۔ یورپ سولہویں صدی میں

۱۰۔ تاریخ امریکہ

۱۱۔ تاریخ ہند برطانیہ

۱۲۔ منتخب التواریخ

۱۳۔ سوانح احمدی

۱۴۔ شہادۃ الثقلین

۱۵۔ السیر بالآ

۱۶۔ شاہ دلی اللہ کے سیاسی مکتوبات

۱۸۔ کمپنی کی حکومت

۱۹۔ تاریخ خانہ ان عباسیہ

۱۹۔ تاریخ سلطنت خداداد

۲۰۔ تحریک شیخ الہند

۲۱۔ علمائے حق ادل، ددم

۲۲۔ روح روشن مستقبل

۲۳۔ تاج الاقبال

۲۴۔ ریاستوں کی سیاست

۲۵۔ صبحِ وطن

۲۶۔ شعلہ حیات

۲۷۔ شاہ دلی اللہ کی سیاسی تحریک

۲۸۔ تزکِ سلطانی

۲۹۔ حیاتِ قدسی

۳۰۔ الکر بھوپال

۳۱۔ انقار المنن

۳۲۔ تذکرہ علماء و صوفیاء بھوپال

۱۔ ایس جانسن لولو

محمد یحییٰ صاحب تنہا

جے سی مارش من

عبد القادر بدایونی

محمد جعفر کھانیسری

عبد الجبار استاوی

حضرت مولانا حسین احمد مدنی

پروفیسر خلیق احمد نظامی

پروفیسر باری

نور احمد قادری

محمد خان

مولانا محمد میاں

مولانا محمد میاں صاحب

طفیل احمد منگلوری

نواب شاہجہاں بیگم

ابوسعید بزمی

شاہ کریم علیاں

ایم عرفان

مولانا نور الحق علوی

سلطان جہاں بیگم

نواب حسین محمد خاں

نواب صدیق الحسن خاں

دجادی الحسینی

دیباچہ از مصنف

حامداً ومصلياً

”تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے“ یہ ایک بلیغ مقولہ ہے۔ ہر قوم نے عوامی کہانیوں مقامی کہاوتوں، اور لوک گیتوں سے اس حافظہ کی حفاظت کی ہے۔ چونکہ قانونِ توارث کے ماتحت موروثی خصائص کی حفاظت و نگہداشت ضروری ہے اس لئے ہر قبیلہ اور ہر خاندان نے اپنے بچے ہوئے اہم لمحات، گزرے ہوئے خصوصی حوادث و واقعات کی یادوں کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لئے ہر دور میں سعی کی ہے۔ اقوامِ عالم میں ملتِ اسلامیہ ایک تاریخی ملت ہے جس کا تاریخی تسلسل آج تک نہیں ٹوٹا۔ دنیا کی کوئی قوم اس کے ہم دوش ہو کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ آغاز اسلام سے ہی ہمارے ملک ہندوستان سے اسلام کا اقامتی و وطنی تعلق عہدِ خلافت سے تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت ہے۔ جس کی تفصیلی تاریخ ایک محقق مورخ کے انتظار میں ہے۔

البتہ غورِ سی کے حملہ کے بعد اسلامیانِ ہند کی تاریخ کا جب سے دفتر کھلا اس کے تفصیلی واقعات تاریخ کے سینہ میں محفوظ اور اوراقِ کتب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ”بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینے میں“ اسلامیانِ ہند کے آٹھ سو دعوتی و اصلاحی اور سیاسی تاریخ کا ایک جائزہ ہے جس کے اندر ریاستِ بھوپال کو زمین بنا کر پوری تاریخِ اسلامی ہند کے عطر کی کشید کی گئی ہے۔

ہندوستان پر مسلم حکومتوں، ترک، افغان اور مغلوں کے دور میں جب ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی بگاڑ اور دینی خرابیوں نے اسلام کے نورانی چہرہ پر پردہ ڈالا اور شریعتِ مقدسہ کے شفاف آئینہ پر اپنی اوج

غیروں نے گمرد و غبار اڑانا چاہا تو بزرگوں نے اس پر وہ کو چاک کر کے اسلامی تعلیمات کے اصلی چہرہ کو نمایاں کیا اور کن مصلحوں کے ہاتھوں نے اس گمرد و غبار کو صاف کر کے اس آئینہ کو جلا بخشی۔ مغل شہنشاہوں کے دور میں جب شرک و بدعت کے مہیب و تاریک فتنوں نے اسلام کو تخریف و تصحیف کی گمراہیوں کا نشانہ بنانا چاہا تو دو عظیم دعوتوں ”دعوت الف ثانی اور دعوت ولی الہی نے اپنے اصلاحی و انقلابی درخشاں کارناموں سے ہندوستان کو جگمگا دیا۔

پھر جب فرنگی سامراج نے اپنے رسوائے عالم ڈپلومیسی (ڈپلومیٹ رول) کے ذریعہ ہمارے ملک کو غلامی کے شکنجہ میں کس لیا تو علماء حق مردانہ وار راہ جہاد پر گامزن ہو کر برطانوی شہنشاہیت کے خلاف کہاں کہاں معرکہ آرائیوں کا میدان گرم کیا۔ اور کن کن محاذوں پر مقابلہ کیا۔ اس کا مختصر مگر ضروری تذکرہ کیا گیا ہے۔ ماضی کی اس سبق آموز عبرت انگیز داستانوں کو دلکش و دلآویز اور ولولہ انگیز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے برطانوی سامراج کا اصلی مکروہ چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور مجاہدین حق کی عظیم قربانیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ کتاب مذکور جہاں مسلمانوں کی شاندار ماضی کی آئینہ دار ہے وہیں ان کے روشن مستقبل کے لئے شمع راہ بھی ہے۔ مغرب کی شیطانی مادی تہذیب نے جن سیاسی ہتھکنڈوں سے مشرق کی روحانی اقدار کو پامال کیا اور پوری انسانیت کو تباہی و بربادی کے جس دہانے پر لاکھڑا کیا ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس مغربی تہذیب کے پیچھے مشرقی اقوام آنکھیں بند کر کے سرپٹ دوڑ رہی ہیں ان کو اس سے ہوشیار و خبردار کیا گیا ہے۔ کتاب کا ہر باب دعوت فکر و عمل کا حامل ہے۔ مصنف کو اہل نظر سے پوری پوری توقع ہے کہ تاریخی حقائق کے تجزیہ کے سلسلہ میں جو نتائج اخذ کئے ہیں انکی لغزشوں اور کوتاہیوں سے مطلع فرما کر ممنون کریں گے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھا جاسکے

پیش لفظ

تاریخ اور سیرت ہر قوم ہر ملک کا قیمتی سرمایہ اس کی عظمتِ گزشتہ کا درخشاں آئینہ، عہدِ رفتہ کا یادگار صحیفہ اور بقول ایک مفکر "انسانیت کا حافظہ ہے۔" دورِ ماضی اور عہدِ گزشتہ کے یہ وقائع و احوال قوموں اور ملتوں کے حال اور استقبال کی تمہید بنتے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے عزم و حوصلہ اور ترقی و پیش قدمی کے لیے جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں کارزارِ حیات کے ہر معرکہ سنگیں میں یہی واقعات صدماتِ موانع اور ہزار ہا رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے لوگوں کو قسمت آزمائی اور نبردِ آرائی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کی قدیمی تاریخی قومیں بابل، اشوری اور مصر نے اپنے آباؤ اجداد کے جنگ و امن کے واقعات کو اور عمومی حالات کو مسماہری (مسخی) اور تصویری (ہیریو غلیفی) رسم الخطوں کے اندر پتیوں (پیرس) پتھروں، کچی اور پکی اینٹوں میں محفوظ کر کے اور زیرِ زمیں دفن کر کے آنے والی نسلوں کے لیے عظیم ذخیرہ چھوڑا۔ اس سے تاریخ کے آغاز کا مسئلہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے ہوش مند باشعور انسانوں نے اپنے خاندان و قبیلے کے گزرے ہوئے واقعات کو اولاً لوحِ حافظہ میں ثبت کیا لیکن عرب کی کہادت کے مطابق۔

الْعِلْمُ صِدْقٌ وَالْكِتَابَةُ قَيْدٌ یعنی علم یا معلومات انسانی ایک شکاری جانور یا ایک آہوئے رم خوردہ ہے جو تلاش و جستجو کے صحرائے بیکراں میں یکا یک آنکھوں کے سامنے آیا پھر چھلا وہ کی طرح ایک دم نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ اس لیے تحریر و نگارش اس جنگلی شکار کے لیے ایک مضبوط جال ہے جس کے اندر وہ باندھا جا کر

مقید و پابند ہو جاتا ہے تحریر کتابت کی زنجیر میں بندھ جانے کے بعد اب وہ بھاگنے کے قابل نہیں رہتا اس لیے علم انسانی کی فتوحات اس کے قوتِ حافظہ کی مرہونِ منت ہے لیکن خود حافظہ کا عظیم الشان ذخیرہ قلمی نگارشات کی بدولت انسانیت کے ہاتھ لگا ہے۔

علوم انسانی کا قافلہ اسی قلم کی جولانیوں کی بنا پر منزلِ ارتقا کی طرف مسلسل رواں دواں ہے *عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا كَمْ يَعْلَمُ* کتابِ فطرت کا یہ بلیغ اشارہ اسی حقیقتِ کبریٰ کے لیے ہے۔

بہر حال حیاتِ انسانی کے پچھلے واقعات و احوال سب سے پہلے لوحِ حافظہ میں ثبت ہوئے پھر لوحِ حافظہ سے منتقل ہو کر پتھروں، چٹانوں، غاروں، گچھاؤں میں کندہ کیے گئے۔ جب ان واقعات و احوال اور حوادث و سوانح نے تحریری شکل اختیار کی تو اس کا نام علمِ تاریخ ہوا اس لیے تاریخِ انسانیت کا سب سے قدیم علم ہے پھر علمِ تاریخ کا تعلق ایک طرف تو عام اجتماعی زندگی سے رہا جس کے اندر خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کے وقائع و احوال کو سمیٹا گیا ہے اور دوسری طرف مخصوص افراد کے حالات اور ان کے غیر معمولی اصلاحی انقلابی ملکی و انتظامی اور سیاسی کارناموں سے رہا اس کا نام سیرت ہے جس کو انگریزی میں *Bio-graphy* کہتے ہیں۔

تاریخ کا ایک شعبہ شاہانِ عالم فاتحانِ اعظم کی قوت و سطوت اور ان کے جلال و جبروت کے مظاہرے کا نام ہے تو دوسرا پہلو انسانیت کے مصلحوں، پیشواؤں اور عظیم رہنماؤں کی روح پرور نمود سے عبارت ہے جس کو ہم سوانحِ عمری کہتے ہیں۔

تاریخ کا اجتماعی حصہ جس طرح شان و شوکت، طاقت و حشمت کے مبالغہ آمیز احوال کی بنا پر افسانوی حیثیت اختیار کر کے بسا اوقات اصل حقیقت سے دور ہو گیا ہے اسی طرح تاریخ کا انفرادی پہلو بھی واقعیت کی اصلی و سچی روشنی

سے بہت سے مقامات پر خالی نظر آتا ہے کیونکہ فطرتِ انسانی اپنی محبوب شخصیت کے لیے ہالہ بن کر اصل چہرہ کو چھپا دیتی ہے اس لیے عہدِ قدیم کے اندر تاریخِ قرآنی زبان میں اساطیرِ الاولین (انگلوں کے سچے قصے کہانیوں کا نام ہو گیا) اور تاریخ کا اصلی مقصد جو انسانی حیات کے انفرادی و اجتماعی گوشوں سے عروج و زوال کی عبر و بصائر اور ترقی و تنزل کے مراحل و منازل کی معرفت تھا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا لیکن فطرتِ بشری کا یہ قطری مطالبہ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تسلیم اور بہتر سے بہتر ہدایت اس وقت تک انسانوں کے لیے جاذبِ قلب و نظر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے کوئی باعمل مثالی شخصیت جلوہ فرمائے ہو اپنی جگہ پر بدستور باقی رہا اس لیے اسلام نے تاریخ کو ایک نیا حقیقت پسند روپ دیا اور سیرت کے ذریعہ ہدایتِ انسانی کا نیا باب کھولا اب تاریخ و سیرت واقعات کی محض کھتونی اور صرف وقائعِ احوال کا مجموعہ نہیں رہے بلکہ عہدِ ماضی کے آئینہ میں حال و مستقبل کے سنوارنے کا ذریعہ ہو کر ایک مستقل علم بن گئے۔

تاریخِ انسانی کا یہ عظیم الشان بلند و بالا اور وسیع و فراخ محل اپنے استحکام و مضبوطی میں ایران کے طاقِ کسریٰ اور مصر کے عظیمِ اہرام اور اپنی وسعت و بلندی میں قدیم یمن کے مشہور قصرِ غمدان سے کم نہیں ہے بلکہ کبھی نہ کبھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے والی ان عمارتوں کے مقابلہ میں تاریخِ انسانی کی عمارت بہت رفیع و بلند اور مضبوط و مستحکم ہے۔

جس طرح ایک عالیشان محل کے بنانے کا منصوبہ جب زیرِ عمل آتا ہے تو سب سے پہلے اس عمارت کی داغ بیل چونا یا را کھ سے ڈالی جاتی پھر اس کی نیوکھودی جاتی ہے اس کے بعد بنیادوں کو استوار کر کے ایک عرصہ تک چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ ساری عمارت کی پختگی و مضبوطی کا در ا و مدار ان ہی بنیادوں پر ہوا کرتا ہے پھر ان ہی پختہ و مستحکم بنیادوں پر دیواریں چنی جاتیں اور ان دیواروں پر چھت تانی جاتی ہے جتنی بلند و بالا اور اونچی کئی منزل

عمارت ہوگی اتنی ہی چوڑی چکلی اور گہری بنیادیں ہوا کرتی ہیں آخر میں بلند گنبد
 و مینار اور فلک بوس کنگورے اس عمارت کی رفعت و بلندی اور عظمت شان
 کی نشانی بن کر نمودار ہوتے ہیں اور ہر دور و نزدیک سے دیکھنے والوں کو اپنی
 طرف متوجہ کر کے اور ہر ایک کی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ عام
 انسانوں کی نگاہیں ان اونچے گنبدوں اور میناروں پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ ان
 شاندار خوشنما گنبدوں میناروں کو دیکھ کر ظاہر ہیں انسان ٹھٹھک جاتے اور
 ان کی رفعت و عظمت کے تصور میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ اس عمارت کی بنیادوں
 کا تصور تو کجا اصل عمارت کا خیال بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جو حال
 اس بلند و بالا قصرِ شاہی کا ہے اس سے زیادہ حالت تاریخ کے عالیشان محل
 کی ہے دنیا کی سلطنتوں کو قائم کرنے حکومتوں کے اندر انقلاب و تبدیلی لانے
 میں جن عوام و رعایا کا خون پسینہ ہی شامل نہیں بلکہ ان کی جاں فردشانہ
 قربانیوں اور فداکارانہ جاں فشانیوں کا زبردست عمل دخل ہے ان کا کہیں
 نام و نشان نہیں ملتا تاریخ کے صفحات پر فاتحوں، سپہ سالاروں اور بادشاہوں
 مہاراجوں کے نام تو جلی حروف میں لکھے نظر آئیں گے لیکن جن لوگوں نے ان
 سرداروں کے دست و بازو بن کر ان کو سرداری عطا کی تاریخ کے اوراق
 ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لیے تاریخ نام ہو گیا ان سرداروں، سربراہوں،
 راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے کارناموں کا جو ان خونی معرکوں کے
 سمندر سے سرخرو ہو کر اور کامیاب ہو کر نکلے لیکن وہ جاں نثار عوام جفاکش
 فوجی اور جانباز سپاہی جنہوں نے ان معرکوں میں خون پانی ایک کیا اپنے
 جسموں کو لہو لہان کیا اور زندگیوں کی بازی لگائی کہ وہ ہی ان فتح یابیوں اور
 کامرانیوں کی عمارت کے در و دیوار بلکہ جڑ بنیاد اور وہی اصلی تاریخ ساز ہیں ان
 لاکھوں کروڑوں انسانوں کے احوال سے سینہ تاریخ ویران اور اس کے
 صفحات خاموش ہیں خال خال کسی جگہ کسی غیر معمولی کارنامہ پر ان کا ذکر خیر

آگیا ہو تو آگیا ہو لیکن عام نگاہیں ان اونچے گنبدوں اور رفیع الشان میناروں پر ٹھہر کر رہ گئیں۔

اسلام نے جہاں اور علوم و فنون کو مخصوص طبقوں کی اجارہ داری سے نکال کر انسانیت کی متاع مشترک قرار دیا وہیں تاریخ و سیرت ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوئے۔ کتاب حکمت نے تاریخ کو افسانوی ماحول کی تنگ نائیوں سے نکال کر حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کی فراخ و وسیع فضاؤں میں لا کر کھڑا کر دیا اور انسانی زندگی پر اس کے ذریعہ اثر ڈالنے کا کام لیا گیا۔

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب

صحیفہ فطرت نے انسانی قصص کو جن کے مجموعے کا نام تاریخ ہے دانشمندوں کے لیے سامان عبرت قرار دیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس نظم حکمت میں جو معنویت پوشیدہ ہے اور اس کے پس پردہ جو حقیقت عالیہ جلوہ گر ہے اس پر گہری نظر ڈالی جائے چنانچہ جب ہم اس لفظ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عبرت و عبور کا ایک ہی ماخذ ہے جس کے معنی دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچنے اور سمندر پار کرنے کے ہیں۔ انسانی زندگی انفرادی زندگی کے کنارے سے اجتماعیت کے ساحل تک پہنچنے میں برابر آگے بڑھتی رہتی ہے ایک مجموعہ افراد کے اٹھ جانے پر دوسرا مجموعہ اس کی جگہ لے لیتا ہے اس طرح کاروان حیات صحرائے وجود میں مسلسل قدم آگے بڑھاتا ہوا جا رہا ہے۔ تعاقب امثال کی جو حقیقت فرد کے اندر جاری و ساری ہے وہی اجتماعیت میں بھی جلوہ فرما ہے یعنی جس طرح جسم انسانی ہر وقت تحلیل ہوتا رہتا اور ان تحلیل شدہ ذروں یافتہ ہونے والے خلیوں کی جگہ دوسرے ذرہ یا خلیے لے لیتے ہیں اور شعلہ جوالہ کی طرح درمیان میں انفصال یا جدائی کا احساس نہیں ہوتا اس لیے انسان عالم طفولیت سے عہد پیری تک ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل بدلتا رہتا ہے لیکن رہتا وہی ہے بالکل اسی طرح اجتماعی زندگی کا حال سمجھنا چاہئے کہ افراد کی ایک جمعیت چلے جانے پر

دوسری جمعیت اس کی جگہ لے لیتی ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ حیاتِ انسانی اگرچہ ازلی نہیں ہے لیکن اس کا مستقبل ابدیت سے ہم آغوش ہے تاریخِ انسانی اس ابدی زندگی کا ابتدائی کنارہ ہے جس سے سفینہٴ حیات گزر کر دوسرے کنارے کی طرف رواں ہے جس طرح زندگی کا یہ سمندر بے پایاں ہے اسی طرح اس سے بڑھ کر اس کا ساحل حلقہٴ حد نظر سے آگے ہے۔ زندگی کی مسلسل سرگرمی و جولانی و قافلہٴ حیات کی متواترہ پیمائی انسانیت کو فکر و عمل کا پیغام دیتی ہے اور تاریخ اسی دعوتِ فکر و عمل کی ترجمان ہے تاریخ کا یہ داخلی اور روحانی تصور ہے جس کو ہم نے اپنی علمی بے مانگی کی بساط کے مطابق پیش کر دیا ہے لیکن اس کی ایک باڈی و خارجی حقیقت بھی ہے اور وہی خارجی حقیقت تاریخِ انسانی کی تدوین میں جلوہ فرما ہے جس کے مرقع میں قوموں اور قبیلوں کے حالات و واقعات اور اہم عظیم شخصیتوں کے سوانح و احوال کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے پڑھنے سے دلوں میں حوصلہٴ حیات اور دلولہٴ ارتقا و ثبات پیدا ہوتا اور پچھلی غلطیوں اور بیتی ہوئی لغزشوں سے جو قوموں کے ادبار و تنزل کا باعث بنتی ہیں ان سے خود کو بچائے اور بچ کر آگے بڑھنے کا سبق ملتا ہے۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ ہم اپنے عظیم الشان ملک کی پچھلی تاریخ کو واقعیت کے اعلیٰ معیار اور صحیح قومی خطوط پر آزادی کے تیس سال گزر جانے پر بھی ترتیب دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ برطانوی سامراجی مورخین نے اپنے شیطانی منصوبہ کے مطابق تاریخ ہند کو توڑ مروڑ کر جس عیاری مکاری اور دجل انگیز انداز میں ترتیب دیا ہے اس کے بین السطور میں

پھوٹ ڈالو حکومت کرو کا فرعونِی نظریہ اور سامراجی پالیسی کا رفرما ہے جس کو پڑھ پڑھ کر ہماری نئی پود جوان ہوئی ہے اور اس کے پڑھائے ہوئے اسباق ملک کے خرمن امن و سکون کو ہر وقت فسادات کے شعلوں سے ہوا دیتے رہے ہیں ان نفاق پرور فرقہ پرست برطانوی مورخین نے تاریخی واقعات کے پردہ میں انسانیت

دشمنی کا زہر گھول دیا ہے جس کو دل فریب اور خوشنما عنوانات دے کر اور شکر چڑھی گولی بنا کر یہاں کے باشندوں کے حلق میں اتار دیا ہے برطانوی مصنفین کی لکھی ہوئی تاریخ کا یہ عطر مجموعہ باہمی نفرت و عداوت کے زمین پر تیار کیا گیا ہے۔ جس نے اولاً پورے ملک کی فضا کو مسموم کیا پھر متحدہ ہند کو تین تیرہ کر کے رکھ دیا۔

وہ ملک جو ایک چھوٹے براعظم کی حیثیت سے ابھرا تھا اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اور رنگارنگ تہذیب و تمدن کے رکھنے والے باشندوں پر مشتمل ایک خوشنما چمنستان بن کر متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا سامراج کی بے رحم تلوار نے اس کو تقسیم کے چشیم زخم کا شکار بنا کر یہاں کے رہنے والوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر دیا اس خانہ جنگی اور بدامنی کی شب تاریک کی شاید کوئی سحر نہیں ہے؟ باہمی رقابتوں، آپس کی عداوتوں نے اس ملک کے آسمان پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ڈال دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد کی شعاعیں چمکنے کی امیدیں موہوم اور محبت و مودت پریم پیار کی بارانِ رحمت کے نزول کی توقعات دور دراز کی بات نظر آرہی ہے۔ کیا دلوں کی دوری کی یہ مسافتیں سمٹ جائیں گی؟ کیا دلوں کے قاصلے گھٹ جائیں گے؟ قوموں کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں یہ انہونی بات نہیں۔

چونکہ ایشیائی اقوام کا قوام میل، ملت، محبت و الفت سے بنا ہے اور ہر سچے مذہب کی بنیاد محبت پر اٹھائی گئی ہے اس لیے نقطہ اتحاد پیدا کرنا کوئی امر محال نہیں اس نقطہ اتحاد کی جدید ذہن کے لیے تلاش جستجو اس لیے دشوار و مشکل ہو رہی ہے کہ سامراجی تاریخ نے قوموں کے اندر زہریلی فرقہ پرستی کا ایسا بیج بویا ہے جو تناور درخت بن کر اپنے سایہ میں تینوں ملکوں کو لے چکا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان بنیادی غلطیوں کی نشاندہی کی جائے جس کی بنا پر دلوں کا میل اور نفرت کا غبار چھٹ جائے اور انسانیت کا اصلی نورانی چہرہ نگاہوں کے سامنے

آجائے۔

انسانیت کی تاریخ قبیلوں، خاندانوں اور قوموں کے ایک دوسرے سے تعلقات، میل ملاپ اور باہمی کشمکشوں اور معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔ مشرق جہاں سے سورج نکلتا ہے وہیں سے تہذیب انسانی کا آفتاب بھی طلوع ہوا اور پھر انسانوں کے یہ قافلے مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ مشرق نے جس تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی وہ چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور پھر علاقے کی مقامی خصوصیات وہاں کی آب و ہوا کے رنگ میں رنگ کر اس خاکدانِ عالم میں تہذیبوں کے رنگارنگ گلدستے تیار ہو گئے۔ اشوری و فنیقی، بابلی و مصری اقوام اقوام کے زوال کے بعد مغربی اقوام روم و یونان نے اپنی ذہنی و عسکری فتوحات کے بل پر مشرقی علاقوں کو زیرِ شکم کیا پھر اپنی سر بلندی اور برتری کا پرچم لہرایا۔

جب اسلام نے چھٹی صدی عیسوی میں پرانی دنیا کی ناف (عرب) سے نکل کر ایک عالمگیر تہذیب کی انسانیت کو دعوت دی تو اس وقت ایرانی و رومی شہنشاہتیں آدھی دنیا پر اپنے اقتدار و تسلط کے لیے باہم معرکہ آرائیں اسلام نے اپنی سادگی و نرمی اور فطری کشش انگیزی کے ذریعہ بہت ہی مختصر مدت میں مشرق سے مغرب تک اپنے تہذیبی نقش و نگار اور تمدنی آثارِ صفحہ گیتی پر مرتسم کر دئے جبکہ مغربِ قرون وسطیٰ کے تاریک دور سے گزر رہا اور گہرے خوابِ غفلت میں پڑا ہوا تھا۔

اسلام کی عالمگیر دعوت کی پکار سے وہ خوابیدہ قومیں جاگ اٹھیں جب انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سورج سر پر چمک رہا تھا کچھ سعادت مند روحوں نے خدا کی اس عالمگیر روشنی سے اکتسابِ نور کیا اور کچھ کو نظر انسانوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں انھوں نے چمکا دڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے چمکتے ہوئے سورج کی روشنی سے انکار کیا اور اسلام کے خلاف اندرونی و بیرونی

سازشوں کا جال ہر طرف پھیلا دیا اور حق کے خلاف مسلسل جنگ آزمائیوں کا میدان گرم کر دیا ایرانی شہنشاہیت نے تو اپنے مغرور اور خود سرانہ رویہ کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑ دیا لیکن رومی حکومت یا دوسرے لفظوں میں عیسائیت نے اسلام کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کا تسلسل اسی دیرینہ عداوت کا ایک شاخسانہ ہے بہر حال مشرق و مغرب کی کشمکش سو لھویں صدی تک پہنچ کر مغربی اقوام کی فتحیابی پر منتج ہوئی اور سترھویں صدی کے اختتام اور اٹھارھویں صدی کے آغاز پر ایک بڑا حصہ ان کا غلام بن چکا تھا اس سلسلہ میں مشرق کی جس عظیم طاقت نے سامراج سے لوہا لیا اور قدم قدم پر سامراجی حکومتوں کا جم کر مقابلہ کیا اور جو قوم ان کے مقابلہ میں سخت جان نکلی وہ ملت اسلامیہ تھی اس لیے فرنگی سامراج نے جب ہندوستان جنت نشان پر اپنے منحوس قدم رکھے جس قوم کو سب سے پہلے اپنی وحشت و بربریت اور درندگی کا نشانہ بنایا وہ مسلمان تھے۔ چونکہ ایشیا کے ہر علاقے میں مغربی اقوام کو ملت اسلامیہ ہی سے حوصلہ فرسا اور جانگسل مزاحمت کرنا پڑی تھی اس لیے جذبہ انتقام کے زیر اثر ہر محاذ پر ان کو پیچھے ڈھکیل دینے کی سامراجی اسکیم بنائی ایک ہزار سال سے زائد اہل اسلام ہندوستان کی مختلف قوموں میں شیر و شکر ہو کر آپس میں گھلے ملے چلے آ رہے تھے اور مسلمانوں اور یہاں کے باشندوں میں میل محبت کی فضائیں قائم تھیں اور بہت سے میدانوں میں یہاں کی بھی قوموں نے مل جل کر انگریز سامراج کا مقابلہ کیا تھا اس لیے فرنگی مورخین نے اسی رسوائے عالم پالیسی *divide & rule* پھوٹ ڈالو حکومت کرو کو بروئے کار لا کر سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو اسی سامراجی نقطہ نظر سے ترتیب دیا تاریخ ہند میں مسلمانوں کے *period* کو سب سے زیادہ وحشتناک اور خونچکاں پیرائے میں تحریر کیا گیا چنانچہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے سلسلہ میں جس دروغ بانی اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے وہ

ان کی سامراجی پالیسی کا ایک گھناؤنا حصہ ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اس تاریخی حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ عرب و ہند تعلقات مسابقت تاریخ سے چلے آ رہے ہیں سکندر اعظم کے حملہ (۳۲۵ء) سے پہلے عربوں کی ہند میں آمد و رفت جاری ہے جب اسلام آیا تو اس نے عربوں کے دلوں میں ایک نیا کشش انگیز جذبہ پیدا کیا کہ ہندوستان مسلمانوں کا آبائی وطن ہے انسانیت کے مورث اعلیٰ حضرت آدم کے آسمانی جنت سے اس ارض پرستی (سمراندیپ یا لنکا) میں اتارے گئے اس لیے عربوں کے سمندری بیڑے عہد رسالت اور خلافت سے اس کی زیارت کے لیے آنے جلنے اور اسلام کے پیغام سے اس سرزمین امن و آئین کو آشنا کرتے رہے۔

پہلی صدی ہجری (چھٹی صدی عیسوی) میں مسلمانوں کے قافلے خشکی و تری کے راستوں سے نہ صرف اس ملک میں اترتے رہے بلکہ شروع میں ساحلی مقامات اور بعد میں اندرون ملک نو آبادیاں قائم کرتے ہوئے اور یہاں کے مقامی راجوں مہاراجوں کی حکومتوں کے ماتحت اس ملک کے قدیم باشندوں کے ساتھ دوست بدوشت زندگی و ترقی میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں انگریز مورخین اور ان کے کاسہ لیس پیروکاروں نے مسلمانوں کے ابتدائی حالات کو سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اوراق تاریخ سے اڑا دیا اور مسلمانوں کے اولین داخلہ محمد بن قاسم کے حملہ کو ^{۶۳۲} قرار دے کر اہل اسلام کی خونخواری کی غلط تصویر پیش کی جو ہر ایک تاریخ خواں کے دل میں نفرت کو ابھارتی اور مسلمانوں کو غلط طور پر حملہ آور ٹھہراتی ہے حالانکہ صحیح تاریخی حقائق اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری ہی سے مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دے کر یو دو باس اختیار کر لی تھی اور ہر طرح کے اچھے برے حالات میں یہاں کے باشندوں کا ساتھ دیتے چلے آ رہے تھے غزنوی اور غوری کے حملوں سے صدیوں پہلے نہ صرف ساحلی مقامات بلکہ ملک کے اندرونی علاقوں میں طرح اقامت ڈال کر

ہندوستانی بن چکے تھے جس پر ہم اپنی کتاب "ہندوستان اسلام کے سایہ میں نہیں
روشنی ڈال چکے ہیں۔

تاریخ اسلامی ہند کے ان ابتدائی اوراق کو حذف کر کے ہندوستان
میں مسلمانوں کی مستقل اقامت اختیار کر کے واقعہ کو غزنوی اور غوری کے
حملوں سے جوڑ دیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کو ایک غارت گر کے روپ
میں پیش کیا ہے حالانکہ وہ ایک مہم جو، مہم پسند، حوصلہ مند سپہ سالار تھا۔
محمود نے ایک مہم جو حوصلہ مند فوجی جنرل کی طرح ملک گیری اور اپنے دائرہ
اقتدار کی وسعت پذیری کے لیے جو مہمیں اس نے اختیار کیں ان کا اشاعت
اسلام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں چونکہ محمود نے سب سے پہلے ان مسلم
حکمرانوں کے خلاف معرکہ آرائیوں کا میدان گرم کیا تھا جو اس کی راہ میں رکاوٹ
بن گئے تھے پھر اس کی حوصلہ مندی کی تکمیل کے لیے ہندوستان جیسے وسیع و
عریض رقبہ کا ملک سامنے آگیا۔ محمود غزنوی کے دو سو سال بعد جب غزنی کی
عنان سلطنت اس کے خاندان سے چھوٹ کر غوری خاندان کے ہاتھ میں آئی
تو مشہور فاتح شہاب الدین غوری نے جو ایک دلدار و با حوصلہ سردار تھا اپنی
مہم جوئی کے لیے اس ملک کو اپنی جولان گاہ بنایا اس کو تاریخ ہند میں حملہ آور کی
حیثیت سے دکھایا گیا ہے حالانکہ غوری مہاراجہ قنوج کی دعوت پر پرتھوی راج
کے مقابلہ میں اس کا حمایتی بن کر وارد ہوا تھا اس نے یہاں کے راجاؤں
کی متحدہ طاقت سے ٹکرا کر ابتداءً شکست کھائی پھر بعد میں فتیاب ہو کر
افغان حکومت کی بنیاد ڈالی یہ مہم جوئی، مہم پسندی پچھلے زمانے کے حوصلہ مند
سرداروں کا عام مزاج تھا جیسے موجودہ زمانے میں کوہ پیماں اور دیگر میدانوں
میں مقابلہ آرائی پاکستان کی گرم بازاری ہے۔ شہرت
و نام آوری کے حصول کے لیے آج کل انتخابی مہموں کی ہنگامہ آرائیوں اور
قتل و خون ریزیوں کا ہے وہی اس زمانے میں ملک گیری کے لیے تھا۔

دوسری قوموں پر چڑھائی کرنا عام رعایا کا خون خرابہ کرنا غریب عوام کے جان و مال سے کھیلنا تاریخ کے سربراہوں کا دلچسپ و محبوب مشغلہ رہا ہے اس علم و دانش، حریت و جمہوریت کے دور کی انتخابی مہموں میں جو باہمی آویزش اور ایک فریق کے حامیوں کی دوسرے فریق کی حمایتوں کے ساتھ جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ بعض اوقات خون خرابہ تک لے جاتی ہے تو اس دورِ ظلمت و جہالت میں جبکہ انسان اتنا مہذب نہیں ہو سکا تھا فتوحات کا یہ جذبہ سفاکی و خونخواری کی حد تک اگر پہنچ گیا تو اس میں تعجب کیا ہے فطرت انسانی وہی ہے لیکن وہ فتنہ اب ذرا سانچے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے اس خونخوار جذبہ کی تسکین حاصل کرنے میں کسی قوم کی تخصیص نہیں بلکہ یہ عالمگیر جذبہ غرور و برتری کا ایک نشہ تھا جو شہرت پرست سرداروں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا کیا خود ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے راجوں مہاراجوں کے درمیان لڑائیوں کے میدان گرم نہیں رہے۔

تیمور لنگ جو سمرقند سے آندھی بن کر اٹھا اور اس زمانہ کے بادشاہوں کو چیلنج دیتا ہوا بادل بن کر گر جا اور قہر الہی بن کر ایشیا و یورپ کے علاقوں میں برسا اپنے زور و قہر بانی اور ظلم و ستم رانی کے ہاتھوں وہ مظالم ڈھائے کہ انسانوں کے کشتوں کے پشے لگا دئے۔ مقتولوں کی کھوپڑیوں سے فتح کے مینار قائم کیے بڑے اسلامی ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی یہاں تک کہ اس ظالم و جابر انسان نے خلیفہ اسلام بایزید عثمانی کو جو تمام رعایا اور مسلمانوں کی نظر میں قابل احترام ہستی تھی گرفتار کر کے درندوں کی طرح ایک لوہے کے پیجرہ میں قید کر کے اسلام کی توہین کی اور خود کو مدعی اسلام کہتا تھا اور موقع پر اسلام کا نام لیتا رہا اس کی یہ ساری سفاکیاں اور ساری خونخواریاں کیا ہم مذہب بادشاہوں کے خلاف نہ تھیں؟

بہر حال اقتدار پرستی و جاہ طلبی کی چنگاری جن جن کے دل کی انگلیٹھی میں

سلگی ہے اس نے ہر قوم کے طاقت پرست افراد کیا مسلمان کیا ہندو ہر ایک کے سینوں میں خونخواری و خون آشامی کے شعلوں کو بھڑکایا ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات ان خونی سرخیوں سے رنگے ہوئے ہیں۔

برطانوی اور سامراجی مورخین نے مسلم افغان و مغل پیر پٹ کو جس طرح ترتیب دیا ہے اس کے اندر غوری کے بعد تمام گزشتہ جنگوں کو ہندو مسلم لڑائیوں کے روپ میں پیش کیا ہے جن کے اندر زیادہ تر مسلمانوں (جو حملہ آور یا غارت گرد کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں) کے مقابلہ میں برادرانِ وطن کو شکست کھاتے یا ہتھیار ڈالتے دکھایا گیا ہے جس سے عام ذہن میں ایک غلط نقش قائم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ملک میں جو ہمیشہ سے بہادروں، سورماؤں کا ملک رہا ہے کوئی بھی ایسا دلاور سپہ سالار یا بہادر لوگ موجود نہ تھے جو آنے والے سیلاب کو روک سکتے یا ان حملہ آوروں کو ڈھکیل سکتے تاریخ کی اس غلط آمیزی سے یہاں کے باشندوں کے دامنِ مردانگی پر بزدلی و نامردی کا داغ لگتا اور برادرانِ وطن کے دلوں میں کمتری کا غلط احساس پیدا کرتا ہے حالانکہ حقیقت واقعی یہ ہے کہ نہ ہر حملہ میں مسلمان فتحیاب ہوئے اور نہ ہر موقع پر باشندگان ہند نے ہتھیار ڈالے یہ جنگیں اور لڑائیاں ہندو مسلم بنیادوں پر ہوئیں چونکہ اکثر جنگوں میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک رہے خود تاریخ سے محمود غزنوی کی فوجوں میں ہندوؤں کی پلٹنوں کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ من گھڑت تاریخ ہمارے ملک کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے اس تاریخ کا سب سے افسوس ناک اور تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ جنگِ آزادی کی تحریک جس کے اندر ہندو مسلم، سکھ عیسائی سبھی قوموں نے کندھے سے کندھا ملا کر حصہ لیا اور جن کا خون بہہ کر اس سرزمین پر ایک ہو گیا تھا آزادی کی یہ تاریخ جو ملکی مصنفوں کی تحریر کردہ ہے اس کے اندر دانستہ یا نادانستہ طور پر فرقہ پرستی کو شامل کیا گیا ہے اور جگہ جگہ فرقہ پرستی کے جراثیم دیکھے جاسکتے ہیں۔

زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تاریخ بھی سامراجی نقطہ نظر ہندو مسلم تفریق کی بنیاد پر لکھی گئی ہے چنانچہ اس سلسلہ تاریخ کی سب سے حیرت خیز کڑی یہ ہے کہ ہماری قومی جماعت (کانگریس) کی تاریخ نگاری میں بھی اس سامراجی نظریہ کا عمل دخل صاف نظر آتا ہے اس کے سرسری مطالعہ سے ہر خالی الذہن آدمی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آزادی ہند کی تحریک کے بانی مبانی صرف برادران وطن ہیں جنہوں نے اس تحریک کو مرحلہ آغاز سے منزل انجام تک پہنچایا تحریک کے جملہ مراحل قید و بند، گرفتاری و قربانی سے کامیابی و کامرانی تک پہنچانے میں زیادہ تر انہی کا حصہ ہے اس محاذ جنگ کے تمام جرنیل اور کرنیل سپہ سالار اور زیادہ تر سپاہی ہمارے وطنی بھائی ہیں اتفاق سے کہیں کوئی عہدیدار یا قائد ولیڈر مسلمان نظر آجاتا ہے ورنہ اکثر و بیشتر سپاہی و چیراسی کے لباس میں مسلمانوں کا نام دکھائی دیتا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے انگریز سامراج کے ہندوستان میں داخل ہوتے ہی شروع ہی سے سامراج دشمن تحریکات جاری کیں اور بیش از بیش قربانیاں دیں لیکن وہ قربانیاں ان مسلمان مجاہدوں اور شہیدوں کے ساتھ زیر زمین دفن ہو گئیں کیونکہ ہر ناکام تحریک دنیا میں بناوت سے موسوم کی جاتی رہی ہے فرنگی سامراج اپنی جنگی صلاحیت اور حربی قابلیت سے یہاں فتح یاب نہیں ہو سکا وہ اپنی شاطرانہ پالیسی اور یہاں کی قوموں کو باہم دست و گریباں کر دینے کی ڈپلومیسی سے اس ملک پر نا جائز متصرف و قابض ہو گیا چنانچہ سب سے پہلے بنگال کے مسلم علماء نے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہ یعنی ساری زمین خدا کی ہے کا قرآنی آیت کا نعرہ دے کر زمیں داروں کے خلاف فرائضی تحریک جاری کی تھی جس نے صوبہ میں زبردست ہل چل پیدا کر دی تھی اس اہم و زبردست تحریک کا ذکر تاریخ آزادی کے حاشیہ تک میں نہیں ملتا اور امام جہاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی کے جہاد آزادی کا کوئی تفصیلی باب تاریخ آزادی کے صفحات میں نہیں ملتا۔ مرد انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھی، مجاہدِ حریت مولانا برکت اللہ بھوپالی، شہیدِ آزادی مولانا محمد میاں وغیرہم کا جنھوں نے اپنی مقدس و پاکیزہ زندگیوں کو ملک و ملت کی آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ افسوس ہے کہ ان انقلابی مسلم زعماء و قائدین اور مسلم عوام کی جاں نثارانہ قربانیوں سے (جو اپنی نفری قوت اور تعداد کے لحاظ سے برادرانِ وطن سے کئی گنا بڑھی ہوئی ہے) تاریخِ آزادی ہند خاموش ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاتا کہ مسلمانوں کے ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کو چھوڑ کر جنھوں نے سامراج کی غلامی کو اپنے لیے ترقیوں اور مادی کامیابیوں کے لیے زینہ سمجھا پوری ملتِ اسلامیہ کیا عوام کیا خواص انگریزی حکومت کی ابتدا ہی سے مخالف اور ہر محاذ پر ان کے خلاف معرکہ آرا رہے ہزار ہا مسلم خاندانوں نے راہِ حریت میں شہید ہو کر جان و مال، آل و اولاد، جاگیر و جائداد کو تباہ و برباد کر دیا۔

اب جبکہ ماضی کی تاریخ نے ورق الٹ دیا ہے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کی صبحِ مستقبل کے لیے عہدِ ماضی کی روشنیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ ملک و قوم کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے آباد اجداد اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہو اور اختیار کی تواریح کو حرزِ جاں بناتے ہوئے اس کو فخر و امتیاز کا سرمایہ قرار دے۔

ریاست بھوپال ہندوستانی ریاستوں میں ایک نوخیز ریاست ہے جو اٹھارہویں صدی ۱۷۰۹ء کے آغاز میں صفحہٴ تاریخ پر ابھری اور بیسویں صدی کے نصفِ اول ۱۹۴۹ء میں اپنے انفرادی وجود کو متحدہ ہند

کے اجتماعی وجود میں ضم کر دیا اس ریاست نے انیسویں صدی کے آغاز میں علم و ادب کی ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور بیسویں صدی میں مطلعِ ہند پر اخترِ تاباں بن کر چمکی اس دو ڈھائی صدی میں بڑے بڑے باکمال اہل علم و فضل اربابِ شعر و ادب اس خطہٴ پاک سے اٹھے اور اپنی علمی و ادبی روشنیوں

سے تاریخ بھوپال کو درخشاں بناتے رہے اسی طرح بے شمار ارباب نظم و سیاست یہاں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہاں کے ملکی و سیاسی افق کو روشن کیا نمود و شہرت کے میدانوں کو پامال کیا اور ملک و ملت کی راہ میں شہادت کی قربان گاہ پر پیش کیا لیکن خود کو اس طرح پردہ گمنامی میں روپوش کیا کہ ان کے کاموں کا جائزہ لینا تو کیا کاموں کی فہرست مرتب کرنا دشوار ہو رہا ہے آج بھوپال کے اصلی معماروں سے فرزند گان بھوپال بیگانہ و نا بلد ہیں کہ ان کے تذکار و یاد آوری کے لیے بیرونی حوالہ جات درکار ہو رہے ہیں ہم میں سے آج اکثر لوگ مولوی جمال الدین مدار المہام، مولوی نظام الدین، دیوان بجے رام، دیوان خوش وقت رائے، دیوان چھوٹے خاں اور نواب صدیق الحسن خاں کے نام سے بھی ناواقف اور ان کی تعمیری و علمی و انتظامی اور سیاسی خدمات سے یکسر نا آشنا ہیں بھوپال کی علمی و ادبی سرگرمیاں تاریخ ہند کے صفحات پر گاہے ماہے نظر آجاتی ہیں لیکن یہاں کی سیاسی کارروائیاں پردہ عدم میں روپوش ہو کر لوح حافظہ سے بھی اتر چکی ہیں۔

خوش قسمتی سے ماضی قریب کے اندر ریاست بھوپال میں ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت نے جنم لیا جس کی جان فروشانہ ملکی و ملی قربانیاں آزادی ہند کے لیے سیاسی خدمات تاریخ ہند کا سنہرا باب ہے لیکن اہل ملک کی محسن فراموشی و ناقدری نے ان کی گرامی قدر یاد کو بھی صفحہ دماغ سے محو کر دیا ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی ہندوستان کی آزادی و حریت کے لیے مسلسل سرگرمیاں اور بالآخر ملک و ملت کی راہ میں جلا وطنی کے عالم میں وطن سے کوسوں دور (گیلو فورنیا) داعی اجل کو لبیک کہنا ایسی عظیم الشان قربانی اور دلورہ کہانی ہے جس کی تاریخ میں بہت کم نظیر و مثال ملتی ہے۔ ان گم شدہ واقعات کو منظر عام پر لانے کی ضرورت عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن برطانوی

حکومت کی قہرمان پالیسی نے ان سیاسی کوائف و حالات کو تعزیر گنہامی میں ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا

راقم الحروف جبکہ تعلیمی دور سے گزر کر ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبت بابرکت میں حضرت شیخ الہند کی تحریک (ریشمی رومال) اور مولانا موصوف کے انقلابی کارناموں سے واقفیت حاصل کر رہا تھا اس وقت مولانا کی شخصیت اور ان کے حریت پرور کارناموں سے کان آشنا ہوئے کابل اور برلن کے سیاسی واقعات سے یک گو نہ روشناسی ہوئی لیکن مولانا مرحوم کے عمومی حالات سیاسی کوائف و واقعات دائرہ معلومات سے باہر رہے۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا بركات اللہ بھوپالی کے کارناموں کی عظمت کو محسوس فرمایا اور وزارت تعلیمات کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں ان کے سوانح کو شامل فرمایا اس سلسلہ میں قدیم بھوپال کے بابائے سیاست مولانا سعید اللہ خاں رزمی کے ذریعہ اس کی تدوین و ترتیب کا پیغام راقم الحروف کو ملا پھر دوبارہ اس کی یاد دہانی مولانا طرزی مشرقی سے کرائی گئی بہر حال اس حقیر بیچ مدال نے اس فرض کی ادائیگی کو اپنے لیے قابل افتخار اور اعزاز سمجھا اور اس کے ضروری نوٹ تیار کر لیے اور مولانا آزاد مرحوم کی ہدایات کا منتظر رہا۔ جب انجمن ترقی اردو ہند کے سالانہ اجلاس ۱۹۵۷ء میں دہلی حاضری ہوئی اور مولانا مرحوم سے ملاقات کے لیے سعی کی گئی لیکن ظاہر شاہ والی افغانستان کی میزبانی کے فرائض کی انجام دہی کی وجہ سے شرف ملاقات کا موقع دستیاب نہ ہو سکا مگر اس کتابچہ کے لیے خصوصی ہدایات دئے جانے کی خوشخبری ملی جس سے دل کے اندر عرصہ دراز کی خوابیدہ تمنائیں جاگ اٹھیں اور ناشکفۃ آرزوؤں کی کلیا پھٹنے لگیں اور اس بات کی توقع ہو گئی کہ ایک دیرینہ خواب

شرمندہ تعبیر ہو جائے گا مگر قضا و قدر کی جانب سے کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا
انجمن مذکور کے عام اجلاس میں مولانا آزاد کی زیارت آخری زیارت
اور اس خطیب وقت کی اردو کے لیے آخری تقریر تھی جس کے بعد حریت
و آزادی، علم و ادب کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہو گیا جس عظیم شخصیت نے
نصف صدی تک اپنی علمی و ادبی و سیاسی شعاعوں سے ظلمتِ کدہ ہند
کو منور کر رکھا تھا جس کی رعد آسا خطابت اور زلزلہ انگن تحریروں نے پورے
ملک میں ایک غلغلہ برپا کر رکھا تھا اس حادثہ ناگہانی سے راقم الحروف کے
حوصلے افسردہ اور دلوں پر مردہ ہو گئے اور وہ ابتدائی نوٹ جوں کے توں پڑے
رہے اس اثنا میں ہمارے مخلص دوست ایم عرفان مرحوم نے اس موضوع
کو اپنا یا اور اپنی عادت کے مطابق اپنا اور ہٹھنا بچھونا بنالیا ان کی یہ کتاب نقش
اول کی حیثیت سے پہلی بار منظر عام پر آئی لیکن اس انقلابی سوانح کے بعض
گوشہ سامنے آئے اور بہت سے تشنہ تکمیل رہے۔ مولانا بركات اللہ بھوپالی
نے بقول خود ”دو بار پورے عرصہ گیتی کا چکر لگایا اور دنیا کے بڑے بڑے مراکز
میں رہ کر اپنے مشن کو جاری رکھا“ اور ہزار ہا صعوبتوں، دشواریوں کے باوجود
ان سنگلاخ میدانوں کو طے کرتے رہے اوبالا آخر اسی راہ میں جان دی۔

تاریخ ہند کے سلسلہ میں ایسا غیر معمولی کارنامہ ہے جو ہر آئینہ بار بار
یاد دہانی کا مستحق ہے۔

اب جبکہ ہم آزاد فضا حریت و جمہوریت کی تازہ آب و ہوا میں سانس
لے رہے ہیں شمع آزادی کے اس پروانے کی زندگی اور اس سلسلہ میں ان کی
جاں سوز مساعی پر پردہ پڑا رہنا سخت ناحق کوشی و ناسپاسی ہے اس لیے
اس کتابچہ کو اہل ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی جا رہی
ہے اس کتاب کی تالیف میں جن مرحوم بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا
ان میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، علامہ محوی

صدیقی، محترم ملا رموزی، میجر عبدالسلام بھوپالی وغیرہم ہیں لیکن خصوصیت سے رفیق و کرم فرما محب و مخلص جو بندہ سے مخلصانہ ارادت رکھتے ہیں وہ منشی رفیق رفیق احمد بھوپالی ہیں بھائی رفیق مولانا برکت اللہ کے ساتھ کابل، تاشقند اور ماسکو میں حق خدمت و رفاقت ادا کر چکے ہیں وہ مولانا مرحوم کے عمومی احوال اور سیاسی کارروائیوں کے ۱۹۲۰ء کی پہلی ہجرت میں شامل ہو کر مولانا مرحوم کی معیت میں قیمتی اوقات گزار چکے ہیں موصوف سے اس سلسلہ میں کافی مدد ملی ہے اب جبکہ ”تاریخ بزرگان بھوپال“ کی تدوین و ترتیب کا کام اس حقیر کے ہاتھوں شرمندہ تکمیل ہوا چاہتا ہے جس کے اندر ڈھائی سو سالہ بھوپال کی علمی و روحانی تاریخ کو محنت و مشقت و دیدہ ریزی سے مرتب کیا گیا ہے ریاست بھوپال کے وہ روحانی معمار جنہوں نے اپنی علمی و عملی خدمات و تعمیری مساعی سے ریاست کا نام علمی و روحانی افق پر روشن کیا اور جن کی پر خلوص کوششوں نے ریاست کے نام کو ہندو بیرون ہند میں چمکایا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگان دین اور ارباب یقین کی اجمالی تاریخ کو اس کتاب کا مقدمہ بتایا جائے اور اختصار کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈال دی جائے کہ ریاست بھوپال کی تشکیل کس ماحول میں ہوئی اور اس کو اپنے قیام و بقا اور ارتقا کے سلسلہ میں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا اس طرح ”تاریخ بزرگان بھوپال“ کے تفصیلی حالات کا ایک اجمالی خاکہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔ سابقہ ریاست کی ان اہم فراموش کردہ شخصیات کو اس لیے منظر عام پر لایا جا رہا ہے کہ ہماری نئی نسل اور نئی پود اپنے آباؤ اجداد کے احوال سے واقف ہو کر عمدہ سبق حاصل کر سکیں اور دور ماضی کے آئینہ میں اپنے عہد مستقبل کو سنوار سکیں۔

مشرق و مغرب کا تقابلی مطالعہ

ریاست بھوپال کی ابتدائی تشکیل کا زمانہ وہی ہے جبکہ ایک طرف مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو رہی تھی اور دوسری طرف مغربی سامراج اپنی عیارانہ و مسکارانہ سازشوں کا جال پورے ایشیا میں بچھا رہا تھا اس لیے سترھویں صدی ایشیا و یورپ کی باہمی آویزش کے پرخطر مگر زبردست اہمیت کا حامل زمانہ رہا ہے۔ یورپ و ایشیا کی اس آویزش کے پیچھے صدیوں کے کون سے محرکات و عوامل کار فرما تھے۔ ضرورت ہے کہ ان کا تاریخی جائزہ لیا جائے تاکہ اس کے آئینہ میں اصل حقیقت کی جھلکیاں نکلا ہوں میں آسکیں۔

راہم الحروف کے سامنے تاریخ عالم کے مطالعہ سے صفحہ ذہن سے جو روشن نقطہ یا دلائل و آویز نقش ابھرا ہے اس کو تمثیلی پیرایہ میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے پانچوں براعظموں میں براعظم ایشیا کی حیثیت قلب یا دل کی ہے۔ تاریخی مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ دنیا کے پانچوں براعظموں کو ایک انسانی شکل تصور کیا جائے تو اس کا دماغ یورپ اور دل ایشیا اور باقی براعظم دھڑا اور ہاتھ پاؤں کی صورت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انسانی دماغ افکار و خیالات کا عظیم مخزن ہے اور دل وجدانی اور اس کے خواطر و ارادت کا منبع سرچشمہ ہے۔ امریکہ و آسٹریلیا کی پرانی قومیں (جو ان براعظموں کے اصل باشندے ہیں) ان کی حیثیت نامعلوم زمانہ سے انسانی ڈھانچہ میں دھڑا اور ہاتھ پاؤں سے زیادہ نہیں رہی۔ اس لیے یورپ (یونان و روم سے) افکار و خیالات نے پھیل کر فلسفہ و فنون کی شکل

اختیار کی۔ لیکن ایشیا کی سرزمین چونکہ روشن دل کی حیثیت سے صفحہ عالم میں ابھری ہے اس لیے تمام مذاہب و ملل اور سارے دھرموں کے سوتے یہیں سے پھوٹے اور پھر جملہ براعظموں میں اس کی لہریں پھیلیں اور آگے بڑھ کر ہر ملک میں اپنے معتقدین کے حلقے پیدا کیے۔ فلسفہ تاریخ کی روشنی میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے اندر سامی قوموں نے جس خطہ ایشیا کو اپنی سکونت گاہ بنایا وہ خطہ اپنے موسیٰ اعتدال، ماحول کی سرسبزی و شادابی حیات انسانی کے ساتھ سازگاری و خوشگواہی اور نیچے نیچے پہاڑوں، سدا بہار جنگلوں اور لہلہاتی ہوئی زمینوں کی وجہ سے خدا کے برگزیدہ بندوں، نبیوں، رسولوں، رشیوں، متبیوں کی دعوت کے مرکز بنے اس لیے یہ مقامات انسانیت کے روحانی نشو و نما اور ارتقا کے لیے بمنزلہ دل کے ہو گئے۔ اور نورانی واردات و تجربات، روحانی عقائد و خیالات کی شعا عین یہیں سے پھوٹیں، اور پھر چار دانگ عالم میں اس کی کرنیں پھیل گئیں۔ اس لیے یہ خطہ مذاہب عالم کا گہوارہ بنا۔

لیکن براعظم یورپ اپنی غیر معمولی موسمی تغیرات، آسمانی و زمینی حوادث و آفات اور عظیم سمندروں کے درمیان گھبرانے کی وجہ سے انسان کے لیے سخت جانی اور طوفانی زندگی گزارنے کی پرخطر جولان گاہ بن گیا۔ اس لیے آریائی اقوام کو شخصی و اجتماعی زندگی کے تحفظ کے لیے دشوار گزار مرحلوں اور خطرناک منزلوں سے گزرنا پڑا۔ انسانی دماغ نے اس راہ میں جو جدوجہد محنت و کوشش کی اس کے نقوش مغربی افکار و خیالات میں ثبت ہو گئے۔ اس لیے مغرب میں فلسفہ و سائنس نے جنم لیا اور اس نے انسان کی حیات مادی کی حقیقت پر زور دیا۔ اس لیے اس سرزمین میں حکماء، فلاسفہ اور مفکرین کی پیداوار زیادہ ہوئی۔ اور اس کے افکار و خیالات کی گونج سارے عالم میں سنائی دے جانے لگی۔ رہی منگولین یا تورانی اقوام کا مستقر یا ٹھکانہ تو وہ ایسا علاقہ تھا کہ بلند و بالا کوہستانوں، پرخطر دشوار گزار میدانوں اور

چوڑے چکے سبزہ زاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے ان کو سروسامان حیات مہیا کرنے کے لیے بہت زیادہ ہاتھ پاؤں مارنا پڑے اور اپنی زندگی کو قائم و برقرار رکھنے اور قافلہ حیات کو آگے بڑھانے کے لیے دست و بازو کو حرکت میں لانا پڑا اس لیے وہ اپنے مزاج کی درستی و سختی اور ماحول کی سنگینی کی بنا پر اطراف عالم میں دھاوے بولتے رہے عہد تاریخ کی صبح ہونے سے پہلے ان کی یلغاروں اور ان کے حملوں سے سلسلہ شروع ہو کر اب تک جاری ہے تاریخ کے نامعلوم دور سے جب دنیا کی قوموں میں حصول معاش کے لیے آوارہ گردی کی صورت میں باہمی ربط و ارتباط اور ایک دوسرے سے اختلاط کا دروازہ کھلا تو بہ موروثی خصائص بکھرنے لگے اور منفرد مزاج کے بجائے مرکب مزاج عقلی کا ظہور ہوا۔ دل اور دماغ اور اعضاء و جوارح کی اس جنگ عظیم میں الحرب سجال کے مصداق کبھی دل کو فتحندی اور کبھی دماغ کو کامیابی ہوتی اور کبھی وحشت و درندگی کے ہاتھوں دل و دماغ دونوں کو شکست ہو جاتی۔

تاریخ انسانیت ان خونیں اوراق روح فرسا و جاں گسل اور خوں ریز واقعات سے رنگین ہے۔ حق طلبی و خدا پرستی، مخلوق خدا کے ساتھ رحمدلی و ہمدردی مروت و شرافت اور شائستگی اور جملہ اخلاقی محاسن و کمالات جو انسانیت کے جوہر ہیں۔ یہی روحانیت و دین و مذہب کے اصل الاصول ہیں ماقبل تاریخ سے عصر حاضر تک کے احوال و واقعات کے مطالعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان محاسن و کمالات کا مرکز "ایشیا" رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں خود پرستی و خود غرضی، خود بینی و خود سری، تفوق و برتری، بیجا تسلط و غلبہ اور اقتدار پرستی ان خصوصی احساسات و جذبات نے مغرب کی سرزمین میں بال و پر نکالے اور اس جارحانہ جذبات و احساسات کی بنا پر اپنی جارحانہ حملوں کا مشرق کو نشانہ بنایا۔

مشرق و مغرب کی تاریخی کشمکش

مشرق و مغرب کی کشمکش کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنے خود مشرق و مغرب پرانے ہیں زمانہ ماقبل تاریخ سکندر اعظم کے حملہ ۳۵۶ ق م کے واقعہ کو چھوڑ کر عہدِ ماضی کی تاریخ کے جھروکے سے جب ہم پچھلی صدیوں کی طرف جھانکتے اور نظر ڈالتے ہیں تو دو عظیم سلطنتیں برّاعظم ایشیا کے دو کونوں پر اپنے اقتدار و حکومت کا پرچم لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ایک بازنطینی سلطنت جس کا مرکز ایلیا (بیت المقدس یا حمص) ملک شام میں واقع تھا دوسری ایرانی شہنشاہیت جس کا پایہ تخت مدائن ملک عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے پر تھا یہ دونوں شہنشاہتیں اس وقت کی آدھی آدھی دنیا کو اپنی مضبوط و محکم بازوؤں میں سمیٹے ہوئے اپنی رعایا و عوام کو اقتدار کے شکنجے میں کس کر ان کی محنتوں کے خونِ گرم سے آرام و راحت کے شبستانوں کو سجائے ہوئے عیش و عشرت کے جھولے میں جھول رہی تھیں۔

شہنشاہ اور اس کے مخصوص حواری امراء و رؤسا کے لیے یہ دنیا جنت عیش اور مصیبت زدہ عام لوگوں کا شتکاروں، مزدوروں اور ملازموں کے لیے مصیبتوں کی جہنم بنی ہوئی تھی کبھی کوئی عادل و انصاف پسند بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھ جاتا تو عوام کو راحت و آرام کے ساتھ سانس لینے کا زریں موقع مل جاتا ورنہ اکثریت کی قسمت میں آلام و مصائب کے تلخ اور کڑوے پھلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ملک و حکومت کی اندرونی اصلاحات و ترقیات سے زیادہ تر حکمران کی للچائی ہوئی نظریں بیرونی سلطنتوں پر پڑتی رہتی تھیں اور توسیع و ملک گیری کے لیے نئے

بہانے تراشے جاتے اور معرکہ آرائیوں کا میدان گرم رہتا تھا۔ چنانچہ روم و ایران کا ایک تاریخی معرکہ ۶۱۴ء میں پیش آیا جس کے اندر شہنشاہ ایران کیخسرو ثانی (خسرو پرویز) نے ہرکلیوس (ہرقل) شہنشاہ روم کو ایسی زبردست شکست دی کہ شام و مصر اور ایشیائے کوچک کے سارے علاقے باز نطینی حکومت کے ہاتھ سے نکل گئے اور قیصر روم (ہرقل) کو قسطنطنیہ (یورپ) میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہونا پڑا لیکن قیصر نے ہمت نہ ہاری اور ان حوصلہ شکن حالات میں بھی مفتوحہ علاقوں کی واپسی کے لیے فوجی تیاریوں میں لگ گیا اور نو سال نہ ہونے پائے تھے کہ ۶۲۲ء میں اس نے ایرانیوں سے اپنا معاملہ چکا لیا بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہو کر از سر نو زمام اقتدار ہاتھ میں لے لی ایرانیوں اور رومیوں کے ان خوفناک اور خونی مظاہر اور فتح و کامرانی کے دل خوش کن و شاداب مناظر سے ابھی آنکھیں سیراب نہ ہونے پائی تھیں کہ یکایک ایک غیر معروف خشک چٹیل بیابان اور تپتے ہوئے ریگستان سے ایک غیر مہذب غیر متمدن اور سپہاندہ قوم تاریخ کے افق پر نمودار ہو کر ایک حیرت ناک کرشمہ سے نگاہوں میں چکا چوندا پیدا کر دیتی ہے کہ یہی دنیا کی دو عظیم سلطنتیں ایک صحرائیں قوم سے ٹکراتی ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں اور غبارِ راہ بن کر اڑ جاتی ہیں ایرانی شہنشاہیت تو پردہ تاریخ سے اس طرح غائب ہوئی کہ پھر کبھی افق پر نمودار نہ ہو سکی لیکن باز نطینی سلطنت نے اپنا مرکز ایشیا سے اٹھا کر (یورپ) قسطنطنیہ کی طرف منتقل کر دیا پھر یہ قسطنطنیہ صدیوں تک رومی شہنشاہیت کا مضبوط و مستحکم قلعہ بنا رہا۔

یہ سپہاندہ قوم صحرائے عرب کے بکری چراتے والے تھے جنہوں نے ایک نئے مذہب کے فیض سے زندگی کا جوش و ولولہ لے کر گلہ بانی سے نکل کر جہان بانی کے میدان میں قدم رکھا اور ایک صدی نہ گزرنے پائی تھی کہ بڑا عظیم ایشیا و افریقہ کے وسیع علاقوں پر اپنی سلطنت کے بازوؤں کو پھیلا دیا اور تھوڑے ہی عرصہ

میں قوموں کی طرف سے غلط فہمیوں کے مطلع کے صاف ہونے کے بعد اپنی صداقت پسندی والو العزمی و فراخ حوصلگی، فیاضی و رواداری، اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری کی خوبیوں کو دیکھ کر ان قوموں نے ان کے لیے اپنی آغوشِ محبت کھول دی۔

خلافت راشدہ ۳۱ھ تا ۶۳ھ اور خلافت امویہ ۶۳ھ تا ۱۳۳ھ کے بعد جب خلافت عباسیہ عروس البلاد (بغداد) میں تختِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوتی ہے تو اس کے جلو میں ایشیا کی بڑی بڑی قوموں کے قافلے علمی و فنی ترقیاں کرتے اور میدانِ مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں عربوں کے ساتھ ایرانی، ترک و مغل اور افریقہ کے باکمال افراد اس عظیم سلطنت کے دست و بازو بنے ہوئے ایک ایسی بین الاقوامی *international*

national بلکہ بین الانسانی و آفاقی *Universal* مساوات انسانی کی بنیادوں پر تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں سرگرمی و تندی اور جاں فشانی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں کوئی ذات پات نہیں چھوت چھات نہیں اس لیے کہ اسلامی معاشرہ مختلف قوموں اور مختلف طبقوں کے ساتھ اپنی حدود میں پوری پوری رواداری و فیاضی کی آمیزش سے معرضِ وجود میں آتا ہے اس لیے انسانیت کا فافلہ اسلام کے زیر سایہ ایک ہزار سال ۶۳ھ تا ۱۳۰۰ھ علمی و عملی ترقیات کے میدانوں میں راستہ کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ باز نظمی سلطنت کا مرکز ایلینا اور ایرانی شہنشاہیت کا پایہ تخت مدائن دونوں مسلمانوں کے پاؤں تلے آگئے اور قیصریت و کسرت جو ملوکیت و شہنشاہیت کے عنوان تھے اسلامی تعلیمات کے انقلابی دھماکے سے یہ عظیم محلِ زمین پر ڈھ گئے اس لیے کہ اسلام خود سر و مغرور اور اقتدار پرست شہنشاہیت کو مٹانے کے لیے اور خدا کی بادشاہیت خلافت قائم کرنے کے لیے آیا تھا تھوڑا عرصہ (کچھ صدیاں) گزر جانے کے بعد سنیت پال

کی بناوٹی عیسائیت اور اس کے جھوٹے مذہبی پیشواؤں، پوپوں و پادریوں نے
 یسوع مسیح (علیہ السلام) کی اخلاقی تعلیمات کے پرچھے اڑا دیے اور عیسائیت
 کو جارحانہ پیرایہ عطا کر کے صلیبی جنگوں کے ذریعہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے
 درمیان ایک ایسا خونی دریا بہایا جس نے دجلہ و فرات کی روانی کو مات کر دیا
 اور ایک صدی سے زائد اہل مذہب اپنے مذہب کو بدنام کرنے میں مصروف رہے
 یہ صلیبی جنگیں ۳۵۵ء تا ۴۴۲ء خلافت اسلامیہ کے کمزور ہو جانے پر مشرق میں دوبارہ
 اقتدار حاصل کرنے کے لیے مغرب نے چھڑی تھیں جن پر مذہب کا دبیز پردہ ڈال
 دیا گیا تھا اس تاریخی حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ دنیا میں سیاست
 نے اکثر مذہب کا چولہ بدل کر مذہب کے نام پر انسانوں کے خون کی ندیاں بہائی
 ہیں ہمارے زمانے میں مذہب کی جگہ جدید نظاموں (سوشلزم، کمیونزم، ڈیموکریسی)
 نے لے لی ہے یہ وہی فتنہ کہن ہے جس نے نئے سانچے میں ڈھل کر انسانیت کو
 حیران و پریشان کر رکھا ہے بہر حال اس جارحانہ عیسائیت نے صلیبی جنگوں
 کے ذریعہ اس آفاقی تہذیب کو چیلنج کیا تھا اور پورا یورپ برسرِ اقتدار پاپائیت کے
 بھڑکانے پر اس جے جمائے نقشہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن
 تمدنِ اسلامی اس دریائے خون میں نہا کر اور زیادہ قوی و مضبوط ہو کر نکل آیا۔
 مشرق و مغرب کی اس مہیب و خوں ریز کشمکش میں مسلمانوں (سلطان
 صلاح الدین ایوبی اور ان کے ساتھیوں) کا کردار مسیحی تعلیمات کے مطابق معافی
 و فیاضی کا رہا مگر عیسائیوں نے پاپائیت کی جھوٹی قیادت کے زیر اثر ظالمانہ
 اور منتقمانہ رویہ اختیار کر کے شکست کھائی اور پھر اپنے پرانے مرکز قسطنطنیہ
 لوٹ کر اپنے اپنے ملکوں اور حکومتوں کی کمزوریوں کو دور کرنے اور تازہ زخموں
 کو مندمل کرنے میں لگ گئے لیکن جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے
 اپنی حکمت حربی و بحری اور بے مثال دلاوری سے یورپ کے اس ناواقف
 تسخیر قلعہ (قسطنطنیہ) کو فتح کر لیا تو مغربی اقوام کے پاؤں کے نیچے سے زمین

نکل گئی قرون وسطیٰ کی صلیبی لڑائیوں کے بعد یہ پہلی عظیم شکست تھی جس کی ٹھوکر نے خوابیدہ یورپ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا اور صدیوں کے نیند کے ماتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تاریخ اسلامی کے لیے عثمانی ترکوں کی اس عظیم فتح کا عجیب و غریب باجرا اس وقت ظہور میں آیا جبکہ مسلمانوں کو ہسپانیہ عظمیٰ (اندلس) کی سرزمین سے آٹھ سو سال حکومت کے بعد جلا وطن کر کے باہر پھینک دیا گیا تھا ایک طرف مغرب کے افق سے مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا تو دوسری طرف اسی کے ایک مطلع (قسطنطنیہ) سے فتح و کامرانی کا سنہری شعاعیں پھیلاتا ہوا سورج طلوع ہو رہا تھا بقول اقبال ”کعبہ کو صنم خانے سے پاسباں مل گئے تھے۔“ ہسپانیہ عظمیٰ کی سرزمین وہ ہے جہاں موروں (عربوں) نے اموی سلطنت کے عہد میں مغربی اقوام کے لیے علوم و فنون کے دروازے کھول دئے تھے۔ قرطبہ، غرناطہ اور آشبیلیہ کی عظیم الشان علمی درسگاہوں (یونیورسٹیوں) میں جدید و قدیم علوم کی گرم بازاری جاری تھی جہاں علامہ ابن رشد ابن باجہ ابن طفیل، ابوالہثیم اور ابوالقاسم زہراوی جیسے فلسفی و سائنسدان قدیم فلسفہ و حکمت کے ساتھ جدید علم (سائنس) کو اپنے مشاہدات و تجربات کے ذریعہ فروغ دینے کی ابتدائی کوششوں میں لگے ہوئے تھے چونکہ حکمت الہی (قرآن) نے ساری کائنات کو انسان کے لیے تابعدار و فرماں بردار ہونے اور فکر و نظر اور عملی قوتوں سے اس کی تسخیر کرنے کی دعوت دی تھی قدیمی مشرکانہ نظریہ کو یکسر مسترد کر دیا تھا کہ ہر عظیم و منفعت بخش مخلوق قابل تعظیم و عبادت ہے جس دن سے دنیا کی قدیمی تہذیبوں کا یہ شرکیہ فلسفہ تعلیمات انسانی کی بدولت دل و دماغ سے محو ہونا شروع ہوا سائنس کی بنیاد پڑ گئی اس لیے سائنس اسلامی تعلیمات کی دین ہے۔

سب سے پہلے سرزمین اندلس (ہسپانیہ عظمیٰ) سے اس آفتاب علم (سائنس) کی شعاعیں نکل کر یورپ کی فضاؤں میں چمکیں شائقین علوم کے قافلے اس

سرزمین کی طرف رخ کرنے لگے چونکہ اسلام نے اپنے طلوع ہونے کے بعد علم پر کسی فرقہ یا طبقہ کی اجارہ داری کے قدیم تصور کو باطل ٹھہرا دیا تھا اور اس کا اعلان کر دیا تھا کہ جس خدا کا دسترخوانِ نعمت ہر مومن و کافر کے لیے بچھا ہوا ہے اسی طرح علوم و فنون کا دروازہ ہر ایک انسان کے لیے کھلا ہوا ہے اس لیے کلیسائی نظام سے بیزار مغربی باشندے اسپین پہنچ کر علم و حکمت (فلسفہ) اور علم تجربی (سائنس) سے بہرہ اندوز ہوئے اور اس کی لہریں مغربی ممالک میں تیزی سے پھیلنے لگیں خود مسلمان سائنسداں، ترک خفا کی نافرمانی سے اسی طرح مغربی ممالک کی طرف منتقل ہونے لگے جس طرح آج ہندوستان کے اعلیٰ درجہ کے سائنسداں اور ڈاکٹر امریکہ یا یورپ کا رخ کر رہے ہیں اس لیے کہ ترکی قوم شجاعت و بہادری میں اسلام کے لیے بازوئے شمشیر زن ضرور بنی لیکن عربوں کی طرح علوم و فنون کی سرپرستی میں بہت پیچھے رہی اسی تحریک علمی نے نشاۃ الثانیہ کا آغاز کیا جس کا اعتراف یورپ کے منصف مصنفین راجر بیکن، ڈریپر، ڈاکٹر گٹاؤ لیبان موسیورنیاں وغیرہ نے کھلے بندوں کیا ہے البتہ مغربی تہذیب کی ستم ظریفی یہ ہے کہ جب مشرقی استاد بوڑھا ہو گیا تو مغرب کے نوخیز شاگرد نے استاد کو ٹھکانے لگا دیا اور وہی قصہ ہو گیا کہ جس شخص سے تیر چلانا سیکھا تھا سب سے پہلے اسی کو نشانہ بنایا گیا۔ انقلاباتِ عالم کی یہ داستاں ہمیشہ دہرائی جاتی رہی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی۔ یہ امر یاد رہے کہ پہلی صلیبی لڑائیاں عیسائی مذہب کے غلط جوشِ جنون کا نتیجہ تھیں جس کے اندر یورپ کے جنونی انتقام کی انتہا پسندانہ کار فرمائیاں عمل میں آئیں البتہ مسلمانوں کا کردار اعتدال پسندانہ رہا لیکن قسطنطنیہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر مغربی قوموں کو ہوش آ یا پہلے مسلمانوں کا مقابلہ جوش سے کیا گیا تھا جس کے اندر مسلمانوں کا جوش غالب آیا کیونکہ وہ ایک جوشیلی قوم تھی جب جب انھوں نے مشرق سے ہوش کے ساتھ مقابلہ کی ٹھانی تو وہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اترے اور ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ جن علمی ترقیوں اور تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ وہ اس میدان میں اترے تھے ان کا مقابلہ مشرقی اقوام نہ کریں

اور یقیناً جوش پر ہوش غالب آگیا بہر حال سترھویں صدی میں یورپ ایک طرف عربوں کی مدد سے علمی انکشافات اور عملی ترقیات کے میدان میں قدم رکھنے لگا تو دوسری طرف ترکوں کی قسطنطنیہ کی فتح، بحر روم کا قبضہ اور آبنائے باسفورس کے ذریعہ تاکہ بندی کر دینے سے یورپ کو بحری مہم جوئی کی طرف توجہ ہوئی جس کی پہل اسپین والوں نے کی، اس امر کا یاد دلانا ضروری ہے کہ مشہور اسلامی فاتح طارق نے سب سے پہلے یورپ کی جس سرزمین پر قدم رکھا وہ اسپین کی تھی جس کی یادگار جبرالٹر آج بھی موجود ہے اس لیے عربوں کی پہلی حکومت یورپ میں یہیں قائم ہوئی اور انھوں نے آٹھ سو سال تک اس خطہ کو اپنے عصر آفریں علمی انکشافات اور منفعت بخش سائنسی ایجادات سے دنیا کی جنت بنادیا قصر الحمراء، الزہراء اور جامع قرطبہ آج بھی تعمیر انسانی کے ہفت عجائب میں سے ہیں جب مسلمانوں کی دیرینہ بیماری (خانہ جنگی) نے ان کو ۱۴۹۲ء میں ملک بدر کیا تو اہل ہسپانیہ ان علوم و فنون کے وارث ہوئے چونکہ عربوں سے جہاز رانی کا پورا پورا سبق اہل ہسپانیہ نے حاصل کیا تھا اور ان عرب ملاحوں کے ساتھ سمندروں کے سفروں میں ملکوں ملکوں پھرے تھے اس بنا پر سب سے پہلے اسپین نے پھر اس سے ملحقہ علاقہ پرتگال نے بحری مہم جوئی کا آغاز کیا کو لمبس جوئی دنیا کا دریافت کرنے والا قرار دیا جاتا ہے وہ انہی عرب ملاحوں کا فیض یافتہ تھا اصل تاریخی حقیقت یہ ہے کہ کو لمبس سے صدیوں پہلے عرب جہاز راں اس سرزمین کو پا مال کر چکے تھے جیسے کہ ہم اپنی کتاب "شق القمر" میں لکھ چکے ہیں اسی طرح یہ امر بھی ثابت ہو چکا ہے کہ پرتگال کا مشہور بحری سیاح واسکو ڈی گاما، اسدا بحر (دریائی شیر) ابن ماجہ کی رہنمائی میں ۹ جولائی ۱۴۹۸ء میں افریقہ کا مکمل چکر لگاتا ہوا سب سے پہلے ہندوستانی ساحل گواہر لنگر انداز ہوا تھا اس لیے پرتگیزی قوم پہلی قوم ہے جس نے ہندوستان کی دولت کی تجارت اور سیاست کے پردہ میں لوٹ مار شروع کی انھوں نے پورے یورپ میں ہندوستان کے لیے سونے کی چڑیا ہونے کو افسانوی شہرت دی اور پھر اس چڑیا کو شکار کرنے کے لیے یورپ کا

ہر ملک نئے اور پرانے اپنے اپنے جال لے کر ادھر دوڑ پڑا یورپ کی حریص و طماع اور لالچی قومیں منظم طریقہ پر جزائر شرق الہند اور ہندوستان جنت نشان کو "نواں یمن" یا مالِ غنیمت سمجھ کر اس پر قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگیں جن کی بنا پر بحیرہ عرب و بحر ہند مغربی اقوام کی رقابتوں کا اکھاڑہ بن گیا جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے اہل یورپ کے نزدیک قدیم زمانے سے نہایت منفعت بخش سلسلہ تجارت مشرقی ایشیا کے زرخیز ممالک ہند اور مجمع الجزائر (حال انڈونیشیا و ملائیشیا) کو سمجھا جاتا رہا ہے اٹھارہ سو سال تک بحری تجارت کا مرکز اور منڈی اسکندریہ رہی رومی شہنشاہوں نے اپنی بحری مہمات سے عرب جہازرانوں کو بے دخل کرنے کے لیے عدن پر قبضہ جمانا چاہا لیکن چونکہ عرب سمندروں کے بادشاہ تھے اس لیے ان کے آگے کسی کی نہ چل سکی جب قافلہ حیات ان درمیانی صدیوں کو طے کر کے سترھویں صدی میں پہنچا تو دو امر مرکزی طور پر اس قافلہ کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف موڑنے کا سبب بنے (۱) پرتگیزی قوم کا ہند میں داخلہ (۲) سلطنتِ مغلیہ کا قیام۔ البقرق شاہیہ میں گواہی پر قابض ہوا اور بابر نے ۱۵۶۵ء میں پانی پت کے میدان کو سر کر کے منگل حکومت کی بنیاد رکھی۔ جب پرتگیزی قزاقوں نے بحیرہ ہند کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا تو اس وقت اکبر اعظم ملک کے مختلف صوبوں کو فتح کر کے اور اتحاد کی لڑی میں پرو کر متحدہ ہند کی داغ بیل ڈال رہا تھا۔ ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں جو ایک چھوٹا براعظم ہے اتنے دور دراز علاقوں پر قبضہ کر کے قابو پالینا بچوں کا کھیل نہیں اس لیے شہنشاہ کو خشکی کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں مل سکی اور بحری طاقت کی طرف خیال تک نہیں گیا حالانکہ دنیا دار مولویوں نے بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر حج کے نہ فرض ہونے کا فتویٰ سمندروں کے محفوظ نہ ہونے کی بنا پر دے دیا تھا جس کی وجہ وہی پرتگیزیوں کی سمندری لوٹ مار تھی لیکن اکبر نے اپنے ذوقِ تماشا بینی کے لیے پرتگیزیوں کو جگہ دے رکھی تھی اور ان کی بحری ریشہ دوانیوں سے غافل

و بے خبر رہا اکبر کا زمانہ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ تھا یہ دونوں ہم عصر تھے اکبر کے چار جانشینوں (جہانگیر و شاہجہاں) اورنگ زیب و بہادر شاہ) نے ایک سو اکیاون سال تک حکومت کی۔

اورنگ زیب اور لوی چار دہم دونوں کا ایک ہی زمانہ ہے ان دونوں نے تحت سلطنت پر اس وقت قدم رکھا جبکہ دونوں سلطنتیں نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی تھیں یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ مغل قوم کی جو شاخ قسطنطنیہ میں جا کر برسرِ اقتدار ہوئی جن کو ترک کہا جاتا ہے انھوں نے اپنی بحری طاقت کو اس قدر مضبوط بنایا کہ ۱۵۱۷ء میں ترکی بیڑے نے بحیرہ روم میں ۱۵۱۷ء کو شکست دے کر باہر نکال دیا لیکن ہندوستان کے مغل اس طرف سے بے پروا رہے ۱۵۷۸ء میں ملکہ ایلزبتھ نے ہالینڈ کی آزادی کو تسلیم کر کے اسپین سے جنگ کی اور اس کو شکست دے کر مشرقی نوآبادیات کے لیے راستہ صاف کر دیا چنانچہ ہالینڈ کے جہاز ۱۵۷۹ء میں راس امید (افریقہ) کا چکر کاٹ کے ایشیائی سمندروں میں داخل ہوئے پھر سترھویں صدی ہالینڈ و انگلینڈ کی رسہ کشی میں گزری بالآخر ہالینڈ نے پرتگیزی مقبوضات (جزائر شرق الہند) پر قبضہ جما لیا جو اپنی سرسبزی و شادابی اور ساری دنیا میں مصالحہ کی پیداواری کے لحاظ سے حصولِ دولت و تجارت میں کلیدی حیثیت رکھے تھے یہی بحری تجارت تھی جس نے جمہوریہ ہالینڈ کو غیر معمولی طاقت عطا کی اور یہی وہ عالمگیر کاروبار ہے جس پر انگلستان کی عظمت و شوکت کا عالی شان محل تعمیر ہوا سترھویں صدی کی ہالینڈ اور انگلینڈ کی رسہ کشی نے فرانس کو بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا ۱۶۵۲ء میں دونوں حکومتوں میں صلح ہو جانے کی وجہ سے انگلستان کی حالت سدھرنے لگی۔ شاہجہاں بادشاہ کے دور میں باہمی برادر کشی کی بنا پر کمپنی کا کاروبار جانگنی کی حالت تک پہنچ گیا ادھر اورنگ زیب کے دور ۱۶۵۷ء میں سیاسی و مسلکی استحکام پیدا ہوا اور ادھر ۱۶۵۷ء میں انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تو اپنے

نشہ قوت میں بدست ہو کر کمپنی بہادر نے شہنشاہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا
 شہنشاہ نے فرمان جاری کر دیا کہ انگریزوں کو مدراس اور ساحلی علاقوں سے
 ڈھکیل دیا جائے تو کمپنی کے چھکے چھوٹ گئے ساری تجارتی کوٹھیاں ضبط کر لی گئیں
 جب شہنشاہ میں اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں تو طوائف الملوکی نے سر
 اٹھایا اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کی نو آبادیات نے
 خود مختاری کی تیاری کر لی۔ سترھویں صدی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چولا بدلنے کا دور
 تھا جو تجارت سے آگے بڑھ کر سلطنت کی سرحد میں قدم رکھنے لگی اورنگ زیب
 جس نے پچاس سال تک نہایت مستعدی سے حکومت کی اور مغل سلطنت کے
 قصرِ عظمت کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا اس کے انتقال پر مغل شہنشاہیت
 کی جو دھاک دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اٹھنا شروع ہوئی اور پچاس برس گزرنے
 نہ پائے تھے کہ مغلیہ حکومت ایک پرچھائیں بن کر رہ گئی دغا باز و بزدل اور حریص
 اقتدار پرستوں کے ہاتھ میں حکومت ایک کٹھ پتلی بن گئی۔ بہر حال اٹھارھویں صدی
 کے اختتام پر برطانوی سامراج اپنے رسوائے عالم ڈپلومیسی کے ماتحت ملک کے
 اندر سازشوں کا جال بچھا کر اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہندوستان کو
 ہتھیا لینے میں کامیاب ہو گیا جس میں فرانسیسی سامراج کی غلطیوں اور ہالینڈ کی
 بد اقبالیوں کا بڑا دخل ہے۔ ہمارے نزدیک مشرقی اقوام اور عالم اسلام کے
 کے زوال کا نقطہ آغاز وہ سانحہ ہے جب ایرانی و تورانی (شیعہ و سنی) آدیزش کی
 بنا پر مشرق کے تجارتی قافلوں کا خشکی والا راستہ بند ہو گیا خشکی کی وہ تجارت جو عراق
 و عرب کو ہندوستان سے ملاتی تھی اس کا سلسلہ کٹ گیا یہی وہ قدیمی تجارتی
 خشکی کا راستہ ہے جو مشرق کی شاہراہِ عظیم سے جڑ جاتا تھا جہاں سے مشرقی مسال
 اسکندریہ کے ذریعہ یورپ دساور کیا جاتا تھا۔ ایشیا کے جس زوال کا آغاز خشکی کے
 تجارت کے خاتمہ سے ہوا تھا مغربی قوموں نے سو لھویں صدی سے اٹھارھویں
 صدی تک اپنی مسلسل کارروائیوں کے ذریعہ سمندروں پر قبضہ جمالیا اور عربوں کو

جب سمندروں سے باہر نکال پھینکا تو یہ زوال انتہا کو پہنچ گیا رہی سہی جو کسر باقی تھی وہ ۱۹۱۴ء میں ترکوں کے خلافت کے خاتمہ پر پوری ہو گئی اس لیے کہ ترکی خلافت اپنے ضعف و کمزوری کے باوجود ایشیائی ممالک کے لیے یورپ کے حملوں سے حفاظت و مدافعت کا فریضہ برابر انجام دیتی رہتی تھی اس لیے انیسویں صدی میں مغرب کا اقبال نقطہ عروج پر پہنچ گیا جہاں سے اس کے زوال کا آغاز ہوتا ہے جیسا کہ مشہور ہے ”ہر کمالے راز و ال“

تاریخ اسلامی ہند کے تین دور

تمہید!

ہمارا ملک ہندوستان جنت نشان عرب و ہند کی قدیم تعلق کی بنا پر پہلی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری اسلام کا رشتہ اس ملک سے بندھ گیا۔ عرب تاجروں اور مسلمان صوفیوں، درویشوں کی آمد و رفت ہوتی رہی۔ اور کئی مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوتی گئیں۔ محمد بن قاسم کے حملہ ۱۲۹ھ سے بہت پہلے ہمارے ملک میں مسلمانوں کے کئی مرکز قائم ہو چکے تھے۔ بلکہ عربوں نے اپنی دیانت و امانت ہمت و شجاعت کی بدولت جنوبی ہند کے متعدد راجاؤں کے یہاں عزت و احترام اور بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ گجرات، سندھ و دکن دمہارا شٹر و تامل ناڈو میں ہندو راجاؤں کے ماتحت پُر امن و خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور عرب تجارت اور فخر کے ہاتھوں اسلام ملک کے اندرونی علاقوں میں اپنے بازو پھیلاتا جا رہا تھا۔ اور ان ابتدائی مسلمانوں کی نیک کرداری کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کے دلوں میں اس کی طرف گوشہ التفات پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان خوش معاملہ تاجروں اور خدمت گزار درویشوں نے محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے ہی لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ سب سے بڑھ کر پر لطف بات یہ ہے کہ دائرہ اسلام کی وسعت کا سلسلہ جنوبی ہند سے مزید پھیلاؤ اختیار کر رہا تھا۔ جہاں نہ محمد بن قاسم کی فوجیں پہنچ سکیں اور نہ کبھی غزنوی و غوری فوجوں کے قدم

اس سرزمین پر پڑ سکے۔

یہاں تک کہ شہاب الدین غوری کے حملہ ۱۱۹۱ء کے وقت ملک میں نہ صرف مسلمانوں کے بے حد و بے شمار نوآبادیوں کا سلسلہ تھا بلکہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جن کو ہندوستان میں اسلام کا پہلا داعی بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت کی تشریف آوری سے سو اٹھ سو سال پہلے ۱۱۹۱ء ملک کے وسطانی خطہ (مالوہ) میں جہاں اس دور میں پہونچنا مشکل تھا شاہ عبداللہ چنگال کے ہاتھ پر راجہ بھوج ثانی المعروف شاہ عبداللہ مسلمان ہو چکا تھا جس کی تفصیل ہم اپنی کتاب ہندوستان اسلام کے سایہ میں کر چکے ہیں۔ لوگوں کے لیے یا تاریخی واقعہ تعجب خیر ہو گا کہ۔

جب غوری نے ۱۱۹۲ء دہلی پر قبضہ کیا تو اس وقت ملک مالوہ کا بادشاہ بہادر شاہ نامی غوری سے مقابلہ کرنے کے لیے دہلی پہونچا اور غوری کی فوجوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ اس لیے ہمارے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کی تشریف آوری یا غوری کی فتح کے بعد ہندوستان مسلمانوں کا ایسا ہی مرکز بن گیا تھا۔ جیسا کہ بلخ و بخارا۔ یا اصفہان و شیراز زمانہ قدیم میں تھے۔

بہر حال تاریخ اسلامی ہند کا ابتدائی گوشہ خالی باب ہے۔ جو عہد نو کے مورخ کے انتظار میں چشم براہ ہے جو فرانگی سامراج کی پھیلائی ہوئی تاریخی غلط فہمیوں کے گرد و غبار کو اپنے نوک و قلم سے صاف کر سکے جس نے تینوں ملکوں۔ ہند و پاک اور بنگلہ دیش کی فضاؤں کو مسموم کر رکھا ہے۔

ترک افغانی مسلم حکومت کا دور

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے قائم شدہ نظام کے مطابق ہندوؤں کی طرح نووارد مسلمان بھی مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے آج کل کی زبان میں وفاقی نظام (فیڈریشن) کے ماتحت رہتے چلے آ رہے تھے۔ ان نووارد مسلمانوں میں

اس ملک کے اندر اسلامی و دینی تعلق کے علاوہ ملکی اتحاد کا کوئی رشتہ موجود نہ تھا۔ مختلف راجوں مہاراجوں کی حکومتوں میں اپنی آزادانہ زندگی گزار رہے تھے ہندوستان کے باشندوں کی قدیمی فیاضی و رواداری کی روایات کی وجہ سے اس ملک میں مذہبی تعصب کا سایہ نہ پڑا تھا۔

جب غوری قطب الدین ایبک المتوئی ^{۱۱۹۱ء} ایک اپنے ترک غلام کو اپنا نائب مقرر کر کے عزنی ^{۱۱۹۲ء} میں چلا گیا اور وہ غوری کے بعد سند نشین حکومت ہوا تو ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اورنگ آرائے سلطنت ہوا۔ وہ انصاف پسند بادشاہ تھا۔ ہندو، مسلم اس کی نگاہ عدل میں یکساں تھے اور اس کی سخاوت و فیاضی کا دیرپا ہر ایک کے لیے یکساں بہتار ہوتا تھا۔ اس لیے سب اس کو لکھ داتا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک نے اس ملک کو اپنا وطن بنا کر قطب مینار تعمیر کیا اور امرار و رؤسا کی عالیشان تعمیرات نے دہلی کو مستقل مستقر بنایا اب دارالسلطنت دہلی بھی بغداد، فرطیہ، دمشق، قاہرہ کی طرح ہندوستان میں ایک مرکز اسلام بن گیا۔ چونکہ مسلمان بادشاہ توحید میں سرشار ہو کر آئے تھے اس لیے انہوں نے اپنے عقیدہ توحید کے مطابق ایک متحدہ ہند کے تصور کی داغ بیل ڈال دی۔

قطب الدین ایبک کے غلام و جانشین شمس الدین التمش نے زمین ہموار کی التمش پہلا بادشاہ ہے جس کو بغداد کے خلیفہ نے ہند کا بادشاہ مان لیا۔ اور اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ التمش کے دور میں علماء و فضلاء کا جگمگا ہوا تھا۔ اس کا دربار محمود غزنوی اور سلطان سبخر کے دربار کی یادوں کو تازہ کرتا تھا ان فاضلوں کا ملوں کو جمع کرنے میں ہر سال ایک کروڑ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ التمش کا دور حکومت ^{۱۱۹۱ء تا ۱۲۲۶ء} رہا۔ اس وقت ملک جس اندوئی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا تھا اس نے اس طوفان سے نکال کر ملک کی کشتی کو ساحل ترقی پر لگایا۔ پھر سلطان ناصر الدین محمود جو التمش کا چھوٹا بیٹا تھا تخت نشین ہوا ^{۱۲۲۶ء} اس کی بیٹی و پوینہ گاری

کا یہ عالم تھا کہ خزانہ شاہی سے ایک جہہ نہ لیتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے وہ قرآن شریف لکھتا اور اس کے ہدیہ سے اخراجات پورا کرتا تھا۔ بیوی ملکہ ہند اپنے ہاتھ سے کام کاج کرتی تھی۔ اس کے بعد غیاث الدین بلبن المتوفی جو اس عادات میں ۶۶۶ھ کے لحاظ سے مجموعہ اضداد تھا اس کے زمانہ میں ہزاروں علماء و فضلاء چنگیزیوں کی دست و پیر سے کل کر ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے اس کے دربار کو بارگاہِ محمود سحر سے زیادہ درجہ دیا گیا۔ وہ عالموں و بزرگوں کی قدر دانی کرتا اور احکام خداوندی کو سنکر زار زار رو دیتا۔ اس نے پہلے وزیر بن کر پھر بادشاہ کی حیثیت سے چالیس سال تک اپنے تدبیر اور بہادری سے ملکی نظام مستحکم کرتے متحدہ ہند کی بنیادیں فراہم کیں بلبن کا دور حکومت ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء رہا پھر اس کے بعد جلال الدین خلجی برسرِ اقتدار آیا جو نہایت نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ تھا۔ مذہب پسندی و رواداری اور خدا ترسی میں پہلے بادشاہوں سے کم نہ تھا جس وقت وہ شہید ہوا۔ روزے سے تھا اور زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا۔ جلال الدین خلجی کے داماد اور بھتیجہ علاء الدین خلجی نے اپنی فتوحات کے غرور میں بوڑھے چچا کو قتل کر کے حکومت کو قبضہ لیا۔ ابتداً اس کی انانیت پسندی نے نیا مذہب جاری کرنے پر اس کو اکسایا لیکن بہت جلد ٹھوکر کھا کر سنبھل گیا۔ اور ۱۲۹۶ء میں مسندِ اقتدار پر بیٹھا۔ سلطان علاء الدین خلجی جو سکندر عہد تھا (اپنے زمانے کا سکندر) یہ وہ پہلا شہنشاہ ہے جس نے اپنے مشہور سپہ سالار کے ذریعہ جنوبی ہند کو فتح کر کے مرکزِ دہلی کے تابع بنایا۔ اور شمال و جنوب کو مسلکِ اتحاد میں پر دکر صدیوں سے بچھڑے ہوئے علاقوں کو ایک کر دیا۔ پھر محمد شاہ تغلق نے جو عاقل و دیوانہ کہلایا۔ یہی وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے ہندوستانی کی پرانی راہدھانی دہلی کو چھوڑ کر جنوبی ہند کے مقام دیوگیر (دولت آباد) کل ہند راہدھانی بنا کر ملکی اتحاد کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور صدیوں کی اس اجنیت اور غیریت کی دیوار کو ڈھا کر شمال و جنوب کے آنے جانے والوں کے لیے بند راستے کھول دیے۔ پھر مسلمان فاتحوں کی بدولت متحدہ ہندوستان (ہند سلطنت)

کا مستقل نصب العین بن گیا۔ جس کو بعد میں مغل شہنشاہیت نے درجہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اکبر و عالمگیر کے عہد میں پچھلے مسلمان بادشاہوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ اس لیے مسلمان بادشاہ ہمارے نزدیک اپنے عقیدہ توحید کی بنا کر متحدہ ہند کے بانی مہمانی اور داعی ہیں۔ بہر حال ان ترک افغانی بادشاہوں نے جن کے اندر خاندانِ علامانِ خلجی و تغلق اور لودھی سب شامل ہیں۔ ہندوستان کی مسلم حکومت کو بغداد و خوارزم و غزنی و غور کے زیر اقتدار رکھنے کے بجائے ایک آزاد و مختار سلطنت بنا دیا۔ اس مسلم دورِ حکومت میں مرکزی خلافت سے ذہنی رشتہ ضرور قائم رہا۔ مشہور عالم سیاح علامہ ابن بطوطہ اسلامی سفیر بن کر آیا اور پھر عہدہ شیخ الاسلامی پر ایک عرصہ تک دہلی میں قیام کیا۔ ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس ملک میں سکونت و اقامت صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ لیکن اس ملک کو مستقل و خود مختار حکومت بنانے کا سہرا ان افغانی بادشاہوں کے سر ہے۔

ترک افغانی حکومت کو ملک کی عظیم خدمت:-

اس مسلم افغان حکومت کا سب سے بڑا عطیہ ہمارے ملک کو ملکی اتحاد شمالی و جنوبی ہند کے درمیان صدیوں پرانے رابطوں کی تجدید ہے۔ دوسرا تحفہ قابل قدر یہ ہے کہ ان بادشاہوں نے ہمارے ملک کو بیرونی حملوں محفوظ کر کے ملک کو سرسبز و شادابی اور ترقی کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب افغان مسلمان بادشاہوں نے دارالسلطنت کو متحدہ ہند کا مرکز بنایا تو یہ دورِ بارہویں صدی عیسوی) ساری دنیا خصوصاً ایشیائی مسلم ممالک کے نہایت خطرناک دور سے گزر رہی تھی منگولین قوم جو اپنے پہاڑی دروں اور کوہستانی خطوں میں صدیوں سے مجسوم بیٹھی ہوئی تھی یکایک ایک عظیم بند کی طرح پھٹ پڑنے کی طرح اپنے علاقے سے ابل پڑی۔ اور یا جوج ماجوج بن کر ٹوٹ پڑی اونچے اونچے پہاڑوں ایشیا و یورپ کے نشیبی علاقوں کی طرف ٹوٹ پڑی تھی۔ منگولین قوم قہرا لہی کا سیلاب بن کر پھیل گئی۔

جو اس کی زد میں آیا تھس تھس ہو گیا۔ قیامت سے پہلے قیامت قائم ہو گئی عروس البلاد بغداد جو صدیوں سے مسلم تہذیب و تمدن کا گنجیہ دار اور اس وقت کی تمام اقوام و حلقہ کے علوم و فنون کا آئینہ بردار اور جملہ قوموں اور مذہبوں کے آزادانہ افکار و خیالات کا گہوارہ رہا تھا۔ خلیفہ اسلام جہاں بیٹھ کر آدھی دنیا پر دادِ حکمرانی لیتا تھا۔ جس کے شاندار و رنگارنگ شاہی محلات اور امراء کی عایشانِ عمارات خوبصورت خوشنما، بلند و بالا مناروں والی مساجد جگمگاتے بازار و روشن شاہراہیں۔ وسط شہر میں دریائے دجلہ کی سبک و خراماں لہریں، نہروں کا جال پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا گویا کہ وہ شہر اس وقت دنیا کی بہشت تھا۔ اہالیانِ بغداد کی عیش پرستی و باہمی خاندانہ جنگی نے ان کو ایسا رزبد دکھایا کہ لاکھوں انسانوں کی آبادی کو خون کے دریا میں سے گزرنا پڑا ہلا کو کی فوجوں کی ہلاکت سامانی کا عالم یہ ہوا کہ انسانوں کے خون سے دجلہ کا پانی چالیس دن تک سرخ خون بنا رہا۔ اور جب وہاں کے قیمتی کتب خانوں جلا کر دجلہ میں ڈالا گیا تو مدتوں پانی سیاہی کا کام دیتا رہا۔ شہر مہینوں آگ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ غرض صدیوں کا جمع کیا ہوا علمی ذخیرہ اور تہذیبی اثاثہ اور تمدنی ورثہ جل جلا کر خاک ہو گیا جیسر شیخ سعدی نے بڑا دل سوز مرثیہ کہا ہے

آسماں راجع بود گر خون ببارد بر زمین۔ بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
نہ صرف عروسِ ابلقاء کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ملکِ خوارم شاہی جلا کر خاکستر
کر دیا گیا۔ اصفہاں برباد نیشاپور تباہ۔ بلخ و بخارا مسمار اور مشہد مقدس کو جلا
دیا گیا۔

تاریخ کے اوراق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں ایک طرف منگول اڑیں خیل کے یلغار۔ ویانا سے انڈونیشیا تک اور ساہیو سے مغربی ایشیا کے ساحلی علاقہ تک اور دوسری طرف دہلی سلطنت کو ہندو کش سے رامیشور تک کے لیے بڑھ رہے تھے۔ لیکن دہلی کی مرکزی سلطنت کا کل ہند فولادی نظام اس قدر مضبوط و طاقتور تھا کہ منگولیوں کی ساری فوجی طاقت اس کے قلعہ سے

سر شکر اٹھ کر رہ گئی سلطان شمش الدین التمش ۱۲۲۰ء سے محمد تغلق کی تخت نشینی ۱۲۲۵ء تک پورے سو سال تک روئے زمین کی بڑی سلطنت کی حیثیت سے قائم رہی اور ایک تہذیبی و معاشرتی رشتہ میں پورے ملک کو پرو کر متحدہ ہند کی داغ بیل ڈالی۔

چنگیزی حملہ کی ہولناکی کی روداد یہ ہے کہ چنگیز خاں ۱۲۲۰ء میں سمرقند و بخارا کو تباہ و برباد کر کے قبۃ الاسلام بلخ کی طرف رک گیا اور اگلے سال بارہ تھو مسجدوں و دتو حماموں والے شہر کو ایسا دیران کیا کہ کوئی چراغ جلانے والا نہ رہا۔ اس وقت سلطان التمش ۱۲۲۵ء میں اس بلائے بے درماں کو بالابالا ٹال دیا خواہ زم شاہی سپہ سالار جلال الدین کی مدد کر کے ہندوستان کی سرحد کو ان خونخواروں مغلوں سے بچا یا۔ سلطان التمش کے بعد ناصر الدین محمود جو شاہی میں فقیری کرتا تھا اس کے جاہ و جلال کا شہرہ سن کر جو دربار دہلی کے شان و شوکت دیکھ کر مغلوں کا سفیر مہبوت و حیرت زدہ ہو کر گھٹیا چٹا پنچہ مغلوں کی پھر ہمت نہ ہو سکی کہ دہلی کی طرف رخ کر سکیں۔ جب سلطان غیاث الدین نے اپنے آقا ناصر الدین محمود کی سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالی تو مرکزی سلطنت کی بنیادوں کو اس قدر مضبوط و مستحکم کر دیا کہ نہ داخلی فتنے ہی اس کو ہلا سکے اور خارجی و بیرونی حملوں نے اس کو متزلزل کیا۔ سلطان بلہوں کے آخری عہد حکومت میں ہلاکو کے پوتے ارغوان خاں حاکم ایران نے امیر تیمور کو انتقام لینے کے لیے تیس ہزار کا جہاز لشکر ملتان بھیجا۔ بلہن کا بیٹا سلطان محمد خاں المعروف یہ خاں شہید کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا۔ میدان جنگ میں شاہی افواج نے مغلوں کو پسپا کر ہی دیا تھا۔ لیکن بحکم قضائے ستم کا شکار ہو گیا۔ بلہن اس غم کو برداشت نہ کر سکا اور ۱۲۸۶ء میں اس پر خاندان غلامان کا خاتمہ ہو گیا اور جلال الدین خلجی مسند اقتدار پر بیٹھا خلجی خاندان تیس سال حکمران رہا، جلال الدین خلجی کے جلوس کے اگلے سال ہی ۱۲۹۰ء میں ایک لاکھ منگولیوں اور چینیوں کا ایک زبردست لشکر دریائے جہلم پار کر کے پایہ تخت کی طرف سیلاب کی طرح بڑھا۔ جس کو ظفر خاں اور الغ خاں نے شکست دے کر بھگا دیا۔

جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی اپنے خسر جلال الدین خلجی کو ٹھکانے لگا کر برسرِ اقتدار ہوا تو منگولی سردار قتلغ خواجہ کی سرگردگی میں دولاکھ کے لشکر نے دہلی پر دھاوا بول دیا اور کیلی میں مورچہ جمایا۔ تو خود شاہ میدان جنگ میں کود پڑا اور شہر کو بربادی سے بچانے کے لیے شہرِ پناہ سے باہر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا کہ اگر خدا نخواستہ بادشاہ کو شکست ہو جائے تو شہریوں کے جان مال کا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ کو تو ال شہر کو کنجیاں حوالہ کر دیں کہ وہ ہار کی صورت میں غنیمت کو دیدیں ہفتوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی رہیں۔ اور بادشاہ نے اپنی حربی حکمت عملی سے جنگ کو طول دیا۔ یہ پالیسی ایسی کامیاب ہوئی تو حملہ آور خود پسپا ہو کر راتوں رات بھاگ نکلے (جامع تاریخ ہند از مسیح ص ۳۲) اس واقعہ سے جہاں اُس کی مردانگی و کمال تدبیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہیں انسان دوستی بھی آشکار ہوتی ہے۔ اُس کے عہد حکومت میں منگولیوں، تاتاریوں اور چینیوں نے پانچ سے زیادہ خوفناک حملے کئے لیکن شہنشاہ نے سب کو پسپا کر کے لوگوں کے دلوں سے منگولیوں کی طرف سے پیدا شدہ دہشت کو دور کر دیا۔ اور اس طرح ناقابل شکست عزم و قوت سے ہندوستان کی سالمیت و یکجہتی اور یہاں کی تہذیبوں کی رنگارنگی کو ہر طرح محفوظ کر دیا۔ منگولیوں کے اس حملہ اور غارت گردی سے بہت سے مرکزی شہر تو ایسے برباد ہوئے کہ دوبارہ پھر نہ آباد ہو سکے بغداد کی تباہی ایسی آئی کہ پھر ویسی رونق آج تک واپس نہ آ سکی۔ شہروں کے علاوہ دیہات کی بستیاں ایسی اجڑیں کہ دوبارہ نہ بسائی جاسکیں بہر حال ان ترک افغان بادشاہوں کی ملک سے وفاداری اور بہادری سے منگولوں سے سخت مقابلہ آرائی کے نتیجے میں عالم اسلام میں صرف ہندوستان ان طوفانی بلاؤں سے بچا رہا۔ علاء الدین خلجی نے اس خارجی فتنہ کی سرکوبی کے بعد داخلی انتظام، زمین کی لگان بندی، تنخواہوں اور اجرتوں میں درجہ بندی، ضروریات زندگی کی اشیاء پر کنٹرول نے ملک کو ترقی و خوشحالی سے مالا مال کر دیا۔ شہنشاہ کو جہانگیری کے ساتھ جہان نانی کا اعلیٰ سلیقہ حاصل تھا۔ اور واقعی سکندر ثانی کہے جانا کا مستحق ہے۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے متحدہ ہند

کے تصور کے خاکے میں عملی رنگ بھرا اور ملک کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے محفوظ کر دیا۔ شاہنشاہ علاء الدین کا دور حکومت بیسٹھ سال ہے۔ جس کے اندر اس نے تاریخ ہند کا کچھ صفحہ پر ایسے نقوش ثبت کئے جو انمٹ ہیں۔ یہ تاریخی لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تمام بادشاہ جنھوں نے اپنی حکمت عملی، بہادری و دلاوری اور صلاحیت انتظامی سے تاریخ میں نام پیدا کیا۔ جیسے شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود سلطان غیاث الدین بلبن اور خود علاء الدین ہیں ان سب کو اپنے سیاسی اقتدار کے لیے بیسٹھ سال ضرور ملے ہیں۔ بہر حال تاریخ ایشیا و یورپ کا خطرناک زمانہ ہمارے ملک کی علمی و عملی، سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی ترقیات کا سنہری زمانے چونکہ مغلوں، تاتاریوں، چینیوں کے اس تابڑ توڑ حملوں اور خونخوار حملوں اور خون ریز دھاؤں سے پورا عالم اسلام زیر و زبر ہو رہا تھا۔ مغلوں کے ہاتھوں وہ لٹے پٹے قافلے جو خانماں و برباد ہو کر گوشہ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جن کے اندر بڑے بڑے علماء و فضلاء اور مشائخ و صوفیاء تھے۔ انہوں نے ہمارے ملک میں پناہ لی۔ اور اس ملک نے اپنی پرانی میزبانی کی روایات کے مطابق ان کی پذیرائی کی۔ چنانچہ ہر علم و فن کے ممتاز عالم و فاضل اور کامل انسانوں کی آمد سے ہمارا ملک علوم و فنون کا نشیمن بن گیا۔ عروس البلاد بغداد کی وہ علمی مرکزیت جو قاہرہ، بخارا اور اصفہان و شیراز کو حاصل ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دارالسلطنت دہلی کی طرف منتقل ہو گئی اور دہلی رشک بغداد و شیراز ہو گیا۔ حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنے عصر کو خیر الاعصار (بہترین سنہری زمانہ) فرمایا ہے۔ اس دور کے علماء، مشائخ کے روزگار شخصیتیں تھیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

چنانچہ بغداد اور قاہرہ اصفہان، شیراز، بلخ و بخارا کی طرح ہندوستان کی سرزمین عرفان آگیاں بھی ایک اسلامی مرکز بن گئی۔ شہرہ آفاق شاعر امیر خسرو دہلوی نے شاعرانہ انداز میں تمام اسلامی ممالک کے شہروں پر دہلی کو فضیلت کا ترانہ گایا ہے۔

خوشا ہندوستان و رونق دیں : شریعت راکمال غر و تمکین
 ز علم باعمل دہلی نخبارا : ز شاہاں گشتہ اسلام آشکارا
 وہ فرماتے ہیں کہ دہلی عدن کی جنت ہے، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے وہ باغ ارام ہے
 اس کا قلعہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ آسمان نیچا اور اس کی حصار اونچی ہے۔ اس کا ہر گھر
 بہشت ہے۔ اس شہر کی جامع مسجد فیض الہی کی جامع ہے۔ قطب مینار کے لئے کہتے
 ہیں کہ اس مینار کو دیکھ کر چاند نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی ہے۔ حوض شمس کا پانی اگر حضرت
 خضر پی لیتے تو آپ حیات کے چشمہ کو بھول جاتے۔ خوشگوار باد نسیم سے یہاں گلشن و گلزار
 میں سال بھر بہار خیمہ ڈالے رہتی ہے۔ یہاں کی سرزمین پھولوں کی وجہ سے سونے چاندی
 سے بھری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں جنت کی ہریالی ہے۔ اس شہر کے لوگ فرشتہ سیرت
 ہیں۔ اور اہل جنت کی طرح خوش دل اور خوش خو ہیں۔

حضرت دہلی کیف دین و داد = جنت عدن است کہ آباد یاد
 گر شود قصد این بوستان = یکہ شودہ طائف ہندوستان
 گرچہ بر بست فردوس جہاں = باہم آمیزی خوں نداں ست جہاں
 لیک بہ ندامت ہمیش و گر = کانش دروں بدماز جنت بشمر
 زان سبب خاص بر اصحاب یقیں = ہند رواں گفت کہ خلا است بریں
 غلط کردم گر ار دانش الم دم = نہ لفظ بندی ست اور پارسی کم
 مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ جس نے سارے عالم اسلام کا سفر کیا تھا۔ دہلی کو سب
 سے بڑا شہر بتایا ہے۔ (سفر نامہ پیرس ص ۱۴۶) غلجی خاندان کے بعد جب خاندان تغلق
 تخت دہلی پر بیٹھا تو دہلی کی مرکزیت مزید مضبوط مستحکم ہوئی اور فیروز شاہ تغلق نے
 ملک کو اندرونی و بیرونی خطروں سے محفوظ کر کے تعمیری منصوبہ پورے ملک میں
 نافذ کیا۔ عالیشان عمارت، شاندار مدارس، آرام دہ سراییں اور وسیع و فراخ
 شاہراہوں کا جال پورے ملک میں بچھا دیا۔ پھر لودھی خاندان میں سکندر لودھی کا
 عہد علم و ہنر کا دور تھا۔ جس کی شہادت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں

دی ہے۔

اس افغانی مسلم دور حکومت میں یہاں کی حکومتوں کا مرکزی خلافت سے نہی و دینی رشتہ زوردار طور پر قائم رہا۔ چنانچہ تغلق کے دور میں ابن بطوطہ اسلامی سفیر بن کر آیا اور شیخ الاسلام کے جلیل القدر عہدہ پر اسی خیر الامصار دہلی میں رہا۔ آخری افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کو کل پانچ سال حکومت کرنے کے لیے اُس نے پنج سالہ منصوبہ میں کل ہندوستان کو سندھ سے بنگال تک اور دہلی سے دکن تک شاہراہ اعظم کے ذریعہ جوڑ دیا۔ علاء الدین خلجی کی طرح اگر اس کو بیس سال کا موقع ملتا تو وہ ہندوستان کو ایشیا کا سب سے بڑا ملک بنا دیتا اس کا دور حکومت ۱۵۲۰ء سے ۱۵۲۵ء رہا۔

بہر حال سلطنت مغلیہ کے بانی شہنشاہ بابر ۱۵۲۶ء نے سکندر لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دی تو تاریخ ہند کا دوسرا اوراق الٹا۔ قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ اسلام کا معجزہ ہے۔ وہی منگول جو عالم اسلام کے لیے قیامت صفری بن کر ٹوٹے تھے۔ دو صدی گزرنے نہ پائی کہ وہ وحشی و خونخوار قوم حلقہ بگوش اسلام ہو کر تھوڑے عرصہ میں ایسے مہذب ہوئے کہ یورپ میں ترکوں اور ہندوستان میں مغلوں کے نام سے زبردست تہذیب و ترقی کے نقوش صفحہ گیتی پر مرمم کر دئے بقول اقبالؔ

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

”حکومت مغلیہ کا ہندوستان“

خاندان مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر ۱۵۲۶ء اپنی مہم جوئی، جوان ہمتی، جفا کشی و تیغ آزمائی اور مستقل مزاجی کی مورثی خصوصیات کے ساتھ اس نے جس علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جن عالموں و فاضلوں کے زیر سایہ پرورش پائی اس کے حوصلے و ہمت نے اپنے باپ کی چھوٹی سی ریاست فرغانہ پر ہی محدود رہنے سے انکار کر دیا اُس نے اولاً کابل و پنجاب اور پورے ہندوستان کو زیر تصرف لانے کا خواب

دیکھنا شروع کر دیا آخر لڑتے بھڑتے دشمنوں سے ٹکرتے ہوئے پانی پت کے میدان کی فتح یابی نے اس کو آسمان تاریح کا درخشندہ ستارہ بنا دیا ایک طرف میدان پانی پت میں سکندر لودھی ایک لاکھ کا جہاز لشکر آورد و سری طرف بابر کے ساتھ صرف بارہ ہزار مگر کار آزمودہ جاں باز فوج میدان میں اتری بابر کی حکمت حربی و بے مثال دلاوری نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ۱۵۱۹ء میں کر دیا۔ اور اس نے حکومت مغلیہ کی بنیاد سرزمین ہند میں رکھ دی میدان رزم کے اس شہسوار نے بزم کے میدان میں بھی اپنی علم نوازی و ادب پروری سے لوگوں کے دلوں میں سکھ بٹھایا چونکہ وہ فنون لطیفہ کا شیدائی تھا ہمارے نزدیک بابر کا وصیت نامہ حکومت مغلیہ کا اصل سنگ بنیاد ہے جس پر اکبر نے مغل شہنشاہیت کی فلک بوس عمارت تعمیر کر کے گریٹ مغل کا لقب پایا۔ چونکہ بابر کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست ہو جانے اور دوبارہ فتح حاصل کرنے کے بعد چھ ماہ سے زائد حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا اور ذوق نجوم شناسی کی تکمیل میں مبتلا رہا۔ ہمایوں کا دور حکومت ۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء رہا۔ البتہ اکبر اعظم کو جس کا دور حکومت ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء رہا۔ سلطنت کی توسیع و استقامت میں کافی موقع ملا۔ اس لیے اس نے بھی اپنے دادا کی طرح رزم، بزم دونوں میدانوں میں فتوحات کا جھنڈا لہرا دیا۔ شہنشاہ بابر کا وصیت نامہ یہ ہے۔

”اے جان پدر! سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ خدا نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی ہے اس لیے تمہیں لازم ہے کہ تمام مذہبی تعصبات سے دل کو دھو ڈالو۔ عدل و انصاف میں ہر مذہب و ملت کے طور طریقوں کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر ہندوستانیوں کے دلوں کو نہیں جیت سکتے اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ الطاف شاہانہ کی مرہون منت ہے۔ جو قوم و ملت حکومت کی فرمانبردار اس کے مندر و مسجد برباد نہ کیے جائیں۔ عدل و انصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے ظلم و ستم کی بجائے لطف و کرم کی تلوار سے اسلام نے ترقی پائی ہے بشیعہ و سنٹی جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا۔ جس طرح انسان کے جسم میں

چار عناصر مل جل کر کام کر رہے ہیں اُسی طرح مختلف رعایا کو ملا جلا رکھو۔ اور اتحادِ عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ رہے۔ سرگزشت امیر تیمور کو جو اتحاد و اتفاق کا مالک تھا۔ ہر وقت پیش نظر رکھو۔ تاکہ نظم و نسق کے معاملہ میں پورا پورا تجربہ ہو (علماء حق ص ۱۳) بابر دہلیوں کی فتح و شکست کے مرحلوں سے گزرنے کے بنا پر اپنی پالیسی کے نافذ کرنے کا پورا پورا موقع نہ مل سکا لیکن جب جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء) تخت نشین ہوا تو اُس نے اپنے طویل دورِ حکومت میں اپنے دادا کی وصیت کو عملی جامہ پہنایا۔ اس نے ایک طرف اسلامی خلافت کی سرپرستی سے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ اور دوسری طرف صفوی خاندان کی ہمایوں کی امداد سے جو ایرانی بالادستی قائم ہو گئی تھی اس تعلق کو بھی ختم کر دیا۔ اور ہندوستانی حکومت کا مستقل خود مختاری کا جھنڈا لہرا دیا۔ بیرم خاں کا قتل اسی پالیسی کا شاخص ہے، جس طرح ایشیا کو چک و یورپ میں ترکوں نے سلطنت عثمانیہ کو ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اسی طرح اکبر اعظم نے ہندوستان کو ایشیا کی عظیم طاقت بنا دیا۔ اور متحدہ ہند کا جو خواب علاؤ الدین خلجی نے دو سو سال پہلے دیکھا تھا اس کی تعبیر حاصل کر لی۔ اکبر نے ہندوستان کو ایک مستقل و خود مختار وحدت (یونٹ) کی حیثیت دے کر اس پالیسی کی ہندوستانییت یا آج کل کی زبان میں لائبرٹی پر رکھی جب الوطنی ایک انسانی قدر ہے اکبر کے خوشامدی مشیروں نے اس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس کے ہاتھوں ایسے دین کی بنیاد رکھ دی جس کا مرکز خود اکبر کی ذات تھی۔ اس لیے اللہ اکبر اس دین کا خصوصی شعار ہوا۔ جو اس کی انانیت کو تسکین بخش سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان جو ہمیشہ مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے اکبر کا دین الہی اُن کے سچے پرستاروں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی جو زبان و خطابت اور چالاکی و ہوشیاری کے پتلے تھے انہوں نے بادشاہ کو یہ یاد کرایا کہ اسلام ہزار سال کو پہونچ کر نعوذ باللہ اپنا مقصد معدوم کر چکا ہے۔ اب ہزار سال بعد صاحبِ قراں (خود اکبر) کا دور ہے اس لیے سارے مذاہب کا خلاصہ دین الہی

کو بنایا۔ جس کے اندر نہ اسلام کی کوئی حیثیت ہی رہ جاتی تھی اور نہ ہندو دھرم ہی باقی رہتا تھا۔ اس لیے اٹھارہ آدمیوں کے سوا کسی نے حامی نہیں بھری۔ نہ کسی مسلمان نے اس کو قبول کیا اور نہ کسی سچے ہندو نے اس کو مانا۔ وہ تو عنایت ہوا یہ ہوا کہ اکبر نے اپنی نرم طبعی اور حکومتی سیاست کی وجہ سے زیادہ سختی اختیار نہیں کی ورنہ اسی وقت ملک کا شیرازہ بکھر جاتا ہمارا ملک روز اول سے مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف قوموں کا ہمیشہ سے رنگارنگ گلدستہ رہا ہے لیکن اس کثرت میں روح وحدت بھی ہمیشہ جلوہ گزر رہی ہے۔ اس زبردست حقیقت کو ہمارے مورخوں نے پہلے دن سے ہی محسوس کر لیا ہے چنانچہ تیسری صدی کے مشہور جغرافیہ نگار مورخ مسعودی لکھتا ہے: ”ہندوستان ایک وسیع و عریض رقبہ ہے اس کے اندر بڑے بڑے میدان، دریا اور پہاڑ ہیں۔ وہ ایک طرف خراسان (افغانستان) سے ملا ہوا ہے تو دوسری طرف نبت و چین کے ملکوں کے درمیان پہاڑوں کی حد فاصل ہے ان ملکوں کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں جدا جدا اور افکار و عقائد الگ الگ ہیں۔“

علامہ ضنی لکھتا ہے ”اہل ہند بلند افکار و خیالات اور بہترین احکام کے مالک رہتے ہیں حساب و ہندسہ طب و نجوم اور دوسرے طبعی و الہی علوم میں انھوں نے تحقیقات کیں ہندوستان کے کواکب کی تنظیم اور ان کی گردشوں کے بارے میں ان کے مخصوص خیالات ہیں۔“

یہ پرانے مورخین کے خیالات تھے۔ انیسویں صدی کے مورخ شیخ قاسم اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ ”ہندوستان ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں کا تخیل، زبان، دین اور اپنی عادات کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں“ حقیقتاً ہمارا ہندوستان سدا بہار گلستان ہے۔ جو رنگارنگ پھولوں اور پھلوں کی وجہ سے اپنی بہار ایک عالم کو دکھاتا رہا ہے اس گلستان کے ایک قطعہ میں گل و لالہ کے نقشے میں جو دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں تو دوسرے قطعہ میں سرسبز و سنسن

کے نقشے ہیں جو بے حد دلفریب و نظرا فروز ہیں۔ ایک طرف موتیاد بیلا اپنی خوشبو سے شام جہاں کو معطر کر رہے تو دوسری طرف چمپا اپنی شمیم انگریزوں سے روح کو مست بنا رہا ہے، رنگ و بو سے معمور اس چمن کی رنگینی و بہار آفرینی ہی اس کی رنگارنگی میں مضمر ہے۔ اگر اس رنگارنگ گلشن میں سے گل و لالہ، جمبیلی و جوی رنگ کے تختوں کو اکھاڑ کر صرف ایک ہی رنگ کے تختے رہنے دئے جائیں تو چمنستان ہند اپنی بہار کھو بیٹھے گا۔

ہے رنگِ لالہ گل و نسربن جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
 بہر حال اکبر کی دانشمندی یہ رہی کہ اس نے اس مذہب کو حکومت کی طاقت سے
 جاری نہیں کیا۔ اس کی رعایا پروری، انصاف پسندی، اور عظیم الشان فتوحات
 نے متحدہ ہند کے خواب کو واقعیت کی صورت دے دی۔

مسلم دور حکومت میں دینی تحریکات

اس سے پہلے کے مغل شہنشاہیت کے عہد زریں میں جو دینی تحریکات کشور ہند میں برپا ہوئیں ان کی تفصیلات پیش کی جاتیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے آثار چڑھاؤ اور ان اسباب و محرکات پر تمہیدی روشنی ڈالی جائے تاکہ جن حالات میں یہ تحریکات پیدا ہوئیں اور جس ماحول میں آگے بڑھیں وہ واقعات ناظرین کی نگاہوں کے سامنے آجائیں۔

اقوام عالم کا تاریخی مدوجزر

حیات انسانی کی طرح تاریخ انسانی بھی سمندر کی طرح ہے جس کی ظاہری سطح خوشنماؤ ہموار دل چسپ دل فریب نظر آتی ہے لیکن اس سطح کے نیچے متلاطم موجیں اور طوفانی لہریں پوشیدہ رہتی ہیں بقول عربی ص ۷

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

چنانچہ جب کبھی سمندر کے نیچے کی سطح سے تلاطم انگیز موجیں اٹھتی اور طوفان خیز لہریں بکھرتی ہیں تو ہر طرف اُٹھل پٹھل پیدا ہو جاتی ہے کبھی سمندر کا ایک کنارہ موجوں کی تلاطم سے بلند ہو جاتا اور کبھی وہی کنارہ پست ہو جاتا ہے دنیا میں قوموں کی ترقی و تنزل کا یہی حال ہے کبھی ایک قوم ترقیوں کی چوٹیوں کو چھونے لگتی ہے اور پھر وہی قوم

تنزل کی پستیوں میں اتر جاتی ہے یہ کش مکش انقلاب کا دائمی عمل ہے اور پوری تاریخ عالم قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا دوسرا نام ہے جیسا کہ لکھا جا چکا کہ تاریخ عالم کے ابتدائی دور میں ایشیا علم و ہنر کی مشرق تہذیب و تمدن کا مطلع و منبع تھا ضرورتاً زندگی کی ہر ایجاد صنعت بشری کا ہر کارنامہ اسی سرزمین سے طلوع ہوا چونکہ یہی خطہ انسانی آبادی کا پہلا مسکن یا پہلا ٹھکانا تھا لیکن جب دو آب و جلد و فرات سے انسانی قافلوں نے مختلف علاقوں کا رخ کیا تو ہر علاقے کے مقامی ماحول اور موسمی احوال کی بناء پر ضروریات زندگی کی گونا گونی اور ایجادات کی بوقلمونی نے رنگارنگی پیدا کر دی اور ہر خطہ میں انسانی آبادی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے نت نئے سر و سامان اور ہتھیار ایجاد کرنے لگی پہلے ماحول سے مقابلہ پیراتی فطرت سے معرکہ آرائی ہوتی رہی لیکن تھوڑی ہی مدت بعد خود انسانوں میں پیکار باہمی ایک دوسرے سے لڑائی کا میدان گرم ہو گیا ہر طاقت ور کمزور کو پیچھے ڈھکیلے اور ہر کمزور و گڈھ بندی کر کے اپنی طاقت بڑھانے لگا پہلے علاقوں اور خطوں میں مقابلہ آرائی کا معاملہ تھا آگے چل کر ملکوں ملکوں میں جنگ و جدال قتل و قتال کی گرم بازاری شروع ہو گئی غالباً ابتداءً زر اور زن کے لیے لڑائی تھی جیسا کہ قصہ ہابیل و قابیل سے آشکارا ہوتا ہے لیکن آگے بڑھ کر زمین کے جھگڑوں نے اپنے پاؤں پھیلا دیئے وہ مادر گیتی (زمین) جو آدم کے بیٹوں کو اپنے آغوش و عاطفت میں لیے بیٹھی تھی ان بیٹوں نے اس کی پشت کو معرکہ کارزار یا جنگ و جدل کا اکھاڑا بنا دیا۔ آسمانی فرشتوں نے اس زمینی مخلوق کے جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا وہ امر واقعہ بن گیا۔

مشرق و مغرب یا یورپ و ایشیا کی جس باہمی آویزش اور معرکہ آرائیوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے وہ اسی حقیقت کی غمگین داستان ہے یہ داستان صرف مشرق و مغرب ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں دہرائی گئی ہے ان طویل جنگوں کا برہانہ اقتدار پرستی اغراض پرستی اور خود پرستی کے ہاتھوں عمل میں آیا چوں کہ اس نیک و بد کی دنیا میں نیک نفس انسانوں کے ساتھ شریر و بد فطرت لوگوں کی کمی

نہیں رہی جو اخلاق کریمانہ سے متاثر ہونے کے بجائے طاقت ہی آگے جھٹکتے اور تلوار ہی کی زبان کو مانتے ہیں ان شر پسند عناصر اور فتنہ پرور افراد کی سرکوبی کے لیے تلوار کو نیام سے کبھی کبھی باہر لانا پڑتا ہے تاکہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے اور خدا کی زمین میں خدا کا نام بلند ہو مادی اغراض سے جو جنگ پاک ہو اس کو اسلام نے مقدس جہاد سے موسوم کیا ہے اس کے تقدس کو قائم رکھنا اور پست اغراض سے پاک رکھنا یہ اہل مذاہب کا کام ہے ورنہ یہ جہاد ایک فتنہ فساد بن جائے گا بہر حال اس عالم خیر و شر میں جہاں فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ وہیں شیطان صفت مخلوق بھی ہے اس لیے شیطانی لشکر رحمانی لشکر روز ازل سے دونوں ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں اسلام نے چھٹی صدی سنہ ۶۰۰ء میں جب پردہ عالم پر قدم رکھا تو اس وقت دنیا کی ساری ہی قوسیں طاقت و قوت کو معیار صداقت مانتی تھیں اسلام نے روز اول سے اس کا اعلان کیا کہ ”حق“ طاقت ہے ”طاقت“ حق نہیں ہے کلمہ توحید میں اسی حقیقت کا اقرار ہے اس اعلان حق سے باطل کے ایوان میں زلزلہ آگیا اور تہملکہ برپا ہو گیا سب سے پہلے تو خود اہل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم وطن و ہم قوم اہل مکہ آپ کے خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے پیغمبر صلعم نے تشدد کا جواب عدم تشدد سے دیا نیزہ ۱۱ سالہ مکی زندگی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یسوع مسیح کی طرح عدم تشدد کے راستہ پر چلتے رہے لیکن مکہ والے تلوار اور تشدد کے زور پر اسلام کو آگے بڑھنے سے روکتے رہے تب پیغمبر نے راہ ہجرت میں قدم رکھا لیکن پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے صحابہ کرام کو بے بال و پر بے مال و زر بے یار و مددگار اور بے وطن کر دینے پر بھی یہ طاقت کے پجاری مکہ والے چین سے نہ بیٹھے اور مدینہ پر مسلسل یلغاریں کیں اس وقت قرآن نے مسلمانوں کی مظلومیت کی بنا پر جہاد و دفاع کی اجازت دی حکمت قرآنی نے جملہ مذہب کی آزادی اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے مقابلہ کرنے کا حکم دیا ترجمہ قرآنی اگر لوگوں میں ایک دوسرے سے مدافعت و مقابلہ نہ کیا جاتا تو یہود و نصاریٰ کی

عبادت گاہیں توڑ دی جاتیں وہ مسجدیں جس میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے توڑ پھوڑ کر
 ویران کر دی جاتیں (سورۃ الحج) عربوں سے نمٹنے کے بعد جب اسلام عجم میں پہونچا
 تو ایران و روم کی مہذب و تمدن حکومتوں نے بھی اسلام کو زور و طاقت سے دبانا اور
 تشدد سے ملیا میٹ کرنا چاہا جس کے لیے اسلام کو جو اپنی کاروائی کرنا پڑی لیکن
 متعصب و بد باطن مصنف آج تک یہی اعلان کرتے چلے آئے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر
 پھیلا بہر حال حق و باطل یا مغرب و مشرق کی کشمکش زمانہ قدیم سے ہے جس کے
 اندر اسلام سرخرو ہو کر نکلا چنانچہ پانچویں صدی تیسرے سے لے کر پندرھویں صدی
 تیسرے تک اسلامی تہذیب و تمدن کی معنوی پائیدار اقدار اور ظاہری نقش و نگار
 کی چمک دمک نے سب قوموں کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا اگرچہ درمیان میں تاتاری
 فتنوں یا ہلاکو چنگیزی حملوں نے عالم اسلام کو زیر و زبر کر دیا لیکن اسلامی تہذیب نے
 عروس البلاد بغداد کے بعد قاہرہ (مصر) بلخ و بخارا اور پھر لاہور و دہلی کو اپنا مرکز
 بنا لیا۔

ہندوستان ایک اسلامی مرکز

جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا کہ جب قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش دہلی
 کے تخت پر بیٹھے تو انھوں نے خود مختاری کا علم بلند کیا اور دہلی (یعنی ہندوستان)
 اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

اس دور کا آغاز چونکہ سرخیل صوفیہ حضرت خواجہ
ترک افغانی دور معین الدین چشتی کی دعوت روحانی سے ہوا تھا

خاندان غلامان کے بادشاہ اور بعد کے حکمران شہنشاہ اور مسلمان عوام صوفیانے
 کرام کے حلقہ اثر میں تھے اس لیے کوئی خاص اصلاحی تحریک نہیں پیدا ہوئی۔ اور
 روحانیت کے نورانی اثرات کی وجہ سے ملک کے تمام باشندے باہم شہر و شکر ہو کر
 رہتے رہے اگرچہ اس دور میں بھی اقتدار پرستی کی رسہ کشی برابر جاری رہی اور

حکومت و سلطنت کی ہوس نے باپ بیٹے چچا بھتیجے اور آقا و غلام کے درمیان مقابلہ آرائی یا ایک دوسرے سے ٹکراؤ کی صورتیں پیدا کیں۔

لیکن عام معاشرے کے نشوونما اور ارتقاء نے صوفیاء کی تعلیمات کی بدولت ہمواری استواری رہی بادشاہوں کی تبدیلیوں سے مسلم معاشرے میں کوئی ایسی زبردست تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ جس سے سماج میں عمومی بگاڑ پیدا ہوتا اسکی خاص وجہ یہی تھی کہ ان مادی بادشاہوں کے پہلو بہ پہلو روحانی بادشاہوں کا سکہ چلتا رہا سلطان التمش، ناصر الدین محمود، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی اور غیاث الدین بلبن کی حکومت کے ساتھ حضرت قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین شکر گنج، خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت علاء الدین علی احمد صابر جیسے نفوس قدسیہ کے روحانی اثرات عوام و خواص پر جلوہ فرما رہے۔

مشائخ چشت کی فتوحات

چوں کہ مشائخ چشت کی روحانی سلطنت عوام کے دلوں پر قائم تھی اور وہی ملک کے اصل فاتح تھے اس لیے کیا ہندو کیا مسلمان ان چشتی صوفیوں اور روحانی بزرگوں سے ان کی حق شناسی انسانیت دوستی کی بنا پر ہر ایک ان سے سچی محبت و انسیت رکھتا تھا ان چشتی مشائخ نے شروع ہی سے اپنے آپ کو عوام سے جوڑے رکھا اور حکومت کے دامن سے خود کو وابستہ نہ کیا بلکہ بسا اوقات مادی بادشاہت و روحانیت نے باہمی مل جیسا کہ حضرت محبوب الہی اور خلجی بادشاہوں کے درمیان) یہ کش مکش رہی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اپنے دور کے سکندر علاء الدین خلجی کی دلی خواہش کے مطابق اس کا دائرہ اقتدار ثبت و چین تک نہ پہنچ سکا مگر سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین کی خانقاہ خائفود چین) میں بھی قائم ہو گئی بہر حال عوام کی اکثریت ان بزرگوں کی درویشانہ عملی زندگی سے جو پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام کی زندگیوں کا نمونہ تھیں) اثر پذیر ہوئی اور ان کے نقوش قدم

سے روشنی حاصل کرتی تھی اس لیے اس دور میں کھلے بتدول فسق و فجور و بے جہانی کا، عمومی طور پر عام معاشرے میں عمل دخل نہ تھا لیکن جب تیموری ۱۳۹۸ء حملے نے مرکزی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا تو دارالسلطنت دہلی بھی ان بااثر روحانی بزرگوں سے خالی ہو گئی اور یہ مشائخ بھی مرکز کے ٹوٹ جانے کی بناء پر جو آسمانِ روحانیت کے چاند ستارے تھے مختلف علاقوں میں پھیل کر اپنی عرفانی روشنیوں کو ان خطوں میں بکھیرنے لگے قریب تھا کہ متحدہ ہند کا وہ خواب وہ پچھلے مسلمان بادشاہوں نے دیکھا تھا ادھورا رہ جائے اور ہندوستان کی تاریخ ماضی کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر جائے کہ مغل برسرِ اقتدار آگئے ان سے پہلے شیر شاہ سوری نے حکومت کی بنیادوں پر پورے ملک کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی مغلوں کو برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کا ان روحانی بزرگوں سے وہ رشتہ عقیدت و عظمت باقی نہ رہا جو ترک افغان بادشاہوں کا ان کے ساتھ تھا۔

مغلوں کا دورِ حکومت

ظہیر الدین بابر جو مغل شہنشاہیت کا بانی ہے اور اس کا جانشین نصیر الدین ہمایوں یہ دونوں روحانیت سے زیادہ فنون لطیفہ کے عاشق و شیدا تھے ان کو حکومت چلانے کے لیے علماء و فقہاء کی ضرورت پڑی اور ان کے دور میں خشک جامد فقہاء کا زور تو ضرور بڑھا لیکن بزرگوں سے روحانی تعلق کمزور ہو گیا۔ بد قسمتی سے جب شہنشاہ اکبر تخت سلطنت پر بیٹھا تو حکومت میں ان ہی علماء کا زیادہ ہاتھ رہا۔ جو حُبِ جاہ و محبِ مال کے جال میں گرفتار تھے اس لیے علمائے حق کے مقابلہ میں جو دربار داری سے نفور تھے، علمائے سوہ کاپلہ بھاری ہو گیا اسلئے وہی اکبر بادشاہ جو اپنے بچپن میں مسجد کی جا رو بکشی کو باعثِ سعادت سمجھتا تھا تختِ اقتدار پر فاتر ہونے کے کچھ عرصہ بعد ان جاہ پرست علماء کی مجادلہ آرائی کو دیکھ کر اسلام سے بدگمان ہوتا چلا گیا اس کریلے پر نیم چڑھایا ہوا کہ ابوالفضل و فیضی جیسے ہوشیار و

وچالاک جو ذہانت کے پتلے اور عقل و دانش کے پیکر اور ان علمائے سوہرہ کے تیغ ستم کے زخم خوردہ تھے انھوں نے اکبر جیسے احی و ناخواندہ بادشاہ کو اپنی ہوشمندی سے بوتل میں اتار لیا سب سے پہلے تو ان ہی علمائے وقت سے بادشاہ کے لیے منصب امامت و اجتہاد کے مختصر ناجے پر دستخط کرا کے آزاد خیالی و بے راہ روی کے لیے ہتھیار مہیا کر دئے اور پھر دین الہی کے پردے میں ان جاہ پرست مولویوں سے ابوالفضل فیضی نے ایسا زبردست انتقام لیا کہ ان علمائے ظاہر کی ظاہری عظمت خاک میں مل گئی۔

اکبر نے اپنی ملکی پالیسی میں ہندوستانیت کو ترجیح دے کر راجپوتوں کو آگے بڑھایا اور شاہی محل ان ہمارا نیوں کے عقائد و خیالات کا رنگ محل بن گیا چونکہ الناس علیٰ دین ملو کہ ہم کے ماتحت عوام بادشاہوں کے طور طریق کے پیرو اور برسر اقتدار لوگوں کی رسم و ریت کے اندھے مقلد ہوتے ہیں اس لیے ایک طرف بادشاہ کی تقلید میں مسلم معاشرے کے اندر فکر و خیال کی آوارگی اور عمل کی بے قیدی و بے راہ روی عام طور سے پھیلنے لگی اور دوسری طرف جھوٹے پیروں اور نقلی اور جعلی درویشوں نے وحدت الوجود کے نازک مسئلہ کی آڑ میں وہ کھیل کھیلے خود مذہب چوں چوں کا مربہ اور عوام کی نفسیاتی خواہشات کا کھلونا بن کے رہ گیا۔ دین الہی کے پردے میں ابا حیت پسندوں اور نفانی خواہشات کے پجاریوں نے عوام میں یہ شوشہ چھوڑا کہ اسلام اپنی ہزار سالہ دعوت کو پورا کر چکا اب اکبری دور ہے جب تک تقلیدی دین کے دائرے سے باہر نکل کر عقلی و تحقیقی دین کو نہ اختیار کیا جائے راز حقیقت نہیں کھلتا، ان خوشنما الفاظ کے پردے میں عوام کو درغلانے بہکانے کا پورا پورا سامان چھپا ہوا ہے اس پر فریب و پیر بکر شیطانی خیالات کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس پھیلی ہوئی گمراہی سے عوام کو نکلانے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی پہلی دعوت تجدید برپا ہوئی جب کہ حکومتی سطح پر دین الہی کے فتنے نے اصل دین کو باطل عقائد و

افکار کے خلط ملط اور وسیع المشربہ دروادی کے پردے نے دین کے اصل جوہر (توحید) کو ملحدانہ خیالات سے گڈ مڈ کرنا چاہا، دوسری دعوت دینی کا تعلق حکومت مغلیہ کے دور زوال سے تھا جب کہ مرکزی حکومت کی کمزوری نے طوائف الملوکی پیدا کر کے منہ زور طاقتوں کو بے لگام کر کے ہندوستانی معاشرے کو خطرے کے کنارے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

قدرت کا تجدیدی نظام

قدرت کا یہ تجدیدی و انقلابی نظام سارے عالم میں کار فرما ہے چمنستانِ عالم میں جب باد خزاں کے تھپیڑے ہر نخل و شجر کا رنگارنگ لباس اتار کر ان کو عریاں اور ننگا کر دیتے ہیں پت جھڑکی تیز ہوا تیں چمن کے گوشہ گوشہ میں خاک دھول اڑاتی ہیں تو فطرت نئی انگڑائی لے کر موسم بہار کا پیغام دیتی اور گلستاں کے ہر شاخ شجر کو عروسی لباس پہناتی اور گلشن کی ہر کھار سی کو رنگین پھولوں کے گہنے سے آراستہ کر دیتی ہے اس لیے کارخانہ قدرت میں جہاں خزاں ہے وہیں بہار، جہاں انحطاط و زوال ہے وہیں عروج و کمال ہے چنانچہ قوموں کی زندگی میں انحطاط و زوال کے پہلو میں سے عروج و اقبال کو برآمد کرنا اسی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے دین فطرت کے بہتے ہوئے دریا میں جوازل سے ابد تک رواں دواں ہے جب ماحول کی آلودگیاں اور مقامی غیر شرعی رسمیں شریعت کے چشمہ صافی کو گدلا کر دیتی ہیں تو قدرت ایسے مجدد مصلح و رہنما شخصیتوں کو پردہ عالم پر ظاہر کرتا ہے جو دین و شرع کو ہر طرح کی مقامی و بیرونی گندگیوں سے صاف کر دیتے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیتے ہیں ہر ایک صدی پچھلے صدی سے مختلف حالات لے کر صفحہ گیتی پر نمودار ہوتی اور وقت کے نئے تقاضے لے کر آتی ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک قدر آور شخصیتوں کو قدرت پیدا کرتی ہے جو اپنے بہار آفریں انفاس سے مرچھائے ہوئے چمن میں نئی شگفتگی و تازگی و خزاں

رسیدہ گلشن کو حیات انگیز ہواؤں کے جھونکوں سے نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔

حضرت مجدد کی اصلاحی دعوت

اسلام کے ہزار سال گزر جانے پر حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی دعوت تجدید کو اصلاحی رنگ میں ظاہر فرمایا جس کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایک مکتوب گرامی میں اس طرح ادا فرمایا ہے ”اسلام پر ایک ہزار برس گزرنے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اس دور میں بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مثلاً قلب و روح اور ان کے سر کے احوال اجمالی صورت میں ظاہر ہوتے اور بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مفصل طور پر رونما ہوتے مثلاً اس دور میں تجرّجت اور انانیت کبریٰ کے مسائل پہلے دوروں کے مقابل بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اس دور کے ارہاس شیخ مجدد دہیں اس دور کے بہت سے مخصوص معارف کو حضرت شیخ نے درمزلہ کار کی زبان میں ادا کیا وہ اس دور کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے بہت سی گمراہیاں کا فوراً اور بہت سی بدعتیں دور ہوئیں فقیر شیخ مجدد کے بہت سے معارف کا جو موصوف نے اس دور کے فاتح کی حیثیت سے فرما چکے ہیں مصدر بننا (مکتوب بحوالہ تحریک ملّا)

حضرت مجدد کا تجدیدی کارنامہ

حضرت مجدد قدس سرہ نے ایک طرف اسلام (توحید) کی سچی دعوت کو بیعت ارشاد کے ذریعہ عام کیا اور جو کچھ غلط عقائد و خیالات، باطل رسوم و روایات ہندوستان کے ماحولی اثرات سے مسلم معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے ان سب کو کاٹ چھانٹ کر دین کی اصل حقیقت کو نکھارا ان کے دور میں متصوفین نے وحدت الوجود کی غلط تعبیر سے عوام کو گمراہی میں مبتلا کر رکھا تھا اس کو وحدت الشہود کے روشن صاف شفاف نظریے سے واضح فرمایا وحدت الوجود کا خلاصہ ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) اور وحدت الشہود کا نظریہ ہمہ از اوست (سب کچھ خدا کی طرف سے ہے) اور دوسری طرف

مجدد صاحب نے اپنے مریدوں اہل علم اور ارباب حکومت کے مخصوص لوگوں کو مکتوبات شریفہ سے اصلاح کا نیا باب کھولا حکومت مغلیہ کے ارباب حل و عقد جو بڑے بڑے ہمدوں پر فائز تھے ان کو اپنے مکاتیب کے ذریعہ مخاطب بنایا جو حضرت کے مرید و معتقد تھے وہ آپ کے ارشاد و ہدایت سے اثر لیتے حکومت کے ذمہ داروں کے اندر اصلاحی لہر کے دلوں میں اثر جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ نظام حکومت میں درستگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور کچھ مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ نظام سلطنت کی کایا پلٹ ہو گئی کیونکہ جو دستور جو قوانین و احکام بالا ہی بالا صادر کئے جاتے اور ان کی پشت پر حکومت کی قوتِ عاملہ نہ ہو وہ کاغذی بن کے رہ جاتے ہیں اس لیے ہر سچے مذہب یا حقیقی دین میں ہر اصلاح کا سرچشمہ اندروں یا باطن سے شروع ہوتا ہے، مجدد صاحب کی اس اصلاح باطنی نے اسلامی معاشرے کو صحیح راہ پر لگا دیا حضرت مجدد صاحب کے یہ مکتوبات گرامی جہاں ان کی مخلوق خدا کے ساتھ سچی دل سوزی اور انسانی ہمدردی کے جذبات کی آئینہ دار ہیں وہیں اپنے جاندار اور تازہ و شگفتہ اسلوب اور دل آویز طرز ادا کے اعتبار سے انشاء پرداز کی اعلیٰ نمونے ہیں۔ جو ایک درد مند دل سے نکلے ہیں اور خلوص و محبت کی چنگاریاں ان کے بین السطور میں چمکتی نظر آتی ہیں۔

حضرت مجدد کی آزمائش

حضرت مجدد صاحب کی یہ اصلاحی خدمات جو ہند و سندھ سے آگے بڑھ کر بلخ و بخارا تک پہنچ گئیں اور سلسلہ مجددیہ بیرونی ملکوں تک پھیل گیا اس خدا داد مقبولیت نے کچھ خوشامدی درباریوں کے دلوں میں حسد کی آگ کو بھڑکا دیا اور انھوں نے حضرت کے خلاف بادشاہ کے کان بھر دیئے جس کی بنا پر شہنشاہ جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب فرمایا اور دربار کے رسوم و کورنش بجانہ لانے پر خفا ہو کر اس مرد حقانی کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا لیکن قلعہ گوالیار میں حضرت کے فیض صحبت سے اخلاقی مجرموں اور عام قیدیوں میں جو روحانی انقلاب برپا ہوا جہانگیر اس کو سن کر آپ کی ولایت کا

قاتل ہو گیا جس کے جانشین شاہ جہاں اور عالمگیر جیسے ولی صفت اور مستقی اور پرہیزگار بادشاہ ہوئے بہر حال مسلم معاشرے میں جو داخلی فتنہ گھس آیا تھا آپ کی دعوت نجدید سے اس کا قلع قمع ہو گیا اور مسلم سوسائٹی کی جو گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی اس نجدیدی کارنامے نے اس کو لاتن سے لگا دیا حضرت مجدد خدا کی طرف سے اس دعوت نجدید کے لیے نامزد کئے گئے تھے جیسا کہ ایک مکتوب میں اس کی طرف اشارہ ہے درمچھے ایک عظیم کارخانہ سپرد کیا گیا ہے صرف پیری مریدی کے لیے مقرر نہیں کیا گیا میری تخلیق کا مقصد محض تکمیل و ارشاد نہیں بلکہ اور معاملہ مقصود اور دوسرا کارخانہ مطلوب ہے، (مکتوب نمبر ۶ دفتر دوم) اس مکتوب گرامی سے ہمارے موضوع پر بخوبی روشنی پڑتی ہے چونکہ حضرت مجدد صاحب کی دعوت حق نے اگرچہ فرنگی سامراج کا عمل دخل ہمارے ملک میں نہ ہو سکا تھا اسلئے کہ حضرت مجدد صاحب کی ولادت ۱۵۹۵ء ہے۔

جب کہ اکبر اعظم کا دور تھا اور حضرت کے نجدیدی کارنامے کا تعلق عہد جہانگیری سے ہے لیکن اس سے پہلے ۱۵۹۵ء میں پرتگیزی سفیر و اس کو ڈی گاما مشہور عرب کپتان دریائی شیرابن ماجد کی رہنمائی میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا اس وقت دہلی کے تخت پر لودھی خاندان کا آخری اور کمزور بادشاہ ابراہیم لودھی بیٹھا ہوا تھا و اسکوئی گاما کی آمد کا مقصد وہی سامراجی اغراض ہندوستانیوں کی قتل و غارت گری نسل کشی اور یہاں کی دولت کی لوٹ مار تھا جو ہسپانوی سامراج کے ہاتھوں امریکہ میں سرخ ہندوستانی ریڈ انڈین نسل کے خاتمہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ چوں کہ امریکہ کے اصل باشندے دور وحشت سے گزر رہے تھے اس لیے اس کی نسل کشی میں ہسپانوی سامراج کامیاب ہوا اور امریکہ پر یورپ بلا شرکت غیر قابض ہو گیا مگر جوں کہ ہندوستان ایک ترقی یافتہ مہذب ملک تھا اس لیے یہاں پر استحصال یا ناجبائز قبضے کے لیے فرنگی سامراج کو بہت زیادہ پاپڑ بیٹنے پڑے۔

فرنگی سامراج کا داخلہ ہند میں

سب سے پہلے پرتگالیوں نے بحر ہند اور بحر عرب کے سمندری امن کو غارت کیا ان سمندری قزاقوں نے سمندر میں لوٹ مار مچا دی جس کی بناء پر اکبر کے درباری علماء نے فریضہ حج کے ساقط ہونے کا اعلان کر دیا تھا اسے ماحول میں ایک سچے صوفی صافی پاک باطن درویش کی زبان قلم سے ایک جملہ نکلا جو فرنگیوں کی طرف سے نفرت کا آئینہ دار ہے مجدد صاحب لکھتے ہیں: "معرفتِ خدا عز و جل بر آنکس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند" (مکتوبات) خدا کی سچی معرفت ہر اس شخص پر حرام ہے جو اپنے آپ کو فرنگی کافر سے بہتر سمجھتا ہو گویا اس روشن ضمیر عارف کامل نے جس کا سبب خدا اور اس کی مخلوق کی محبت کا گنجینہ تھا فرنگی سامراج کی بد باطنی اور ظلم غارت گری کو اپنی مشام روحانیت سے سونگھ لیا جب کہ تاریخ کا مغل اعظم اکبر ان لٹیروں کی چالاکی و مکاری سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب کی سچائی سننے کے لیے دربار میں ان کو اپنے برابر بیٹھا رہا تھا افسوس کہ اس اکبر اعظم کی دور اندیشی نے نہ بحر ہند کی حفاظت کے لیے سمندری بیڑے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ان فرنگیوں کے مستقبل کے خطرناک عزائم ہی کو بھانپ سکا لیکن ایک عارف باللہ نے آنے والی تباہی کو اپنے دیدہ بواطن سے دیکھ لیا حضرت کے اس فقرے نے اس نفرت کی ترجمانی کر دی جس کی پرچھائیں اُن کے آئینہ قلب پر پر رہی تھی فرنگی سامراج سے نفرت کا یہی وہ نتیجہ ہے جو مجدد صاحب کے جانشین علمائے حق کی دلوں کی سرزمین میں اُگا اور اس نے تن اور درخت بن کر فرنگیوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرایا بقول مولانا محمد میاں "دیہی وہ نفرت ہے جو علماء کی میراث میں آئی" (تحریک شیخ الہند) حضرت مجدد کے عہد میں یہ داخلی فتنہ ایک محدود معاشرے (مسلم) میں در آیا تھا جو آپ کی اصلاحی تحریک سے دب گیا لیکن شاہ ولی اللہ تک پہنچتے پہنچتے اس داخلی فتنہ سے زیادہ خارجی فتنہ نے سر نکالا جو پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا اس لیے ولی اللہی دعوت انقلاب کی گھن گرج کے ساتھ بروئے کار آئی جس نے زبردست

وسعت اور پھیلاؤ اختیار کیا اور جس کا تسلسل آج تک نہ ٹوٹا آج بھی پورے ملک بلکہ پوری انسانیت کو اس دعوت کی ضرورت ہے جیسے کہ اس وقت بھی بہر حال حضرت مجدد صاحب نے جس اصلاحی دعوت کو جاری فرمایا تھا دعوت ولی اللہی نے اس کو انقلابی تحریک کا روپ دیا۔

دعوت ولی اللہی کا ظہور

حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی انقلابی تحریک کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے پس منظر کو روشنی میں لایا جائے اس بین الاقوامی اور عالمی تحریک کا تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی تحریک جو ہمارے ملک کے دل (دلی) سے اٹھی اور شمال سے جنوب تک بلکہ بیرون ہند تک جس کی لہریں پھیلیں اور اس کے لیے ملک اور ملت کے جاں نثاروں نے عظیم سے عظیم قربانیاں دیں فرنگی سامراج کے خلاف علم جہاد بلند کر کے اسلام کے جاں نثاروں نے اپنے پاکیزہ خون سے سرزمین ہند کو لالہ زار بنایا جو اگر اپنوں کی غداری اور فرنگی سامراج کی مکاری و عیاری سے دوچار نہ ہوتی تو ایشیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا سامراجی مورخوں نے اپنے سامراجی اغراض غاصدہ کے ماتحت اس ولی اللہی دعوت کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا اور ان مجاہدوں کو مذہبی دیوانوں کا خطاب دیکر زبان لعن طعن دراز کیا ان سے تو شکوہ فضول ہے لیکن ہمارے قومی و ہندوستانی مورخوں سے بجا شکایت ہے کہ انھوں نے اس اہم عظیم تحریک صفحات تاریخ میں جگہ نہ دی۔

(۲) ولی اللہی دعوت کا تفصیلی تعارف اس موقع پر پیش کرنا ہمارے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ ریاست بھوپال آغاز کار سے اس دعوت سے وابستہ رہی۔

شاہ صاحب کی دعوت کے ظہور کا زمانہ ٹھیک ٹھیک وہی زمانہ تھا کہ جب کہ ریاست ہندوستان کے وسطانی خطہ (سنٹرل انڈیا) میں ایک طاقت بن کر ابھر رہی تھی بانی ریاست سردار دوست محمد خاں اور ان کے جانشین نواب یار محمد خاں

جو فقیر دوست اور علماء نواز رئیس تھے اپنی ہم قوم پٹھانوں کے ساتھ عالموں کی ایک جماعت کی سرپرستی میں ریاست کے دائرے کو وسیع کر رہے تھے سردار صاحب نے ابتداءً بیرسیہ کی مستاجری کو حاصل کیا تھا جس کی منظوری برائے نام ہی سہی مرکز سے دی جاتی تھی اس لیے کہ سب کی نظر مرکز پر لگی رہتی تھی چنانچہ ولی اللہی تحریک کے پہلے امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو ہندوستان کے دارالحرب قرار دینے کی پاداش میں برطانوی سامراج کی ریشہ دوانی سے طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا گیا تو اس وقت چھوٹے خاں دیوان ریاست نے شاہ صاحب کو بھوپال تشریف لانے کی معہ بارہ ہزار جاگیر کے دعوت دی تھی اگرچہ شاہ صاحب کے قدم اس سرزمین میں نہ پڑ سکے لیکن ان کے مخصوص شاگردوں کے نقوش قدم سے یہ خط منور ہوا پھر کوئی ایسا دور نہ رہا کہ ریاست ولی اللہی دعوت کے علمبرداروں سے خالی رہی شاہ صاحب کی یہ دینی و تعلیمی و اصلاحی دعوت وسط ہند کے اس علاقے میں خوب پھولی پھلی اور پھیلی دوسرے علاقوں کی طرح یہاں غیر شرعی رسوم و روایات اور بدعات اور خرافات کو کسی دور میں فروغ حاصل نہ ہو سکا اس لیے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے آخری شاگرد قطب زمانہ حضرت شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی اپنے مریدوں سے فرماتے تھے کہ ”بھوپال کو اپنی دعائے خیر میں نہ بھولو“ بھوپال میں شاہ صاحب کے کن کن شاگردوں نے ریاست کو اپنی عملی و عملی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ان کا اجمالی تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک ولی اللہی دعوت کو تفصیلی انداز میں پیش کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مشرق و مغرب کی کش مکش یا مادیت و روحانیت کی معرکہ آرائی نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے جیسا کہ گذر چکا کہ یورپ کی اقوام پچھلی کئی صدیوں سے یونانی و رومی تہذیبوں کے دم توڑ دینے کے بعد ادبار و تنزل کی پستیوں میں گر کر وحشت و بربریت کی زندگی گزارتی رہی تھیں اور ایشیائی قومیں ترقی کے مدارج طے کرتی رہیں چھٹی صدی شہد سے پندرہویں سالہ تک اسلام اپنی ہمہ جہتی دعوت و نظام کے ساتھ ایشیاد افریقہ اور خود یورپ تک اپنی قیادت کا جھنڈا لہراتا رہا۔ لیکن

سولھویں صدی میں جب صفحہ ایام نے اپنا ورق الٹا تو قدرت کے قانون انقلاب
کُلَّ یَوْمٍ تَھْوِی شَأْنَ کے ماتحت مغرب نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا کیوں کہ خدا ہر دور
میں نئی آن بان اور نئی شان کے ساتھ اپنی قدرت کو نمودار فرماتا ہے اور وہ خدا جو
جہانوں کا پروردگار اور سارے جگ کا پالہنہا رہے ہر قوم کو ترقی کا موقع دیتا ہے غرض
یہ صدی مغرب کے عروج و اقبال اور مشرق کے انحطاط و زوال کو اپنے دامن میں نے کر
آئی جب کہ یورپ نے جھوٹی عیسائیت کا لبادہ اتار پھینکا اور علم و عمل کے میدان میں ایسی
اڑان بھری کہ وہی یورپ جو کئی صدیوں سے اندھیرلوں میں بھٹکتا ہوا گوشہ گمنامی میں
پڑا ہوا تھا ستر ہوئی اور اٹھارھویں صدی میں پہنچ کر عالمی قیادت کی سطح پر ابھرا آیا
اور اس نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی قوت و عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے دنیا کی پچھلی
ترقی یافتہ قوموں نے مغرب کے سائبسی و ترقیاتی کارناموں کے آگے گردن جھکا دی
مغرب کی یہ ساری ترقی عیسائیت سے پیچھا چھڑانے سے عمل میں آئی اس لیے روحانیت
کے برخلاف مادیت (مٹیریزم *Materizism*) کا نظریہ بروئے کار لایا گیا جسکی
بنیاد خدائی ہستی کے انکار پر رکھی گئی اس آسمانی رابطہ کے توڑ دینے سے انسانی زندگی
میں خلا پیدا ہوا اس خلا کو زمینی قومیت، وطنیت کے رشتہ سے پر کیا گیا جس کی
پرانی جڑیں یونان کی قدیمی جمہوریوں (دیمکریسیز) و اسپارٹا میں ملتی تھیں، میں موجود
تھیں کچھ عرصہ میں مغرب میں وطنیت و قومیت نے روحانیت کے خانہ کو پر کر دیا قومیت
وطنیت کا یہ پودا یورپ کی سرزمین میں اودگا اس پودے کو آب و ہوا اور پوری غذا
مادیت کے فلسفہ سے ملی جو روحانیت کے خلا کی وجہ سے بہت جلد پنپ کر اپنے مضبوط تنے
پر کھڑا ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں برگ و بار لے آیا سب سے پہلے اس کی تلخ اور کڑوے
پھل مغربی قوموں کو باہمی قومی جنگوں کی شکل میں چکھنا پڑا اس جارحانہ وطنیت نے
فرانس و برطانیہ ہالینڈ و اسپین کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر دیا پھر
اس نے جوع الارضی اور نوآبادیانی پالیسی کی وجہ سے ایشیا و افریقہ کے خطوں پر
دندان حرص و آرز کو تیز کیا اور اپنے سامراجی مقاصد کے ماتحت ایشیا کی قوموں کو خلا می

کے شکنجے میں کس لیا اور ان علاقوں کو خام مال کی منڈیاں بنا کر یہاں کے باشندوں کا خون چوس چوس کر مغربی سامراج تنومند و قوی ہیکل اور طاقت ور بن گیا۔

یہ قومیت و وطنیت مغرب سے دساور ہو کر جب مشرق میں آئی تو اس نے ابتداءً حریت و آزادی کی ایک لہر ایشیائی قوموں میں دوڑادی شروع شروع میں اہیار پرستی کی تحریکوں سے یہاں کے باشندوں میں جوش و خروش اور زور پیدا ہوا لیکن جنگ و جدل کا جو آتش فشاں اس کے پیٹ میں چھپا پڑا تھا وہ ان قوموں کے آزاد ہونے سے پھٹ پڑا یہ نسل وسانی فتنے۔ جغرافیائی فسادات سب اسی کے شاخصانے ہیں فرنگی سامراج کی پالیسی کی وجہ سے اس کا لاوا پہلے سے مشرقی قوم میں پکٹتا رہا تھا بہر حال سولھویں صدی سے جس مادیت اور اس کے فلسفہ نے روحانی قدروں پر تابڑ توڑ حملہ کر کے اس کو دبایا اور مادیت کو ابھارا تھا اب وہ مادیت بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے غیر مادیت (انرجی) کی فضا میں تحلیل و تبدیل ہو چکی ہے۔ انیسویں صدی میں سائنس حیات و کائنات کے جملہ گوشوں پر اپنا آخری فیصلہ کرنے کا مدعی بن کر میدان میں اتر آیا تھا۔ بیسویں صدی میں اس نے اپنے مقام کو پہچان لیا ہے اور اپنے موضوع کو مشاہدات و تجربات تک محدود کر لیا ہے روحانیت کے نفی و اثبات پر حکم لگانا اب اس کے موضوع تحقیق سے باہر ہے۔

ہماری بیسویں صدی مادیت کے کمال کی آخری چوٹی ہے جہاں سے اس کا زوال کے گڈھے میں گرنا یقینی ہے اس مادیت نے قومیت و وطنیت کے نظریے کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دے دی مشرق حب الوطنی کا فطری جذبہ ہمیشہ سے رہا لیکن اس نے مذہب کی شکل اختیار نہیں کی ہمارے نزدیک قومیت کا نظریہ ایشیا کی سرزمین کی آب و ہوا کو اس نہ آیا اور وہ مذہب یا روحانیت کا بدل نہ ہو سکا کیوں کہ مشرقی اقوام کے مزاج میں روحانیت کی جڑیں گہری ہیں لیکن مغرب میں نیشلزم نے مذہب کی جگہ لے لی یورپ کا یہ نیشلزم مادیت ہی کی پیداوار ہے جس نے یونان کے جمہوری نظام کے نمونے پر جمہوریت اور پیرانی

شہنشاہیت کے چربہ پر امریت (ڈکٹریٹر شپ) کو جنم دیا یہ دونوں مادی نظام اس
 صدی میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر جامۂ انسانیت کو تار تار کر رہے ہیں
 دونوں نظاموں کے دعویداروں کے ہاتھوں میں ایٹمی طاقت کے آجانے کی وجہ سے
 اس امر کا بجا طور پر اندیشہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت کی جھنجھلاہٹ
 میں نادان بچوں کی طرح بالک ہٹ اور پھر راج ہٹ کے نتیجے میں ان ہملک ہتھیاروں
 کو استعمال کر کے کہیں پوری انسانی تہذیب و تمدن کو خاکستر نہ کر دیں اس وقت کی
 بڑی طاقتوں کی چھجوری حرکتوں اور اچھی پالیسیوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ مادیت کے
 دن پورے ہو چکے اس کے خیموں کے لدنے کا وقت قریب آچکا وہ انسانی زندگی کے
 پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے آپس میں پنجہ آزمایا ہے جس قدرت کے قانون
 نے چار صدیوں تک مغرب کو ساری دنیا کی سرداری بخشی تھی اب گیند ڈھلک کر
 مشرق کی طرف آ رہی ہے قدرت مادیت کے اندھیاریوں میں سے انسانیت کے نجات
 کے لیے غیب کے اُفق سے روحانیت کے سورج کو طلوع کرنے کے حالات پیدا کر رہی ہے
 مادیت کی کالی رات کے شکم سے روحانیت کی سحر ہویدا ہونے والی ہے چونکہ جو انسان
 روحانی دولت (علم یقین) سے محروم ہو کر اپنے دل کو خوف خداوندی سے خالی
 کر کے وحشت و حیوانیت کی طرف پلٹ رہا ہے اس کا مالک اس اشرف المخلوقات کو
 اندھیرے میں نہ چھوڑے گا مادیت کے ضمیر میں سے رد عمل کے طور پر
 روحانیت جلوہ گر ہو کر رہے گی اخلاقی قدروں کی گمشدگی سے انسان کا انسان سے
 جو اعتماد اٹھتا جا رہا ہے وہ دوبارہ بحال ہو گا مشرق دوبارہ مغرب کو روشنی دکھائے
 گا ہمارے نزدیک حکمت ولی اللہی میں انسانیت کی نجات کا راستہ اور اسکے مشکلات
 کا حل موجود ہے اس لیے یہاں تفصیلی تعارف کرایا جا رہا ہے لیکن اس سے پہلے
 اس دعوت کے پس منظر کو پیش کرنا ضروری ہے۔

دعوتِ ولی اللہی کا پس منظر

شاہ صاحبؒ کی اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب کہ برطانوی سامراج کھل کے میدان میں اچکا تھا اور اس نے پورے ایشیا۔ پر اپنی مکاری و عیاری کے ڈور سے ڈالنے شروع کر دیتے تھے شاہ صاحبؒ جیسے ہمدردانِ انسانیت مفکر اور دور بین و متفہم مس مدبر کی نگاہ میں ایشیا۔ کی مستقبل کی تباہی کا نقشہ صاف نظر آ رہا تھا۔

چونکہ فرنگی سامراج کا خارجی فتنہ بین الاقوامی انداز میں ایشیا۔ کے اندر ریشہ دو انیاں جاری کئے ہوئے تھا اس لیے اس کے توڑ کے لیے بھی ایک آفاقی (یونیورسل) اور بین الاقوامی (انٹرنیشنل) دعوت کی ضرورت تھی جس کا پس منظر یہ ہے —

سترہویں صدی کے آخری دور میں مغل شہنشاہیت نقطہٴ عروج پر پہنچ چکی تھی اور ہمارے ملک کے تہذیبی ارتقاء کا عمل درجہ کمال تک پہنچ چکا تھا عالم اسلام کے پرانے مرکز دمشق و قاہرہ و بغداد، اصفہان، بلخ و بخارا منگولیوں کے حملوں سے تباہ و برباد ہو چکے تھے دار الخلافہ قسطنطنیہ کو چھوڑ کر یہ تمام مرکز زوال کا شکار ہو چکے تھے البتہ ہندوستان کا دار السلطنت دہلی اپنے عالیشان محلات سرسبز و شمر دار باغات کے اعتبار سے پُر رونق خوب صورت و خوشنما و اصحاب فضل و کمال، ارباب علم و ہنر کا گہوارہ بنا ہوا تھا ہماری تاریخی و تحقیقی نگاہ میں اس وقت ہندوستان جنتِ نشان دنیا کی تین تہذیبوں کا سنگم بن گیا تھا ہندوستان کی قدیم آریائی تہذیب کی زمین پر اسلام کے ابتدائی عہد میں مسلمان عربوں نے اسلامی و قدیم سامی تہذیب کی بنیادوں کو اٹھایا جو اپنی فطری سادگی و رواداری اور ہر قسم کی تہذیبی خوبیوں کو اپنے اندر سمو لینے کی زبردست صلاحیت میں ممتاز تھی عربوں کی اس سامی و اسلامی تہذیب کے نقوش قائم ہونے کے بعد ترک افغان مسلم حکمرانوں نے ان بنیادوں پر اپنی تہذیب کی عالی شان عمارت قائم کی افغان آرٹ اپنے استحکام و پختگی اور مضبوطی میں شہرہ آفاق ہے آخر میں

جب مغل آئے تو وہ بھی اپنی تہذیب ساتھ لائے ہندوستان پہنچ کر انھوں نے ایک گنگا جمنی تحریک سے ہمارے ملک کو سنوارا اور نکھارا اور لطافت و نفاست کے حسین و جمیل نقوش اس سرزمین میں ثبت کئے یہ مغل آرٹ و کلچرل بہت جاندار و پائیدار ثابت ہوا اس لیے سترھویں صدی ہندوستان کی تہذیبی ارتقاء کی صدی ہے اکبر و جہانگیر، شاہ جہاں و عالم گیر کا زمانہ ہندوستان کا سنہری دور ہے۔ تینوں تہذیبوں کا یہ ارتقاء اس صدی کے آخر تک درجہ کمال تک پہنچ کر بالکل بزوال ہو گیا چونکہ قانون قدرت کے مطابق ہر کمال کے لیے زوال لازمی ہے اکبر اعظم نے اپنی سلطنت کو ہندوستانیت کی بنیادوں پر اٹھایا جہانگیر و شاہ جہاں نے اس کے عالی شان محل کو مضبوط در و دیوار اور حسین و خوشنما گنبد و مینار سے سجایا اور نگریب عالمگیر نے کنیا کماری سے افغانستان تک اس کو وسعت دیکر اور ایشیا کی عظیم سلطنت بنا کر شمال سے جنوب تک سب کو ایک کر دیا گویا متحدہ ہند کا جو خواب علامہ الدین خلجی نے دیکھا تھا عالمگیر کے ہاتھوں اس کی تعبیر نکل آئی فرنگی سامراج نے دور اکبری کے اندر ہندوستان میں پہلا قدم رکھا اور اپنی شعبہ بازیوں سے شہنشاہ کو اپنے جال میں پھانسا چاہا لیکن جنوبی ہند کے کچھ ساحلی مقامات کے علاوہ ان کے قدم اور کہیں جم نہ سکے البتہ سرطامس و سفیر انگلستان نے جہانگیر کے دربار میں تین سال رہ کر اعتماد پیدا کیا اور فرنگی ڈپلومیسی سے جہانگیر کے دل میں جگہ بنا کر سورت احمد نگر اور آگرہ میں کارخانے کھولنے کی اجازت حاصل کر لی پھر مشرقی ساحلوں پر تجارتی حقوق منوا کر ہنگلی میں تجارتی دفتر کھول لیا شاہ جہاں کے دور میں سلطان شجاع کی مہربانی بنگال میں مال درآمد و برآمد کرنے کا فرمان حاصل کیا انگریز ڈاکٹر باٹن نے شاہ جہاں کے تقرب سے مزید تجارتی رعایتیں حاصل کر کے برطانوی سامراج کے داخلہ کا راستہ کھول دیا۔ اورنگ زیب نے تخت نشین ہو کر اپنی باپ دادا کی رعایتوں کو برقرار رکھا لیکن اب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے کل پُرزے نکالنا اور بالوں پھیلا نا شروع کر دیا تھا۔

اور اس شہنشاہ کے خلاف جس کو پچاس سالہ دور حکومت میں ایک جگہ بیٹھنا کبھی نہیں سیکھا اور جو متحدہ ہند کی تشکیل کے لیے جنوبی ہند کی شیعہ ریاستوں سے ٹکھڑ کرتا رہا اور جب تک مرکز کو مستحکم نہ بنالیا اور پورے ملک کو متحد نہ کر لیا چین سے نہ بیٹھا اس عظیم مدبر و منتظم شہنشاہ کو کمپنی بہادر نے تین سال بعد ہی آنکھیں دکھانا شروع کر دیں چوں کہ انگلستان میں ہندوستانی دولت کی زبردست لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا اس لیے اس غرور و گھنڈ کے نتیجے میں انگریز گورنر بمبئی نے لکھا وہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی تجارت کا انتظام تلواریں کر اپنے ہاتھوں سے کریں (تاریخ ہند ص ۱۶۵) اس خود سرانہ سامراج پالیسی کے مطابق کمپنی نے ۱۶۸۹ء میں بمبئی و سورت وغیرہ سلطانی جہازوں کو گھیر کر (جو حاجیوں کو لے کر جدہ جا رہے تھے) لوٹ لیا کمپنی بہادر اس کو بھول بیٹھی کہ دہلی کے تخت پر اورنگزیب جیسا منتظم و انصاف پسند بادشاہ بیٹھا ہوا ہے شہنشاہ نے اس جرمانہ کارروائی پر کمپنی کو نہ صرف سخت سزا دی بلکہ غیر مشروط معافی نامہ شہنشاہ کے پیش کرنے کو کہا گیا۔ کمپنی کو اورنگزیب کے فرمان کے ماتحت نہ صرف جہاز چھوڑنا پڑے بلکہ نقصانات کا تاوان ڈیڑ لاکھ روپیہ مزید ادا کرنا پڑا۔ آئندہ کے لیے ایسے اقدام سے معافی دیدی گئی تمام ضبط شدہ کوٹھیاں واپس کر دی گئیں اس ایک جھٹکے سے کمپنی کے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔

برطانوی مورخوں نے اورنگزیب کے خلاف جو دل کے پھپھوڑے ہیں اور اس مدبر اور منتظم و نیک نفس بادشاہ کو کٹر شنی حنفی کہہ کر دل کا بخار نکالا ہے اسی انتقامی ذہنیت کا شاہناہ ہے ایسی ہی دکن کی شیعہ حکومت کو ختم کر کے مرکز کے ماتحت لانے کی کارروائی پر شیعہ مورخ بھی عالمگیر سے چراغ پاہیں حالانکہ اس کے دادا اکبر و جہانگیر کو بھی شمالی ہند کی فتوحات کے بعد موقع ملتا تو وہ بھی یہ کار نمایاں انجام دیتے۔

ایرانی و تورانی آویزش

اس موقع پر ایک تاریخ کے طالب علم ہونے کے ناطے سے بادل خواستہ ایک ناگوار فرض انجام دینا پڑ رہا ہے جس نے تاریخ اسلام کو داغدار بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم داخلی فتنہ عبداللہ بن سبا یہودی کا اٹھایا ہوا ہے جس نے اہل بیت کرام کو محبت کے پردے میں شیعیت کا چہرہ اختیار کیا اس سدا بہار اندرونی فتنہ نے ملت کو جس قدر نقصان پہونچایا ہے سقوط بغداد کا سانحہ ہو یا سقوط دہلی کا حادثہ ہر جگہ اس کا ہاتھ نظر آئے گا حکومت مغلیہ کی تعمیر میں بھی تخریب کی صورت پنہاں تھی جب ہمایوں بادشاہ نے شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد صفوی ایرانی حکومت سے فتح ہند کے لیے امداد مانگی تو مشروط امداد دی گئی جس کے اندر وزیر اعظم کا شیعہ ہونا منوایا گیا بیرم خاں نمایندہ بن کر آیا لیکن اکبر اعظم نے اپنی حکمت عملی سے اس معاہدہ کو ختم کر دیا جہانگیر کے عہد میں ملکہ نور جہاں کے اقتدار میں آنے کی وجہ سے یہ سویا ہوا فتنہ پھر جاگ اٹھا اور نگزیب کی دور بین نگاہ نے ہندوستان کے مستقبل کو اس فتنہ سے پاک کرنے کا عزم کیا اس وقت شیعہ سرگرمیوں کا مرکز گولکنڈہ تھا جس کا آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۹۸ھ میں گرفتار ہو کر قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا گیا یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تانا شاہ کا لفظ کان میں پڑتے ہی مطلق العنانی اور عیش پرستی کا تصور ذہن میں آجاتا ہے اور ابوالحسن واقعاً اس کا صحیح مصداق تھا چنانچہ غلام حسن شیعہ مورخ نے عالمگیر کو اس سلسلہ میں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ خود اس کی عبادت کا بین السطور اور نگزیب کی عملی کارروائی کی صحت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ عبارت یہ ہے: ”گولکنڈہ کے قلعہ کی مضبوطی سرزمین حیدر آباد کی خوبی اور اس کی آب و ہوا کی لطافت و خوشگوار ی کو کون کہاں تک بیان کرے وہاں کا بادشاہ لہو و لعب عیش و طرب میں اوروں سے زیادہ مہمک ہو گیا اس کی وجہ سے فسق و فجور کا

عام رواج ہوا عالم گیر بظاہر اپنے آپ کو اہل صلاح اور تارک دنیا کی شکل ظاہر کرتا تھا۔
 حیدر آباد کو دارالجمہاد قرار دیا وہاں کے باشندے تہہ تیغ کئے گئے اور شہر کو تباہ و برباد
 کر دیا اصل میں عالم گیر کا مقصد ابوالحسن کے شہرۃ آفاق خزانوں کو ہتھیانا علمائے شیعہ
 کا ختم کرنا اور عام مومنین کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانا تھا (سیر المتاخرین)
 ان مورخین کی برہمی کی وجہ پانچ شیعہ حکومتوں کو فتح کر کے جنوبی ہند کو
 مستقل طور سے شمال سے جوڑ دینے کا گناہ ہے جو عالم گیر سے سرزد ہوا وہ پانچ حکومتیں
 یہ تھیں۔ (۱) سلطنت بہمنہ بانی حسن گنگوہہ بہمنی دارالحکومت گلبرگ (۲) عادل شاہی
 دارالحکومت بیجاپور (۳) قطب شاہی دارالحکومت گولکنڈہ (۴) برید شاہی دارالسلطنت
 بیدر (۵) عماد شاہی دارالسلطنت ایلیچور (۶) وجے نگر کی ہندو حکومت فرنگی مورخوں
 کی تقلید میں ہمارے ملکی مورخوں نے بھی اورنگ زیب کی مضبوط شخصیت اور اس کے
 کردار پر گرد و غبار اڑایا ہے مورخ اسلام علامہ شبلیؒ نے فرمایا۔ ۵

تمہیں لے دیکے ساری داستان میں یاد ہے اتنا
 کہ عالم گیر ہند و کش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

اورنگ زیب کی اصلی شخصیت

ہمارا قلم اس متحدہ ہند کے نقشہ میں عملی رنگ بھرنے والے اولولعزم و بہاد
 پاک باز و درویش منش شہنشاہ کی اصلی و حقیقی شخصیت کی رونمائی کے لیے
 مجبور ہے جس کی شخصیت سے عام مورخوں کو خدا واسطے کا بیرہا اور جنہوں نے
 اس کی کردار کشی کر کے اصلی چہرے کو مسخ کر کے دکھایا ہے اور برطانوی سامراجی
 مورخوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار نے اس عظیم کارناموں کو دبائے کی سعی کی
 ہے درحقیقت اورنگ زیب متحدہ ہند کا عظیم بادشاہ اعلیٰ درجہ کا فعال و منتظم
 شہنشاہ تھا جس کے ناقابل شکست عزم و حوصلہ و غیر معمولی انتظامی صلاحیت نے
 باپ بیٹے کی رو رعایت نہ کی اس لیے ملکی بغاوتوں کے فرو کرنے میں اس کی سخت گیری

کی زد میں باپ بھائیوں کی طرح کہیں کہیں برادران وطن بھی اس سختی کا شکار ہوئے خود اس کا حقیقی بیٹا ولی عہد بہادر شاہ اول عمر بھر کا پنتار ہالیکن جو کچھ ہوا مسلکی انتظامی مصالح کا تقاضہ تھا اکبر کے ساتھ اس کے بھائیوں نے اور شاہ جہاں نے اپنے باپ جہاں گیر کے ساتھ کیا کیا ہزار ترح داں جانتا ہے لیکن مجرم فقط اور نگزیب ہی کو ٹھہرایا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اور نگزیب نے اپنی ملکی و اقتصادی پالیسی اور سچی مذہبیت کے پیش نظر مغل شہنشاہیت کی پچھلی فضول خرچیوں کو بیکلخت ختم کر دیا اکبر اعظم کے زمانے کی بہت سی تعیش پسندانہ روایتوں اور خرافاتی فضول رسموں کو برسر اقتدار ہو کر سیک جنبش قدم مٹا دیا دربار شاہی میں شاعروں قصیدہ خوانوں کا ایک مستقل محکمہ تھا جس کے اندر ملک الشعراء کا بھی اہم عہدہ تھا ان کا کل کام بادشاہ کی بے جا تعریف و توصیف اور مبالغہ آمیز خوشامد پرستانہ خیالات کے اظہار کے سوا کچھ نہ تھا ایسے ہی ارباب نشاط درقص و سرور کی مستقل فوج تھی جن کی حکومت مستقل پرستی کرتی تھی بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء رؤساء کی ڈیوٹیوں میں شراب و کباب طاؤس و رباب کی رنگین محفلیں پورے ملک کو عیش و عشرت اور غفلت کا گہوارہ بناتے ہوئے تھیں اور نگزیب نے ان فنون لطیفہ کو جواب فنون کشیفہ بن گئے تھے یک لخت ختم کر دیا۔

لیکن کیا اور نگزیب واقعاً نراملوئی فنون لطیفہ کے ذوق سے کوراء یا علم و ادب نابلد تھا اور نگزیب کی حقیقی سیرت اور اصلی صوانح عمری اس کی نفی کرتی ہے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا نثر نگار درقعات عالمگیری کا مصنف بہترین قسم کا سخن سنج اور سخن فہم شاعر تھا جیسا کہ چندیری پانڈے نے اپنی کتاب ”مغل بادشاہوں کی ہندی“ میں لکھا ہے کہ ہندی سیکھنا ہر مغل بادشاہ کے لیے ضروری تھا چنانچہ برطانوی سامراج مورخین کی تاریخ پر پڑھنے والوں کے لیے یہ امر حیرت میں ڈبو دینے والا ہو گا کہ اور نگزیب بھی کوی تھا اور وہ بھی ہندی کا کوی اس کی ایک رنگین کوتاہ

اپنی چہیتی بیوی اورے پوری بیگم کے لیے ہندی ادب میں موجود ہے اور جیسا کہ گھلر صاحب نے تحقیقی طور پر ثابت کیا ہے کہ اورنگزیب ہندی شعراء کی بڑی عزت کرتا تھا ایک کوی جس کا نام برہند تھا اس کو بادشاہ دس روپے روزانہ دیتا تھا ایک ہندی کا شاعر دربار میں ہمیشہ عمدہ دار رہا جسے کوی رائے اور کوی راج کے خطاب سے نوازا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ہندی اور برج بھاشا کے شاعروں نے اورنگزیب کی بہت تعریف کی ہے اورنگزیب ہندی کا زبردست حمایتی تھا اس لیے ہندی کے فروغ و ترقی دینے کی برابر کوشش کرتا رہا اورنگزیب امیر خسرو کی ہندی کویتا کا عاشق تھا خسرو کی ”انمل اور کہہ مکر نیاں“ اسے ازبر تھیں۔ اپنی چہیتی بیگم اور دیپوری کے ساتھ وہ اکثر خسرو کی بھجارتیں (پہیلیاں) حل کیا کرتا تھا (امیر خسرو اور مشترکہ کلچرل ص ۱)

بہر حال اورنگزیب کا بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے خزانہ شاہی پر جو ناجائز بوجھ بڑھ رہا تھا اس کو کیوں ختم کیا۔ بھلا جو شخص اپنے ہاتھ سے قرآن لکھ کر اور لوپی بن کر اپنا گزارہ کرتا ہو وہ شاہی خزانہ سے ایک پانی کا بھی روادار نہ ہو اور وہ متقی پرہیزگار بادشاہ جس نے مرتے وقت اپنا ترکہ کل سترہ روپے چار آنے چھوڑا ہو جو اس کے ہاتھ کی محنت کمائی تھیں وہ حکومت کی ان فضول خرچیوں کو کیونکر گوارہ کر سکتا تھا لیکن جہاں خرچ کی واقعی ضرورت ہوتی وہاں اس کا دست کرم کشادہ رہتا تھا جیسا کہ ہندی شاعری کے سرپرستی کے سلسلے میں گزرا اورنگزیب کا اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کیا معاملہ تھا اس کے لیے شمالی و جنوبی ہند کے مندروں، مٹھوں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے معافیات اور جاگیرات کی اسناد کو دیکھا جائے تو اس سے اس کی بے تعصبی کا پتا چلتا ہے اکبر اعظم جیسے ہندو ستانیت کو فروغ دینے والے بادشاہ سے اس کا عشر و عشیر (دسواں حصہ) بھی نہ ہو سکا چلتے چلتے چھترہنی شیواجی ہمارا راج کے قصے کو دیکھ لیا جائے شیواجی ابتداء سے بادشاہ کا باغی نہ تھا بلکہ

بلکہ دربار شاہی میں ایک وفادار سردار کی طرح ہفت ہزاری منصب کی دل میں توقع باندھ کر حاضر ہوا تھا دربار میں عزت کے ساتھ اس کو بٹھایا گیا لیکن شہنشاہ (اورنگزیب) نے ایک دم ہفت ہزاری دنیا مصلحت ملکی کی بنا پر مناسب نہیں سمجھا۔ ہزاری منصب عطا کیا جس پر شیواجی روٹھ کر چلے گئے اور شہنشاہ سے چھپتے چھپتے پھرے سامنے آنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی اس ناراضگی پر شیواجی ہمارا ج کو ہیر و بنا کر پیش کرنا کہاں تک مناسب ہے خود فیصلہ کر لیا جاتے۔

بہر حال اورنگزیب ہندوستان کو افغانستان سے لے کر کنیا کمار تک ایک کمرے اور متحدہ ہند کے خاکے میں عملی رنگ بھر کر اپنے خدا سے مسئلہ میں جا ملا اور ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کا بوجھ جو ایک جھوٹا براعظم ہے دکرورا اور ناخلف جانشینوں کے کمر و رکاب دھول پر آپڑا، جو اس کو اٹھانہ سکے۔

برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیاں

اٹھارہویں صدی عشرہ کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ محسوس ہونے لگا کہ وہ تمام سرکش طاقتیں مرہٹہ، سکھ، جاٹ، اور مسلمان باغی سردار، جن کو اورنگزیب نے رعب داب کی بوتلوں میں بند کر لیا تھا اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس ڈانٹ کو توڑتاڑ کے باہر نکل آئے اور ملک کی اتحاد اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کیلئے پورے ملک میں دنداٹنے لگے اس افراتفری اور طوائف الملوکی سے برطانوی سامراج جو مشرقی ساحل دہلی، میں دور بین لگائے ہوئے ملکی حالات کا جائزہ لے رہا اور دھیرے دھیرے اپنے قدم آگے بڑھا رہا اس کو اپنی سامراجی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے بنا بنایا میدان مل گیا برطانوی سامراج کی ظلم و غارتگری اور توسیع پسندانہ پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے ہم کو اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہماری اندرونی خرابیاں اور باہمی خانہ جنگیاں ملک کی سیاسی و تہذیبی ملیت کی پہلے سے پرچھے اٹھا رہی تھیں پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں

برطانوی سامراج سے ہندوستان کی شکست جو اپنوں کی غداری سے ہوئی تھی وہ ملکی حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھیں لیکن اس پر بھی سب خواب غفلت میں مدہوش رہے سامراج کی اس کھٹو کرنے ان نبیند کے ماتوں کو نہ جگایا ان میں سے کسی نے بھی ہوا کے رخ کو نہ پہچانا مرکز میں ایرانی و نورانی کش مکش بدستور رہی نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں نے سلطنت مغلیہ کے مضبوط قلعوں کی بنیادوں کو ہلادیا پھر مرہٹہ گردی جٹا گردی نے اس کے در و دیوار میں شکاف ڈال کر بیرونی طاقت کے لیے راستہ کھول دیا یا تو مرکزی حکومت کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ ڈیڑھ سو سال (۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء) چار عظیم حکمرانوں کو پروان چڑھایا۔ جب اس کے اندر ضعف و کمزوری در آئی تو پچاس سال (۱۸۰۹ء تا ۱۸۵۷ء) کے اندر دس حکمران یکے بعد دیگرے تخت سلطنت پر اٹھائے اور بٹھائے گئے بادشاہ گرامرار کے ہاتھ میں اکبر و عالم گیر کے وارث کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کے بعد جب (۱۸۵۷ء) بکسر کے اندر برطانوی سامراج اور ہندوستانیوں کے درمیان جنگ ہوئی تو اس نے ملکی قسمت کا فیصلہ کر دیا کیوں کہ اس ہمہ میں بنگال کے میر قاسم اودھ کے شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کے ساتھ شامل ہو کر متحدہ طور پر مقابلہ کیا تھا اس شکست نے انگریز کی عسکری برتری کو ثابت کر دیا اور شکست کے نتیجہ میں شاہ عالم ثانی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا اور ایک معاہدے کے ماتحت تمام قلم رو کی نظامت کمپنی کے ہاتھ آگئی بادشاہ کی حکومت دہلی کی چہار دیواری تک محصور ہو گئی اگرچہ ضابطہ میں کمپنی باجگزار بن گئی لیکن عملاً یہ قرار پایا جس کی ڈونڈ پیٹی و خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم انگریز بہادر کا، یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کے ایک علمی گھرانے سے ایک ہمدرد خلق درویش صوفی

خدا پرست عالم نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا یہ تھے حضرت شاہ
ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی۔ ۷

زباں پہ بارِ خدا یا کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلے

خدا پرست عالم نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا یہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ
زباں پہ بارِ خدا یا کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلے

شاہ ولی اللہ کا تعارف

ہمارا ملک ہندوستان مغلیہ سلطنت کے نقطہ عروج پر پہنچ جانے کے بعد جب انحطاط و زوال کی طرف مائل ہو رہا تھا اور ملکی سیاست ایک نئے انقلاب سے دوچار ہونے والی تھی اس وقت دہلی کے ایک علمی و روحانی خاندان میں چار شوال ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۷۰۱ء میں شاہ ولی اللہ جلوہ افروز ہوئے ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلوی ایک مرد درویش اور بلند پایہ عالم و فاضل بزرگ تھے جب شاہ صاحب پیدا ہوئے اس وقت عالمگیر اعظم کا آفتاب اقبال دکن کی وادیوں میں اپنی آخری سنہری شعاعیں بکھیر رہا تھا لیکن جب ان کی ہوش و شعور کی آنکھیں کھلیں تو وہ سورج غروب ہو چکا تھا مگر سورج ڈوب جانے کے بعد بھی کچھ مدت تک شفق کے پردے میں اپنی گلزار و نارنگی روشنیوں سے افق کو روشن رکھتا ہے اس لیے عالمگیر کے دلی عہد و جانشین بہادر شاہ اول کے پنج سالہ دور حکومت میں نظام سلطنت اسی طرح قائم و برقرار رہا لیکن بہادر شاہ کے بعد مغل شہنشاہیت کو رات کی اندھیروں نے گھیر لیا اور فروخ سیر بادشاہ یا محمد شاہ رنگیلے کو تھوڑی سی مدت کے علاوہ کسی بادشاہ کو بھی اپنے اختیارات نافذ کرنے کا موقع نہ مل سکا شاہ صاحب عالمگیر کے انتقال ۱۱۳۹ھ کے چار پانچ سال پہلے پیدا ہوئے اور شاہ عالم ثانی کے عہد ۱۱۳۶ھ میں انتقال فرمایا جس طرح انیر خسر و دہلوی نے اپنی مختصر زندگی میں سات بادشاہوں کا عروج و زوال نظر حقیقت نگر سے دیکھا اس دور کے معاشرے و احوال کی نرجہانی شاعری

کی زبان میں کی اسی طرح شاہ صاحب نے اپنے دور انحطاط میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر دس حکمرانوں کو عبرت بن لگا ہوں سے چڑھتے اور اترتے دیکھا جن میں صرف چار بادشاہ اپنی موت سے مرے ورنہ کسی کو تخت سے تختہ پر لٹکایا گیا کسی کو جیل خانہ میں موت کے گھاٹ اتارا گیا اور کسی کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر جیتے جی اندھا کر دیا گیا وہ بادشاہ یہ ہیں بہادر شاہ اول، معز الدین شاہ، جہاندار شاہ، فروخ سیر، رفیع الدولہ، رفیع الدولہ، محمد شاہ (رنگیلے) احمد شاہ عالمگیر ثانی شاہ عالم ثانی۔ ان بادشاہوں کے عبرت ناک حالات شاہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے گزرے تاریخ ہند کا یہ دور ہولناک اور بھیانک دور تھا سادات بارہ کا نظام حکومت پر غلبہ و تسلط، فروخ میر بادشاہ کا ان کے ہاتھوں بے دردانہ قتل، مرہٹوں کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ ۱۷۳۹ء نادر شاہ کی تین دن تک دہلی میں خونریزی ۱۷۳۹ء احمد شاہ ابدالی کی پانی پت کی معرکہ آرائی ۱۷۳۹ء سورج مل جاٹ کی لوٹ مار اور غارتگری ۱۷۵۲ء ایرانی توراتی اودیزش اور پھر فرنگی سامراج کا بہار و بنگال میں غاصبانہ عمل دخل ۱۷۵۷ء یہ سارے واقعات کے دھارے ہندوستانی سیاست میں ان کے سامنے سے گزرتے رہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالمصمیم علوم معقول و منقول کے ماہر و فاضل تھے ایک طرف فتاویٰ عالمگیری کے ترتیب دینے والے بورڈ کے اہم رکن تھے دوسری طرف مشہور معقول علامہ میرزا ہد کے براہ راست شاگرد تھے شاہ صاحب کی عبقریت و ذہانت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پندرہویں سال نہ صرف جملہ عقلی و نقلی علوم کی تکمیل فرمائی بلکہ تکمیل باطنی نقشبندی طریقہ پر کرا کے والد ماجد نے علماء فضلہ کی موجودگی میں مسند درس پر بٹھادیا اور سب نے ان کے کمال علم و فن پر مہر تصدیق ثبت کی اس کے بعد بارہ برس تک ان علوم و فنون کے درس کا ہنگامہ برپا کیا اور ہر علم پر غور و فکر جاری رکھا (القول الجلی ص ۳۶) شاہ صاحب نے تفہیمات الہیہ میں اپنے زمانے کی تحقیق علمی کے سلسلے میں تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ (۱) بہرہ ان جس کا ایک شعبہ حکمت عملی ہے

جس کے ذریعہ قرآن حکیم کے نئے معجزہ کا نیا باب کھولا ہے (۲) وجدان یا اشراق و کشف ان کے زمانے میں یا کمال صوفیاء جیسے مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ کا عوام و خواص پر زبردست اثر تھا (۳) اسلامی تعلیمات کے اصل مآخذ قرآن و سنت ہمارے ملک میں جامد و خشک فقہاء کے نظام حکومت میں غلبہ کی وجہ سے اس کی طرف سے بے توجہی ہو گئی تھی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے پہلے سلسلہ حدیث کو جاری کیا پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن و سنت کی اشاعت کو اس طرح عام فرمایا کہ قال اللہ و قال الرسولؐ کی صداؤں سے فضائیں گونج اٹھیں یہی آپ کا تجدیدی کارنامہ ہے شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء حجاز مقدس تشریف لے گئے اور دو سال قیام کر کے حدیث کی سند لے کر آئے انہوں نے مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر ایشیاء و افریقہ اور دیگر ممالک کے حاجیوں سے ان ممالک کے ہر طرح کے احوال معلوم کیے ترک کی خلافت (جو یورپ ایشیاء کی عظیم سلطنت تھی) اس کا بھی جائزہ لیا چنانچہ لکھتے ہیں احوال ہند برما مخفی نیست بلا دِ عرب نیز دیدیم و احوال مردم ولایت ارتقاات میں جانشیدیم یعنی ہندوستان کے حالات ہم پر اس لیے مخفی نہیں ہے کہ وہ فقیر کا وطن ہے اور عرب ممالک بھی ہم نے دیکھا ہے اور دوسرے ملکوں (یورپ وغیرہ) کے احوال معتبر لوگوں سے سنے ان احوال و کوائف کا غور و فکر سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی فکر ملک پیما اور ذہن رسا نے ایک صحیح فیصلہ کیا وہ ایک حکیم و فیلسوف، ایک روشن ضمیر صوفی اور ہمدرد خلق مردان خدا میں تھے جن کو قدرت نے روز ازل سے ایک درد مند دل ایک حقیقت آشنا نگاہ عطا فرمائی تھی انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ معاشرہ و سلطنت کی جملہ خرابیوں کی جڑ بنیاد وہ نظام ملکیت ہے جو اپنی افادیت کے دن ختم کر چکا ہے فیوض الحرمین میں اپنا طویل خواب ۱۱۴۳ھ کا تحریر کیا ہے سالونی ماذا حکم اللہ فی ہذہ الساعۃ قلت فک کل نظام قالوا الی مٹی قلت الی تدونی فسکنت در سالہ محمودیہ بحوالہ تحریک ص ۱۴۱

کارکنان قضا و قدر نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت خدا کا کیا فیصلہ ہے تو میں نے جواب دیا کہ موجودہ ہر نظام کا خاتمہ شاہ صاحبؒ نے حج سے واپس ہو کر پانچویں

سال ترجمہ قرآن بنام فتح الرحمن کیا جس پر پیشہ ور مولویوں نے ان کے خلاف ایک محاذ بنایا اور گیارہ سال بعد قرآنی تعلیمات کو انقلابی پروگرام کے ساتھ شروع کیا بارہ برس بعد اپنی دعوت کا آغاز فرمایا جس کے اصل الاصول دو قرار دیئے۔ (۱) قرآن کی حکمت عملی کی تعلیم (۲) حیات اجتماعی یا معاشیات انسانی میں اقتصادی توازن مساوات کا قیام کیونکہ ہندوستان بلکہ پورا ایشیا اس وقت جس خطرناک بیماری میں مبتلا تھا اس کے لیے یہی نسخہ شفا درکار تھا اس لیے اس ماحول کی پردہ کشائی ضروری ہے جس کے اندر ولی اللہی دعوت برپا ہوئی۔

ولی اللہی دعوت کا ماحول

حضرت شاہ صاحبؒ نے جب ہوش بیا اس وقت مغل شہنشاہیت کا عالی شان محل اپنے بظاہر بلند و بالا بنیادوں، مضبوط پختہ دیواروں کے ساتھ اپنی خستگی اور اندر ہی اندر کمزوری کی وجہ سے زمین پر آ رہا تھا جس فوجی و جاگیر دارانہ نظام کی دیواروں پر شہنشاہیت کی تعمیر ہوئی تھی وہ پرانی بوسیدہ ہو کر گرا چاہتی تھیں مرکز کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے ہر طاقت ور امیر و جاگیر دار اور فوجی سپہ سالار اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجد بنانے میں لگا ہوا تھا اس داخلی کمزوری کو بھانپ کر کہنی بہادر کے کارندوں نے ۱۶۹۱ء میں بنگال کے تین مقامات پر زمینداری کے حقوق حاصل کر کے کالی گھاٹ کو سامراج کی توسیع کے لیے ایک مضبوط فوجی مرکز بنا کر پورے ملک کو اپنے جال میں جکڑنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا یہی کالی گھاٹ بعد میں کلکتہ کے نام سے برطانوی شہنشاہیت کا پہلا قلعہ و راجدھانی بنا حضرت شاہ صاحبؒ کی عقابی نظریا ان کی چشم باطن نے اس امر کو دیکھ لیا کہ مغل شہنشاہیت دم توڑ چکی ہے احمد شاہ ابدالی کے حملے ۱۷۳۹ء کے ذریعہ جو طاقت کا انجکشن دیا تھا اور مرکزی مضبوطی کا جو نقشہ تجویز کیا تھا وہ فائدہ مند ثابت نہ ہوا گویا جاگیر دارانہ نظام آج کل کی زبان میں سرمایہ دارانہ نظام کے لیے جگہ خالی کر رہا تھا جو شہنشاہیت کچھلے دور میں غریب

و متوسط طبقہ کے لوگوں کے آنسو پونچھتی رہتی تھی اس کی تمام دولت آہستہ آہستہ کھسکتی ہوتی چند افراد (سرمایہ داروں) کی مٹھی میں سمٹی جا رہی ہے بدیشی سامراج اپنے جدید سرمایہ دارانہ نظام کے بل بوتے پر اپنے مرکز (کلکتہ) سے آگے پاؤں پھیلاتا ہوا پورے ملک کو اپنے پاؤں تلے کچلنے کے لیے اور اس پر یکہ و تنہا قبضہ جانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ بنگال کے زمینداروں نے بدیشی سامراجوں کی پشت پناہی مل جانے کی وجہ سے وہاں کے مزدوروں اور نیچے درجے کے کاشتکاروں کو سرمایہ داری کے شکنجے میں کسنے کا عمل شروع کر دیا تھا جس کا مقابلہ کرنے کے لیے مولویوں کی فرائضی تحریک زور باندھا اور اللہ کا قرآنی نعرہ بلند کیا کہ تمام زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اگرچہ ابھی تک صنعتی نظام کے زیادہ پھیلاؤ نہ ہونے کی وجہ سے طبقاتی کشمکش معاشی میدانوں میں نہ ظاہر ہوئی تھی لیکن بہر حال ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارخانوں کی بنیاد رکھ دی تھی گویا صنعتی دور کے دہلیز پر ہندوستان نے قدم رکھ دیا تھا شاہ صاحب کی فراست ایمانی نے اس پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش کو باطنی نگاہ سے دیکھ لیا جو آگے چل کر مشرق کی روحانی قدروں پر حملہ آور ہونے والی اور پوری انسانیت کو طبقاتی جنگ کی ابدی جہنم میں ڈھکیٹنے والی تھی مغرب کا لایا ہوا یہ خوفناک فتنہ (جو صنعتی دور کی پیداوار تھا) یورپ میں جابر و ظالم شہنشاہیت کے مقابلے میں وہاں کے مظلوم دستم رسیدہ غریب مخلوق اور عوام میں پھیل چکا تھا سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت نے علم و تحقیق کے شیدائیوں سائنسدانوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور ظالم شہنشاہیت کی اس جھوٹے مذہب نے پوری پوری پشت پناہی کی تھی مغرب کے اس صنعتی انقلاب نے اس کے جواب میں مذہب و روحانیت کو حیات انسانی کی رہنمائی کے خلاف ایک دائمی جنگ کی بنیاد ڈال دی اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے اس خوفناک فتنہ کے سرچشمہ پر اُبلنے سے پہلے اس پر بند باندھا چاہا تا کہ انسانی زندگی جنگ و جدال تباہی و بربادی کے سیلاب میں بہہ نہ جائے اور انسانیت اپنے جوہر نورانی (ایمان و یقین) سے محروم نہ ہو جائے شاہ صاحب

نے دین کے مادی روحانی اخلاقی و معاشی پہلوؤں کو قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح پیش کیا کہ وہ انسانی زندگی کی جسمانی روحانی ظاہری و باطنی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔ چونکہ یورپ کے کلیسائی نظام نے وہاں کے غریب، مفلس، مظلوم عوام کے لیے ایک قاتل اور سفاک نظام کے ساتھ تعاون کا کردار کیا تھا ایک طرف عوام کو مذہب کے نام پر یسوع مسیح کے صلیب پر چڑھ جانے کو سب کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جانے کا باطل عقیدہ دلوں میں بٹھایا اور اس باطل عقیدہ سے نجات کی افیون پلائی تھی دوسری طرف ظالم بادشاہوں جابر زمینداروں کے ظلم و ستم میں ان کے ہاتھوں کو مضبوط کیا تھا اس لیے نہ صرف عیسائیت بلکہ نفس مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات عوام کے دلوں میں سلگ اٹھے اس مذہبی نفرت و عداوت کی بھٹی میں تپ کر جس فلسفہ نے جنم لیا اس نے مذہب ہی کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا۔

انیسویں صدی کی مادیت

انیسویں صدی مادیت کو لے کر آئی اس نے زندگی کو عمل و رد عمل کی جدلیاتی منطق کے روپ میں پیش کیا جس نے اس عالم کو ایک مستقل رزم گاہ یا میدان جنگ بنا کر رکھ دیا اردن کا فلسفہ ارتقا عقلی و تجرباتی حقیقت یا فلسفہ و سائنس کی حقیقت رسی کے پتھریں میں پیدا ہونے والے نظریے سے زیادہ اسی جذباتی و نفسیاتی رد عمل کا شاخسانہ ہے اس لیے یہ فلسفہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس "کاموید بن کر نمودار ہوا جس کے نتیجے میں رسوائے عالم مصنف میکا ویلی نے اپنی کتاب کے اندر سیاست میں اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دینے کی تعلیم دے کر بے ایمانی کو فروغ دیا اور انسانیت پر سے اعتماد و اعتبار کو ختم کر دیا اس فلسفہ نے آغاز ہی سے کمزور اقوام کا استحصال نوآبادیاتی نظام، غریبوں کے حقوق پر ناجائز تسلط خصوصیت سے ایشیائی ممالک کی پسماندگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور جنگ زرگری برپا کرنے کو اپنا نصب العین بنایا جس کی وجہ سے دوبار انسانیت جہنم کی بھٹی میں جھونکی چاچکی ہے پہلی جنگ

فیظیم ۱۹۱۴ء اور جنگ عالمگیر ۱۹۳۷ء کی بربادیوں و ہلاکت سامانیوں کی داستانیں
 ذہنوں میں اب بھی تازہ ہیں اور اب بھی ایشیائی ملکوں کی آزادی کے بعد
 مغربی سامراج نے اپنے اقتصادی و معاشی جال کو دراز کر کے ترقی پذیر اقوام کو نت
 نئے حملوں اور فتنوں کا شکار بنا رکھا ہے اس مادی فلسفے کے حامی جملہ مشرقی ممالک کے
 ہتھیاروں کے بیوپاری بن کر عالمی امن کو برباد کر کے انسانیت کی رفاہیت اور خوشحالی
 کو تباہ کرنے کے درپے ہیں حالانکہ تخلیقی ارتقار کا تصور مشرق میں معرفت افریں اور
 حیات بخش رہا ہے نظریہ ارتقار کا آغاز مشرق ہی سے ہوا ہے عرب کے مشہور مورخ
 و جغرافی علامہ مسعودی نے تخلیق کائنات کے سلسلہ کو تدریجی بنایا ہے کہ کائنات میں
 پہلے جمادات پھر نباتات اس کے بعد حیوانات کا ظہور ہوا اور آخر میں اشرف المخلوقات
 یعنی انسان خلیفۃ الرحمن بن کر جلوہ گر ہوا (مروج الذهب)

علامہ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب الفوز الاصحیح میں اس تخلیقی ارتقار کو دلائل سے
 ثابت کیا ہے مولانا روم نے بھی اپنی مثنوی میں اور دیگر حکمائے اسلام نے بھی اس
 طرف اشارے کئے ہیں لیکن یہ تخلیقی ارتقار خدا کی شان ربوبیت کے جلوؤں کا
 انعکاس اور اس کے ایمان آفریں رنگارنگ مظاہر کی تفسیر و توضیح ہے جس سے
 معرفت کے روحانیت کے چمکارے دیکتے ہوئے نظر آتے ہیں چونکہ کتاب حکمت
 (قرآن حکیم) خدا یا خالق کائنات کا جو تعارف کرایا ہے وہ رب العالمین کی صفت
 عالیہ کا ہے جس سے خود تخلیق کائنات میں تدریجی ارتقار کا سراغ ملتا ہے کیونکہ
 ربوبیت کی حقیقت ہی مخلوقات یا اشیاء کو درجہ بدرجہ ادنیٰ مرحلوں سے اعلیٰ
 منزل تکمیل تک پہنچانے کا نام ہے جس سے ہمارا یہ عالم ایک عرصہ زرم گاہ کے
 بجائے قدرت خداوندی عظمت آفریں جلوہ گاہ ثابت ہوتی ہے ڈارون نے جب
 تخلیق کائنات کی توجیہ کرتا چاہی تو وہ دور مذہب دشمنی اور دین سے بیزاری
 کا دور تھا اس لیے اس نے تخلیق کائنات یعنی مخلوقات کو خالق کے بغیر اور مضوعاً
 کو صانع کے بغیر سمجھا چاہا تو وہی صورت پیش آئی جو مقفل صندوق کو چابی کے

بغیر یا غلط کنجی سے کھولنے کی یا کسی الجھی ہوئی گتھی کو سراپا تھ میں لائے بغیر سلجھانے کی کوشش کے نتیجے میں ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ قفل یا تالا کھلنے کے بجائے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا اور وہ گتھی الجھی کی الجھی رہے گی اس لیے ڈارون نے حقیقت ارتقاء کو مذہب دشمنی کے سانچے میں جب ڈالا تو ایک اندھے لوے لنگڑے مادے کو سب کچھ ماننا پڑا۔ حقیقت الحقائق یا علت العلل (خدا) سے منہ موڑ کر جب اصل حقیقت کو معلوم کرنا چاہا تو وہی سائنس جو ہر جگہ مشاہدہ و تجربہ پر یقین رکھتا تھا اور عقلی قیاسات کو ایک ذہنی ڈھکوسلا ٹھہراتا تھا اس مسئلہ میں بے سرو پا وہی تباہی قیاس آرائیوں کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا۔

ڈارون کے بعد لیبارک جیسے سائنسدانوں کے گروہ نے ڈارون کے قیاسی نظریہ کو تجربیاتی دلائل سے مسترد کر دیا بہر حال اس باطل و بے بنیاد نظریے پر جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ آج بھی قائم و برقرار ہیں۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ یہ کائنات نجات و اتفاق سے علت و معلول کے فطری قانون کے خلاف کیونکر ظہور میں آئی۔

(۲) دوسرے یہ کہ ایک بے جان مادے میں زندگی کیوں پیدا ہوئی؟

(۳) پھر زندگی نے از خود تنوع و رنگارنگی کیونکر اختیار کی؟

(۴) پھر لاشعوری کائنات میں شعور خصوصاً شعور انسانی کی تخلیق کیونکر ہوئی۔

(۵) پھر یہ ارتقاء انسان تک پہنچ کر کیوں رک گیا۔

اس قسم کے بیشمار سوالات ہیں مادیت کو روحانیت کا سہارا ہے تبیر نہ حل کر سکی ہے اور نہ اس عقدہ مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے کیونکہ انیسویں صدی کی مادیت کا بلند و بالا اور خوشناما محل بیسویں صدی کے سائنسی تجربات و تحقیقات ہاتھوں ڈھا چکا ہے بلکہ خود سائنس جدید نے مادیت سے چھلاتنگ لگا کر غیر مادیت (انرجی) توانائی و قوت اور روحانیت کے چوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے پرانے یونانی فلسفہ کے جز لای تجزی کا تصور ہباءً منشور ایا پادر ہوا ہو کر رہ گیا۔

آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت نے زمان و مکان کے تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے
انیسویں صدی کی جس باطل فرسودہ مادیت پر ہیگیل اور نیٹشے کا فلسفہ قوت اور مارکس
کا نظریہ معیشت کا محل تیار کیا گیا تھا اس کی بنیادیں ہی اکھڑ چکی ہیں جن بنیادوں پر
معاشی نظریات (کیونزم سوشلزم) اٹھایا گیا تھا وہ سب زیر زمین ہو چکے مگر
سانپ کے نکل جانے کے بعد بھی اس کی لکیر کو اب بھی پٹیا جا رہا ہے اور وہی طاقت
وقوت کا فلسفہ انسانیت کو طبقات میں تقسیم کر کے ایک دائمی جنگ کی طرف لے
جا رہا ہے اب تک تمام دماغوں پر یہی فلسفہ چھایا ہوا ہے بہر حال اس بر خود غلط نظریہ
نے ہمارے دنیا کو تنازع للبقار کا میدان کارزار یا طاقت ور و کمزور انسانوں کا ایک
اکھاڑا بنا دیا ہے جس کے بطن سے مغربی سامراج نے جنم لیا اور ایشیاء و افریقہ امریکہ
آسٹریلیا کے سادہ لوح سیدھے سچے مگر کمزور مخلوق کو اپنے ناجائز اقتدار کا نشانہ بنا کر
دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔

قانون ایثار و قربانی

اس باطل و فرسودہ مادی فلسفہ نے قوت و طاقت کو فطرت کا قدرتی قانون
قرار دے کر ہماری دنیا کو تنازع للبقار کا جہنم بنا ڈالا اس فلسفہ نے صرف طاقت ور
ہی کو دنیا میں جینے کا حق دیا ہے یہ خدا نا شناسی کے نتیجے میں پیدا کردہ غلط نظریہ ہے
اس بر خود غلط نظریہ کے مطابق فطرت ظالم و سفاک اور خونخوار مکر وہ چہرے کے ساتھ
ہماری آنکھوں میں نمایاں ہوتی ہے حالانکہ چند جزوی واقعات و حالات اور ہنگامی
حوادثات کے سوا جب فطرت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک دلکش و دل ربا موہنی
صورت میں ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے زبان معرفت میں اس کو یوں ادا کیا جا
سکتا ہے کہ خدا کی شانِ جلالی کا ظہور اس پر وہ کائنات پر گاہے ماہے ہوا کرتا ہے
لیکن اس عالم کے زیادہ تر واقعات خدا کی شانِ جمالی کے مظہر ہیں چنانچہ ہم شاہدانی
یا سائنسی نقطہ نظر سے فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے لیکر

آسمان تک نظام کائنات میں تنازع البتار کے بجائے ایتار و قربانی کا قانون جلوہ فرما ہے اجرام علوی یعنی سارے آسمانی سیارے اور ستارے اپنے انوار تجلیات کو اس خاکدان ارضی یعنی ہمارے زمین پر بغیر کسی فائدہ حاصل کرنے کے ایتار و قربانی کے ماتحت اپنی روشنیاں پھیلا رہے اور رات دن اپنی شعاعوں سے اس دنیا کو جگمگا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہماری زمین میں زندگی کی سرد و جنگ و گرم تیز شعاعیں پھیل رہی ہیں اگر سورج چاند اور ستاروں کی یہ شعاعیں اور گرمی ہماری زمین کو درخشاں نہ کرتیں تو اور دوسرے کروں کی طرح زمین بھی زندگی کی جلوہ فروزیوں سے خالی ہوتی فقط خاک کا تو وہ یا مختلف دھاتوں کا ایک ڈھیر ہوتی کمرۂ آسمانی کی ایتار و قربانی سے یا جلوۂ خدمت گذاری سے یہ ظلمت کدرۂ عالم روشن اور جمادات و نباتات حیوانات پر وہ تخلیق پر جلوہ گر ہوتے چنانچہ جمادات کو دیکھیے تو وہ اپنی گود پھیلائے ہوئے نباتات کی نشوونما کے لیے ایتار و قربانی سے کام لے رہے ہیں اور اپنے افراد کو فنا کر کے بقا کا سامان کر رہے ہیں پھر نباتات حیوانات کے لیے چارہ دانہ آگاہ زندگی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں اور حیوانات بلکہ کل کائنات اس اشرف المخلوقات کے لیے ایتار و قربانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس لیے جو کچھ کہا گیا ہے کہ قدرت کے نظام میں طاقت و کمزور کو دیار ہا یا قوی ضعیف کو اپنے پاؤں تلے کچل رہا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ پوری کائنات ایتار و قربانی کی سنہری زنجیر میں بندھی ہوئی ترقی کی طرف اقدام کر رہی اور درجہ بدرجہ مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتی جا رہی ہے خلاصہ یہ کہ اس بزم کائنات میں ہر ادنیٰ پخلی مخلوق افضل و اعلیٰ مخلوق کے لیے قربانی کا عمل اختیار کیے ہوئے ہیں چنانچہ مٹی نے جب ایتار کیا تو اس میں سے دانہ پھوٹ نکلا اور جمادات نے نباتاتی شکل اختیار کر کے ارتقار کی طرف قدم بڑھایا اور عالم نباتات نے حیوانات کی غذا بن کر صورت حیوانی کی شکل میں ترقی کی اور پھر سب انسان کے کام آکر اور جسم انسانی کا جز بن کر سب سے اعلیٰ ارتقائی شکل اختیار کی فطرت کو جب اس حقیقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو جیسا عرض کیا

گیا یہ پورا کارخانہ تنازع البقاہ کی رزم گاہ نہیں ٹھہرتا بلکہ ایشیا و قربانی کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے البتہ خود انسان کے اندر دوسری مخلوقات کی طرح بے غرضی کے جذبے کے ساتھ خود غرضی کی جیلست بھی کار فرما ہے اور انسان حیوان سے زیادہ خود غرض خود پرست واقع ہوا ہے اس لیے حیات انسانی میں زیادہ کشمکش برپا ہے مغرب نے اپنے مادی فلسفہ کو خود غرضی جیلست کی بنیادوں پر اٹھایا جب کہ مذہب یا روحانیت نے بے غرضی و ایشیا پسندی کو اصل جوہر انسانیت قرار دیا خود غرضی نفرت کو جنم دیتی ہے اور دلوں میں عداوت کا بیج بوتی ہے جب کہ بے غرضی محبت و الفت کو پیدا کرتی اور ہمدردی و ایشیا پسندی غمگساری و قربانی کی دعوت دیتی ہے یہی فرق مادیت اور اصلی روحانیت کے درمیان ہے مشرق کے تمام سچے ادیان و مذہب نے ہمیشہ بے غرضی ایشیا و قربانی اور انسانی رحمہ دلی و ہمدردی کی تعلیمات سے انسانیت کو اونچا اٹھایا جب کہ مغرب کے مادی فلسفہ نے خود غرضی و خود مطلبی خود بینی و خود سری کے جذبات کو بھڑکا کر عالم انسانیت کو دکھتی ہوئی آگ کی بھٹی میں ڈال دیا ہے غنیمت یہ ہے کہ ابھی تک پرانی روحانی قدریں ایشیا و قربانی مخلوق خدا کے ساتھ غم خواری مادیت کے روکر سے پوری طرح کچلنے نہیں پائی ہیں اخلاق انسانی کا تھوڑا بہت وجود پھلی نسلوں سے ورثہ میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے زندگی کی گاڑی چل رہی ہے اس امر کا بجا اندیشہ کیا جا رہا ہے کہ مستقبل میں جس دن خالص مادی فلسفہ کا پروردہ دنیا انسانی ظہور آجائے گا تو انسانیت دور وحشت کی ذقن لگا کر پہونچ جائے گی۔

جس مادی فلسفہ نے انقلاب فرانس برپا کر کے ہر فرد کو کامل آزادی کا تحفہ دیا اس نے آزادانہ تجارت کی نقاب اوڑھ کر ایک طرف نوآبادی نظام کے ذریعہ ایشیا و افریقہ غریب باشندوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا اور دوسری طرف یورپ کے مزدور و کسان اور غریب عوام کی خدمت کے ثمرات کو دونوں مٹھیوں سے لوٹ کر معاشی بحران میں مبتلا کر کے انسانی زندگی کو اجیر کر دیا لہذا اسی سرمایہ داری کے بطن سے اشتراکیت و اشتمالیت نے جنم لیا جس نے فرد کی آزادی کو سلب کر کے

ایک پارٹی کے عہدہ داروں کے ہاتھ میں ملک کے باشندوں کی قسمت دیدی۔

اشتراکیت کا نظریہ

کارل مارکس کمیونزم کے بانی نے اپنے معاشی نظام کے ذریعہ جس غیر فطری نظریہ کو سائنسی روپ دینے کی کوشش کی ہے اس کا پورا ڈھانچہ مادیت پر رکھا گیا ہے اس کا بنیادی تضاد یہ ہے کہ اس نظریہ کی اساس تاریخی جبریت پر رکھی گئی ہے اس تاریخی جبریت کو تسلیم کر لینے کے بعد مزدوروں کے لیے نعرۂ انقلاب دینا بے معنی ہو جاتا ہے تاریخ انسانیت کی اس جبریت کی روشنی میں جو توجیہ بیان کی گئی ہے اس کی بناء پر ہر معاشرہ (سوسائٹی) جبر کی زنجیر میں بندھ کر رہ جاتا ہے اور باب مذاہب پر اشتراکیوں تقدیر پرستی کا اعتراض خود ان پر لوٹ آتا ہے ایک طرف تاریخی جبریت کا دعویٰ دوسری طرف غریبوں کو دعوت انقلاب دینا متضادات ہے مگر اشتراکی دانشور چونکہ عمل و رد عمل کے چکر کو تاریخی عمل قرار دے کر اس امر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تہذیبی ارتقاء و تمدنی نشوونما میں اسی تضاد کا عمل دخل ہے چنانچہ تہذیبی ارتقاء کے جو مدارج قائم کیے گئے ہیں اس کے اندر جاگیردارانہ نظام کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام کا جنم لینا اور سرمایہ دارانہ نظام سے اشتراکی نظام کا برپا ہونا تاریخی ارتقاء کا سائنٹفک عمل انہوں نے بتایا ہے لیکن مارکس و انیگلز کی یہ خیالی ترتیب پہلے ہی مرحلہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی اس لیے کہ یورپ میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب انگلستان ۱۷۸۹ء میں آیا پھر جمہوری تاریخی انقلاب فرانس ۱۷۹۳ء میں برپا ہوا جہاں جاگیردارانہ نظام کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا اور اس سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں مارکس کے تاریخی ارتقاء کے مطابق ان دونوں ملکوں میں اشتراکی نظام قائم ہونا چاہیے تھا لیکن ایک صدی گزر جانے پر بھی ہنوز دلی دورست کا مصداق ہے وہاں آج تک اشتراکیت اپنا پنچہ نہ جما سکی لیکن روس کا وولسپماندہ خطہ جو ابھی جاگیردارانہ دور سے گزر رہا تھا اور اس نے صحیح معنی میں سرمایہ دارانہ نظام کی دہلیز پر بھی قدم

نہ رکھا تھا وہاں بزور شمشیر اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا گیا اور پھر محنت کشوں کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد نے پورے روسی عوام کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ برطانیہ و فرانس کے بارے میں جو تاریخی اندازے مارکس و انگیلس نے لگائے تھے وہ سب دھڑے کے دھڑے رہ گئے یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر کے انگلستان کا صنعتی انقلاب جس نے پورے یورپ بلکہ پوری دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی وہ برطانوی سامراج کی ہندوستانی دولت لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں برپا ہوا۔ برطانوی سامراج پہلا سامراج ہے جس نے ہمارے ملک کی ہزار ہا سال جمع کردہ دولت کو انگلستان پہونچا دیا جس کے بل پر ہزاروں کارخانے قائم ہوئے اور غریبوں کا خون چوس چوس کر سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا اور نہ مسلمان بادشاہوں نے تو ملک کی دولت کو ملک ہی میں رہنے دیا۔

روس میں اشتراکیت کی کامیابی

البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ روس میں انقلاب کیوں کامیاب ہوا اور یورپ کے دوسرے ممالک میں جہاں انقلاب کی کامیابی کے اشتراکیوں کے نظریے کے مطابق تاریخی وجوہ تھے وہاں آج تک انقلاب اپنا پاؤں نہ جما سکا اس کے جواب کے لیے روس کی تاریخی و معاشی حالات کا جائزہ لینا پڑے گا تاریخی یورپ کا ہر واقعہ کار اس امر کو جانتا ہے کہ مغربی ممالک میں ملک روس سے زیادہ مفلوک الحال غریب و پسماندہ صنعتی نظام سے محروم جدید مشین کاری سے کوسوں دور اور کوئی ملک نہ تھا یورپی حکومتوں میں روس کی تعلیمی و صنعتی پسماندگی کا باعث وہاں کا جابرانہ زار شاہی نظام تھا جہاں زار روس جیسا ظالم و جابر عیاش سہنشاہ جاگیردارانہ نظام کے زیر سایہ اپنے چند مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ جاہل و غیر ترقی یافتہ عوام کے خون پسینہ کی کمائی سے گل چھڑے اڑا رہا تھا اور عوام کی اکثریت دانے دانے کو ترس رہی تھی روس کی سرزمین میں

روحانیت و عیسائیت کا جھنڈا بلند کرنے والا راسپوٹین جیسا یہ کاروبار معاش
 سر آسریعاش سب سے بڑا پوپ پادری تھا جس کی شرمناک سیاہ کاریوں کی تفصیل سے
 کاغذ کو سیاہ کرنا بھی باعث شرم ہے ایک طرف زار روس کی چیرہ دستیوں عوام کو کھلتی
 رہیں اور دوسری طرف چرچ زار کی پشت پناہی کرتا اور ظالم شہنشاہیت کے لیے
 کلیا ڈھال بتاتا رہا اس لیے روسی عوام میں شہنشاہیت اور عیسائیت دونوں کے
 خلاف غیض و غضب اور غم و غصہ کا لاوا اندر ہی اندر پکنا رہا روسی دانشوروں نے
 اپنی تحریروں اور لینن اور اس کے ساتھیوں نے اپنی تقریروں سے عوام کے دماغوں
 میں باغیانہ خیالات کو خوب ہوا دی چونکہ عوام کی اکثریت جاہل و ناخواندہ تھی جہالت
 انسان کو خون کے دریا میں بے محابا کودنے پر آمادہ کرتی ہے جاہل آدمی آگے پیچھے کا خیال
 نہیں رکھتا جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے اس لیے وہ آتش فشاں پھٹ پڑا ایسا
 انقلاب برپا ہوا جس نے پرانے دقیانوسی ازکار رفتہ نظام کو بھسم کر دیا خداوندی قدرت
 کا ایسا معجزہ صادر ہوا جس کا خود انقلابیوں کے دماغوں میں تصور نہ تھا۔ لینن جیسے
 انقلابی لیڈر کی سرکردگی میں روس کی کایا پلٹ ہو گئی روسی عوام جو صدیوں سے
 غربت و پسماندگی اور بھکری سے موت و حیات کے جھولے میں جھولتے چلے آ رہے تھے
 ان کے لیے دو وقت کی روٹی اور تن پر کپڑا میسر آنا ہی معراج زندگی تھا روسی نظام
 نے نہ صرف اس کو فراہم کر دیا بلکہ زندگی کی مزید سہولتیں بھی مہیا کر دیں اور محنت
 اور مزدوری کے فارغ اوقات میں کلچرل پروگرام سے حسن بن صلاح کی جنت میں اچھا
 کر حیات انسانی کے مقصد اصلی پر غور و فکر کرنے وقت ہی نہیں دیا لیکن کمیونیزم نے
 روسی قوم کو محنت و عمل کے راستہ پر لگا کر ایک سخت گیر و جابرانہ نظم و نسق کے
 ماتحت ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ روس کی ہمہ جہتی ترقی نے یورپ
 کے دیگر ممالک کو پیچھے ڈال دیا ہے مسلسل انسانی سعی و عمل اور محنت کا یہ کرشمہ
 لوگوں کو روسی نظام کی طرف ضرور کھینچتا ہے مگر لینن کے بعد اسٹالن کا دور اس
 قدر تاریک مہیب ظالمانہ اور بھیانک رہا اس کی تصدیق خود کمیونسٹ پارٹی نے

بعد میں کر دی اور روس کا وہ عظیم ڈکٹیٹر جس نے روس کو اپنی پردہ میں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر اپنا نقشِ عظمت بٹھایا وہ نشانِ عظمت خود اس کی پارٹی نے اپنے ہاتھوں سے مٹا دیا پھر روسی کمیونزم نے یوگوسلاویہ کی پارٹی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ذہنوں میں تازہ ہے اب چینی مارکسزم نے خود روسی نظام قرار دیا ہے ٹروٹسکی اور لینن کا اختلاف اور انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹیوں کا باہمی تصادم اور حال میں روس کے پولینڈ و ہنگری اور افغانستان کے اقدامات نے کمیونزم کے دوسرے چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویت روس میں بیکاری و بے روزگاری کے کھٹن معاشی مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے وہاں کوئی بھوکا نہیں کوئی بے گھر بے در نہیں لیکن اس معاشی خود کفالتی کی قیمت آزادی فکر و خیال آزادی تحریر و تقریر کی محرومی کی صورت میں بہت مہنگی پڑ رہی ہے فرد کو آزادی فکر و عمل سے محروم کر دینا اور کلیت پسند حکومت کے چشم و ابرو کے اشارے پر ہر فرد کو چلنا صدیوں کی آزادی کے لیے انسانی محنت پر پانی پھیر دینا شرفِ انسانی پر بٹالکا دینا ہے مارکس کا قدر زائد

Sin Palu کا نظریہ قابلِ قدر انقلاب آفریں سہی لیکن

اس میں خدا کی سب سے افضل مخلوق انسان کو معاشی جیوان بنا کر رکھ دیا روسی آمریت کے فولادی پنچہ کی گرفت سے ضمیر و خیال ٹھٹھر کر رہ گئے اپنی خوشی رضامندی سے تہذیبی ارتقاء کے لیے اشتراکی نظام روک بن گیا انسانی فکر پر چاروں طرف سے پھرے لگا دیئے گئے اور ذہن انسانی کے ارد گرد ایسا حصار کھینچ دیا گیا ہے جس کے اندر رنگارنگ خواہتاری تہذیبوں کے لیے نشو و نما پانے کی کنجائش نہیں رہتی صدیوں کی بادشاہت و شہنشاہیت کی غلامی سے اس ہمہ جہت آزادی کو انسانیت نے سخت محنت و مشقت اور ہزار ہا قربانیوں سے حاصل کیا تھا اشتراکیت نے پھر اس کو پابہ جولاں اور قیدی بنا دیا روس میں مذہبی آزادی کا اعلان ضرور ہے لیکن کیا سوویت روس کسی بھی مذہب کو تبلیغ یا پرچار کا حق دیتا ہے بڑے سے بڑا

روس نواز دانشور اس کا جواب اثبات میں نہ دے سکے گا البتہ لائبریریٹ کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے خود حکومت روس اس کی نقیب و داعی ہے روس کے اشتراکی نظام کے مقابلہ میں جمہوریت کا نظام اجتماعی حدود کے اندر ہمہ جہتی آزادی کا تحفہ انسانیت کو پیش کرتا ہے لیکن ریاست کے ہر فرد کی معاشی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا آزاد تجارت کے پردے میں ایشیا، افریقہ کی غریب اقوام کو جمہوریت نے دونوں ہاتھوں سے جس طرح لوٹا ہے پچھلی دو صدیوں کی تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے جمہوری سرمایہ دارانہ نظام میں ساری دولت چند چالاک و بے رحم اور خود غرض انسانوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجاتی ہے اور وہ استحصال یعنی ناجائز طریقوں سے ملک کی دولت پر قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں جس طرح روس میں کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی پوری باگ ڈور آجاتی ہے غرض دونوں نظاموں میں غریب و مزدور کی محنت کا پھل یا اصل محنت کا کھن مخصوص افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح پوری انسانیت چکی کے دو پاٹوں کی سیچ پستی چلی جا رہی ہے۔

شاہ صاحب کا انقلابی پروگرام

اس دل خراش و جگر پاش و المناک صورت حال کا جس شدت و غمگینی کے ساتھ آج احساس کیا جا رہا ہے اور انسانیت کے سچے ہمدرد مخلوق خدا کی مفلوک الحال اور شکستہ حالی سے جس قدر آج افسردہ و ملول خاطر ہیں آج سے ڈیڑھ سو صدی پہلے اس دور کے مفکرین میں احساس تک نہ تھا حکیم الہند حجتہ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) پہلے اسلامی مفکر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اس صورت حال کا جائزہ لیا جب کہ کارل مارکس کے مینی فیسٹو میں ایک صدی اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء میں اٹھارہ سو سال باقی تھے اشتراکی مینی فیسٹو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا اور پہلی انٹرنیشنل کانفرنس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوئی اس حساب سے شاہ صاحب پہلی انٹرنیشنل کانفرنس سے ایک سو دس سال اور مارکس کے اعلان اشتراکیت سے پچاسی سال پہلے وصال فرما

چکے تھے (تحریک شاہ ولی اللہ ص ۶۲)

اس وقت جیسا کہ لکھا جا چکا مغل شہنشاہیت کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا اور ناخلف حکمران عیش و عشرت کے شبتاں میں محو خواب تھے شاہ صاحب کا قلب و دماغ بیداران کی روح پاک خدا اور اس کی مخلوق کی محبت میں سرشار اس پر خطر ماحول میں انسانیت کے لیے راہ نجات کے لیے تلاش میں تھی شاہ صاحب نے جو انقلابی پروگرام عالم انسانیت کے لیے تجویز کیا اس کو شخصی حکومت کی جگہ بندیوں کی وجہ سے باقاعدہ منشور (مینی فیسٹو) کی شکل میں پیش نہ کر سکے لیکن اپنی مختلف کتابوں حجۃ اللہ البالغہ، بدور بازغہ وغیرہ میں ان انقلابی دفعات کو حقوق انسانی کے نام سے پھیلا دیا ہے شاہ صاحب کا یہ انقلابی اسلامی فکر انسانی قدروں پر مبنی ہے وہ پوری انسانیت کے لیے ایسے معتدل و خوشگوار انقلاب کے داعی ہیں جس کا فائدہ ہر فرد انسانی کو پہونچ سکے حضرت شاہ صاحب ایک فرد کو انسان صغیر اور پوری انسانیت کو انسان کبیر قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک پوری انسانیت کو اتحاد کی لڑی میں پروانے والا ہر عمل اور جملہ بنی آدم کو ایک کرنے میں مدد دینے والا ہر قدم زندگی کو ترقی کی منزل تک پہونچانے والا عمل و اقدام ہے اسی طرح عالمی امن و امان اور باہمی ربط و اتصال کو قطع کرنے والا ہر سلسلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی جسم میں کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے جس کو صدیوں پہلے شیراز سعدی شیرازی نے یوں فرمایا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگرند = کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چوں عضوئے بدرد آور در در و زکارہ دگر عضو ہار نہ ماند قرار
شاہ صاحب اس کے قائل داعی ہیں کہ قرآنی اصول پر جو انقلاب برپا ہوگا اس سے وہی نتائج ہر دور ہر عہد میں پیدا ہوں گے جو قرن اول یعنی اسلام کی پہلی صدی میں پیدا ہوئے اس کے اندر کسی آدمی یا زمانے کی خصوصیت نہیں۔

دلی الہی حکمت اور اس کے اصول

دلی الہی حکمت جو اسلامی انقلاب کی عالمگیر دعوت پوری انسانیت کو دیتی ہے اس کے اصل اصول دو ہیں (۱) قرآنی حکمتِ عملی (۲) اقتصادی توازن و مساوات۔

قرآنی حکمتِ عملی سے مراد انسانی زندگی کا قرآنی لائحہ عمل ہے شاہ صاحب کے نزدیک قرآن کا معجزہ صرف اس کی بلاغت میں منحصر نہیں ہے جس کے لیے اہل عرب کو حیلینج دیا گیا تھا عربوں کے لیے قرآنی بلاغت کا سمجھنا اور اس کے مقامِ اعجاز کو پہچاننا اہل زبان ہونے کی بنا پر زیادہ دشوار نہیں تھا لیکن اہل عجم کا اس معجزانہ بلاغت کی تہہ تک پہنچنا محال نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے اس لیے شاہ صاحب اس کے قائل ہیں قرآنی حکمتِ عملی میں اس کا اعجاز مضمون قرآن حکیم نے تمام انسانوں کے لیے عملی زندگی کا جو نقشہ تجویز کیا ہے وہی سارے عالم کی خوشحالی و فارغِ البالی تعلقاتِ باہمی کی خوشگواری و سازگاری اور عالمگیر امن و امان کی بادِ بہاری کی ضمانت ہے کیونکہ ہر مشین کا موجد جب اپنی ایجاد کو بازار میں پہنچاتا ہے تو اس مشین کا طریقہ استعمال اور اس کے متعلق جملہ ہدایات کا نسخہ بھی ساتھ میں دیتا ہے اور ان ہی ہدایات پر عمل اس مشین کی پائیداری اور مدتِ مقررہ تک مفید اور کارآمد رہنے کی گارنٹی ہوتا ہے۔

قرآنی رہنما اصول:-

قرآن کریم کی حکمت کی روشنی میں جو حقیقت ہم پر کھلی وہ یہ ہے کہ قرآن نے انسانی کی کامیاب انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رہنما اصول عطا فرمائے ہیں خدا اور بندے اور بندوں، بندوں کے درمیان ظاہری و باطنی تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کے خطوط و حدود متعین فرماتے ہیں اور حیاتِ انسانی کے خاکے میں واضح و روشن لکیریں کھینچ دی ہیں۔

(۱) خداوند قدوس کی ذات و صفات اور جملہ کمالات کے متعلق شایانِ شان

صحیح اور سچے خیالات دل و دماغ میں بٹھانے اور ان کو قائم رکھنے کا نام ایمان و عرفان ہے جس کو شریعت میں عقائد سے تعبیر کیا جاتا ہے عقائد کی صحت ہی دین اور زندگی اصل بنیاد ہے۔

(۲) پھر خدا کے ساتھ اس سچے عقیدے کے نتیجے میں خدا کی عظمت و محبت کے ساتھ جو نیاز مندانہ عملی تعلق اپنے معبود کے آگے سرنگندگی و فرمانبرداری کی شکل میں ظہور میں آتا ہے اس کا نام عبادات ہے جو اسلام کا دوسرا عظیم رکن ہے۔

(۳) نفس انسانی جس کی فطرت میں خیر و شر، نیک و بد دونوں استعدادیں ودیعت ہیں اس کے اندر نیکی کے حصول کے لیے فضائل سے آراستگی و پیراستگی اور برائی سے بچنے کے لیے کُرذائل سے پاکی و صفائی اس کو تہذیب نفس تہصیفہ قلب اور تزکیہ روح سے یاد کیا جاتا ہے اس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

(۴) پھر فرد کا اپنی زندگی میں ان اخلاقی کمالات یعنی اچھی خصلتوں سے آراستہ کر کے اور بری عادتوں سے خود کو پاک صاف رکھ کر زندگی گزارنا معشیت کہلاتا ہے جو اسلام کا چوتھا رکن ہے۔

(۵) انفرادی زندگی کی تہذیب و اصلاح کے ساتھ چونکہ انسان اجتماعیت پسند ہے اس لیے اپنے ہم مذہب و غیر مذہب تمام انسانوں کے ساتھ صحیح حدود کے اندر تعلقات و معاملات قائم رکھنے کو معاشرت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اعتقادات، عبادات، اخلاقیات اور معاشرت، اور معشیت دین کے پاکیزہ درخت کے پانچ شعبے ہیں جو قرآنی تعلیمات کے اصل موضوع ہیں لہذا جو شخص اس عالم میں قرآنی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزارے گا تو اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی و سرخوردگی کی خوشخبری ہے اور جو انسان قرآنی زندگی کے نقشے کے خلاف عملی زندگی اختیار کرے گا تو اس عالم میں سکون روحانی، سکون قلبی، اور دل جمعی سے محروم ہوگا اور آخرت میں سخت عذاب و پریشانی میں مبتلا ہوگا جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بشت ان پنجگانہ اصول کی تعلیم و ہدایت ہے قرآن حکیم نے خدا کی آخری کتاب

کی حیثیت سے زندگی کے ان اصولوں کو واضح اور روشن آیات میں کامل مکمل طور پر قیامت تک کے لیے انسانیت کے سامنے رکھ دیا ہے۔

(۶) حکمت ولی اللہی کا دوسرا اصل الاصول معاشرت و معشیت اور عام انسانی سوسائٹی میں معاشرتی توازن اور معتدل اقتصادی نظام ہے۔

اسلام کے پچھلے بلند پایہ مفکروں اور عالی قدر مصلحوں نے اخلاقیات انسانی کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا اور فرد کی اصلاح تخلیہ بالفضائل اور تخلیہ الرزائل یعنی عمدہ خوبیوں کے حصول اور بری خصلتوں سے صفائی پیدا کرنے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں خصوصیت سے صوفیائے اسلام نے نفس انسانی کی تہذیب، اخلاق الہی کی تحصیل اور روح و دل کی اصلاح کے لیے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں وہ قابلِ فخر ہیں ان اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ مختلف اقوام عالم کے سماجی نظاموں سے ٹکراتا ہوا اپنی امتیازی خصوصیات کی بناء پر نشیب و فراز سے گذرتا رہا لیکن انسان کے اندر جو ایک معاشی حیوان چھپا ہوا ہے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی انسانیت کے لیے معاشی مسئلہ جو ریڑھ کی ہڈی کی طرح ایک ضروری و ناگزیر مسئلہ ہے اس کو بیشتر ارباب فکر نے درخور اعتبار نہ سمجھا۔

اقتصادی توازن ولی اللہی حکمت کی روشنی میں

عبادات و اخلاقیات کا اقتصادیات یا معاشیات سے کیا تعلق ہے اس کی اہمیت پر سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے روشنی ڈالی اور اس اہم بنیادی مسئلہ کو اسلامی احکام کی روشنی میں اپنا موضوع فکر بنایا اخلاق و عبادات و معاشیات کے باہمی رشتہ کو واضح کاف انداز میں، بیان کیا چنانچہ شاہ صاحبؒ حجۃ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں "اگر کسی قوم میں تمدنی ترقیات کا سلسلہ برابر قائم رہے تو وہ صنعت و حرفت میں درجہ کمال پر پہنچ جاتی ہے اس کے بعد حکمران طبقہ عیش و عشرت اسباب و تفاخر و زینت کو اپنا شعار بنائے تو اس کا بوجھ قوم کے دیگر طبقات پر اس قدر بڑھ جائیگا

کہ معاشرے کی اکثریت حیوانوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگی جب جبر و زبردستی اور
بیجا دباؤت قوم کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جاتا ہے تو انسانیت کے اجتماعی اخلاق
برباد ہو جاتے ہیں اس وقت وہ گدھوں بیلوں کی طرح روزی حاصل کرنے یا روٹی
کمانے کے لیے مجبور و مضطر ہو جاتی ہے جب بھی انسانیت اس مصیبت عظمیٰ میں گرفتار
ہو جاتی ہے تو قدرت الہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت
کا بوجھ اتار دیتی ہے چنانچہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں نے عیش پرستی و عشرت پسندی کا یہی
طریقہ اختیار کر رکھا تھا اس مرض کو جو جسم انسانی میں پھیل گیا تھا دور کرنے کے لیے خدا
نبی امی (فداۃ ابی دانی) کو امیوں (عربوں) میں مبعوث فرمایا فرعون کی ہلاکت اور قیصر
وکسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لازم نبوت سے سمجھی جاتی ہے (حجۃ اللہ بالغلہ) آگے
کے ایک فقرہ میں اپنے وقت کی نہایت کی اجتماعی حکومت کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا ہے
”ہماری حکومتوں کے

بادشاہوں کے حالات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں ان کے بعد ان پچھلے بادشاہوں
کے قصوں کی ضرورت نہیں۔“

شاہ صاحب انسان کی حیات اجتماعی کے لیے حکومت عادلہ و خلافت کو ایک
ناگزیر ضرورت مانتے ہیں وہ فرماتے ہیں ”انسان خطرناک ہیت اجتماعیہ کا محتاج ہے یہ
انسانی ترقی کا پہلا زینہ ہے اسی ہیت اجتماعی کو قواعد و ضوابط کی روشنی میں قائم
رکھنے کا دوسرا نام حکومت ہے اچھی حکومت قائم کرنا انسانی ترقی کا دوسرا قدم ہے
جس جگہ یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں وہ مدینیت فاضلہ ہے ورنہ مدینیت ناقصہ
چھوٹی سی آبادی میں مختصر ہیت اجتماعیہ جیسے جرگہ یا پنچایت سے کام چل جاتا ہے
لیکن جہاں شہریت جلوہ پرداز ہو دانشور شخصیتیں مل بیٹھ کر معاملات کو طے
کرتی ہیں جس کو دارالشوریٰ (پارلیمنٹ) کہا جاتا ہے یہی ارباب حل و عقد شوروی
نظام کے ارکان ہوتے ہیں اسلام اسی شوروی نظام کا داعی ہے جمیعت مرکزیہ یا
خلافت اسی نظام کی معراج جس کا مثالی نمونہ خلافت راشدہ خصوصیت سے

شیخین کا عہد سعادت مہد ہے (ازالۃ التحفائر) شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں اور شاہ اسماعیل شمس نے اپنی کتاب عبقات، اور منصب امامت میں خلافت و ملکیت پر فاضلانہ و عالمانہ بحث کی ہے جن بنیادوں پر اسلام کا نظام سلطنت تشکیل پاکر پوری انسانیت کے لیے فلاح و بہبود خوشحالی و قارغ البالی کا ضامن بن سکتا ہے جس سے اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبے فروغ پاتے اور انسانی قافلہ منزل ترقی کی طرف رواں دواں ہوتا ہے معاش کا رشتہ معاد سے جڑا ہوا ہے جیسے دنیا سے آخرت جڑی ہوئی ہے اگر اقتصادی نظام ہی درہم برہم ہو جائے اور انسان کی بنیادی ضرورتیں تشنہ تکمیل رہ جائیں تو انسانی زندگی ہی ٹھٹھ کر رہ جائے گی اور انسانیت کے بلند مقامات (معرفت و عبادت و اخلاق عالیہ) سے انسان محروم ہو جائے گا اقتصادی نظام کا توازن ہی اخلاق انسانی خوشگواہی و استواری پیدا کرنے کا باعث ہے تہذیب نفس کے بغیر اخلاق کی درستگی ممکن نہیں جب معاش کا نظام درست نہ ہوگا تو معاد کیونکر ہوگا تکمیل اخلاق سے عالم برزخ حشر و نشر اور انسان کی اصل زندگی سنور جائے گی جو اس کو جنت کا حقدار بنادے گی یہی سفر حیات کی آخری منزل ہے وہاں انسان اپنے پروردگار (جو محبوب حقیقی بھی ہے) کی لذت دیدار سے بہرہ یاب ہوگا انسان کی حیات دنیاوی کو مرحلہ بمرحلہ طے کراے ترقی آخری منزل تک پہنچانا نبوت کا مقصد اصلی ہے اس لیے نبوت حیات انسانی کے لیے ایک فطری ضرورت بن جاتی ہے (بدور بارز غصہ)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان کے باطنی امراض کا علاج روحانی و باطنی طبیب کے بغیر ممکن نہیں ان کو ہی رسول و نبی کہا ہے چونکہ دین تو ایک ہے لیکن اس کے شرائع (ظاہری طور طریق رسوم و روایات) ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اَللّٰہُ جَعَلَنَا مِنْكُمْ شُرَعًا وَ مَخَاجَا۔ (قرآن حکیم) اس لیے شاہ صاحب کے دعوتی اصول عالمگیر اقدار انسانی پر مبنی ہے ان کا زور مذہب کے رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر ہے قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ اس کی روح عدل و انصاف پر ہے۔

اسلامی معاشیات کا معتدل نظام

حکمت ولی اللہی کی روشنی میں ہم نے معاشیات اسلامی کے متوازن نظام کو جس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے ان خیالات کو اپنی عبارت میں ہم یہاں ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے جو نظام قدرت نے زمین سے لے کر آسمان تک قائم فرمایا ہے۔ حیات انسانی میں اس کی جلوہ پیرائی کے لیے اسلامی احکام دیئے گئے ہیں فطرت کا پورا نظام عدل و اعتدال کی بنیاد پر قائم ہے خدائے احسن الخالقین کا تخلیقی کمال ہر وجود کے اندر توازن یعنی ترازو کے دونوں پلوؤں کے برابر رکھنے میں مضمر ہے اس کے اندر ادھر ادھر جھکاؤ نہیں اور جہاں جھکاؤ پیدا ہوا تو وہ شے یا تو اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے یا وہ وجود اپنے حسن و خوبی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اسی کمال اعتدال سے فطرت میں حسن و خوبی جلوہ گر ہوتی ہے یہ قانون عدل و اعتدال اجرام علوی سے لے کر اجسام سفلی تک یکساں طور پر کار فرما ہے اجرام علوی یعنی آسمانی کروں میں ہر کرہ اپنی کشش ثقل کو اعتدال کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑا ہوا خود کو تھامے ہوئے اور سنبھالے ہوئے اور ہر سیارہ دوسرے سیارے کو اپنے مدار میں داخل ہونے سے روکے ہوئے ہے اگر نظام فلکی میں یہ کشش ثقل جو قانون عدل کی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے ختم ہو جائے تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے اسی طرح اجسام سفلی یعنی ہماری زمین بھی اسی قانون عدل پر اپنے دائرہ میں

گردش کرتی ہوئی فضا میں قائم و برقرار ہے ہماری کائنات میں حیات و زندگی کی جلوہ آرائی بھی اسی قانون اعتدال کی مرہون منت ہے چنانچہ جب مختلف عناصر ایک مخصوص نظم و اعتدال کے ساتھ اجسام میں جلوہ فرما ہوتے ہیں تو زندگی سطح عالم پر چہرہ پرداز ہوتی ہے پھر ہر زندہ مخلوق کے اندر جب تک اخلاط اور بعد خون بلغم سودا صفرا میں اعتدال قائم رہتا ہے تو صحت و تندرستی زندگی مالا مال ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر فتور اور کمی یا بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے تو ہر جاندار نعمت صحت سے محروم ہو کر بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کے اندر قدرت کی ودیعت کی ہوئی مختلف قوتیں دقوت شہویہ، قوت غصبیہ، قوت ملکوئیہ جب اعتدال کا رنگ اختیار کرتی ہیں تو اس سے اخلاق فاضلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ اخلاق میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ ہر فضیلت دور ذہلیتوں کی درمیانی حالت سے پیدا ہوتی ہے یعنی انسانی خصائل میں حسن و خوبی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ دو ادنیٰ ذہلیتوں کی درمیانی خصلت کو اختیار کیا جائے جیسے سخاوت و فیاضی اس کا ایک کنارہ بخل اور کنجوسی ہے اور دوسرا کنارہ اسراف و فضول خرچی ہے انسان ان دونوں بُری خصلتوں کے درمیان معتدل خصلت کا نام سخاوت اور جود و کرم ہے اسی طرح جبن (نامزدی) اور فروسیت (درد زندگی) کی درمیانی معتدل خصلت شجاعت و بہادری سے موسوم ہوتی ہے یہی حال تمام فضائل کا ہے۔

یہ اعتدال جب اعضائے جسمانی میں موزنیت کے ساتھ جلوہ ہوتا ہے تو اس کو حسن و جمال سے اور جب آواز میں پیدا ہوتا ہے تو اس کو نغمہ و زمزمہ سے اور جب جسمانی حرکات و سکنات میں ہوتا ہے تو اس کو عشوہ و ادا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب الفاظ و کلمات جملوں اور فقر وں میں یہ اعتدال رونما ہوتا ہے تو اس کو فصاحت و بلاغت کہتے ہیں اور جب ایک نقاش اپنے مو قلم سے خطوط اور دائروں کی کشش میں نظم و اعتدال کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے نقوش میں

رنگ بھرتا ہے تو فن و ہنر د آرٹ) عالم وجود میں آتا ہے۔

غرض بزم کائنات اور چمنستان حیات میں اس نظم و اعتدال کی جلوہ گری سے دلکشی و زیبائی دل آویزی و رعنائی پیدا ہوتی ہے جو قانون عالم کبیر (کائنات) میں کار فرما ہے وہی عالم صغیر (انسان) میں بھی جلوہ آتا ہے

جس طرح اخلاق انسانی کی حسن و خوبی اس کی متضاد و گونا گوں قوتوں کو راہ اعتدال پر رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں اسی طرح حسن معیشت بھی اس سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہے اسلام کا اقتصادی نظام بھی اسی قانون فطرت کی ایک شاخ ہے چنانچہ اسلام نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے مال و دولت اور جائیداد میں حق ملکیت کو تو تسلیم کیا ہے لیکن چند اصول و ضوابط کے ذریعہ اس کو محدود کر دیا گیا ہے اشتراکی نظام کی طرح نہ تو نفس ملکیت کا انکار کیا اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ملکیت کو کھلی چھٹی دے دی گئی معاشیات انسانی کے جسم میں جو سب سے بڑا سرطان د سودی کار و بار) چھپا ہوا پوری انسانیت کو تباہ و برباد کر رہا ہے اسلام نے سب سے پہلے ہی اس کی حرمت کے ذریعہ جڑ کاٹ دی پھر ہمارے نزدیک ارتکاز اکتناز و احتکار ان تین لفظوں کے اندر اسلام کی اقتصادیات چھپی ہوئی ہے۔

ارتکاز جو اسلامی معیشت کا اصل الاصول کیلئے یگوون ذؤلۃ بئین الّا غنیاء کی قرآنی آیت سے واضح ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے تقسیم دولت کے جو احکام عطا فرمائے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ کل مال دولت چند مالداروں کی مٹھیوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے گویا اسلام مال دولت کو پورے معاشرے کے اندر مسلسل گردش میں رکھنے کا قاتل ہے ارتکاز یعنی مال کو کسی ایک ہاتھ میں مرکوز ہو جانے کا قاتل نہیں۔

دوسرے اکتناز یعنی سرمایہ معاشرے میں جمع ہو کر اکٹھا نہ ہونے دیا جائے اور احتکار مستقبل میں نفع حاصل کرنے کے لیے اشیاء کا ذخیرہ کرنا

اس کو قابل لعنت ٹھہرایا ہے یہ تینوں علتیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ بنیادیں ہیں اسلام نے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور افراد کے پاس جمع ہونے والی دولت کو عوام میں تقسیم کر دینے کے لیے مختلف شکلیں تجویز کیں سب سے پہلے اسلام کے اصول میراث (ترکہ) نے کسی ایک فرد کے پاس دولت کے مرکوز ہونے کی جڑ کاٹ دی جس طرح دوسرے سماجوں میں بڑا بیٹا خاندان کی ساری دولت سمیٹ کر مالک بن بیٹھتا ہے اور وہ دولت خاندان کے افراد میں پھیلنے نہیں پاتی اسلام نے اس پر ممانعت کی ہر لگا دی پھر جو مال و دولت میراث یا خود اپنی کمائی سے حاصل ہوا اس کو زکوٰۃ و صدقات و خیرات کے ذریعہ مستحقین یعنی فقراء مساکین پر تقسیم کر دیا چاندی سونے پر چالیسواں حصہ چاہی اور نہری زمینوں کی پیداوار پر بیستواں حصہ اور بارانی زمینوں کی پیداوار پر دسواں حصہ مقرر کر کے اس کو معاشرے کے کمزور طبقوں میں پھیلا دیا جو خود رو قدرتی جنگلاتی و معدنیاتی دولت ہے ان پر عوام کے حق کو تسلیم کیا اور اس کا ایک مقررہ حصہ فقراء کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم دیدیا اس کے بعد پیغمبر اسلام نے فرمایا: اَن فِی الْمَالِ حَقًّا سَوَی الْزَّكَاةِ یعنی مال و دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی فقیر و مسکین اور مستحقین کا مزید حق ہے اسلام استحصال یعنی غریب و مزدور کی محنت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے یا تجارتی مال میں غبن فاحش یعنی بے جا فائدہ اٹھانے کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

اسلام فرد کے اخلاقی ارتقاء کے لیے نفس ملکیت کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے سخاوت و فیاضی داد و دہش اور بخشش کا فطری جذبہ کو نشوونما دی جاتے تو اس کے اندر جذبہ ترقی و مسابقت کا جو قدرتی ولولہ ہے مال و دولت خرچ کرا کے ایک دوسرے سے بڑھنے کے مواقع ہٹا کتے جاتیں۔ چونکہ حرص و بخل بھی انسان کے مزاج میں ہے قرآن میں لوگوں کے اندر حرص و بخل کو رکھ دیا گیا ہے اور جو شخص بھی اپنے نفس کو حرص و بخل سے بچالے جائے

وہی کامیاب ہے (التغابن القرآن) قرآن نے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا اس کثرت سے حکم دیا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے سرمایہ داری کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے اس لیے صحابہ کرامؓ کو سوال کرنا پڑا کہ آیا مال رکھا بھی جاسکتا ہے۔ ”آپ سے پوچھتے ہیں کتنا خرچ کرنا چاہیے تو آپ کہہ دیں کہ اپنی ضرورت سے ہر ذات دچیز خدا کی راہ میں دے دو (البقرہ) عفو کی ایک تفسیر صوفیانہ جو حضرت ابوذر غفاری سے منقول ہے کہ ایک وقت کا کھانا اور پہننے کا کپڑا اپنے پاس رکھا جائے باقی سب راہ خدا میں دے دیا جائے۔

پھر اسلام دولت کی تقسیم یا ملکیت کی تحدید پر اس قدر زور نہیں دیتا جس قدر اُن افراد کے اخلاق کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے جن کے ہاتھوں میں دولت آجاتی ہے اگر قانون کے ذریعہ دولت کی تقسیم اور تحدید پر پابندی لگا دی جائے لیکن وہ لوگ جو حرص و بخل کے پیکر اور چالاکی و ہوشیاری کے حامل ہوں وہ اس قانون کو حسب منشاء ڈھال لیں گے اور قانون دھرا کا دھرا رہ جائے گا مال و دولت یا اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صلاحیت و طاقت سرمایہ داری کی شکل میں یا پارٹی کی صورت میں استحصال کی صورت نکال لیں گے عوام دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتیں گے۔ غرض اشتراکی نظام ہو یا جمہوری نظام مخصوص افراد کے ہاتھوں میں دولت سمٹ کر رہ جاتی ہے جو سامانِ عیش و عشرت ان کے لیے مہیا ہے عوام کو ان کا عشو و عشیر بھی میسر نہیں ہوتا نہ تو جبری غربت مسئلہ کا حل ہے اور نہ دولت کو کھلی چھٹی دینے سے یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے خلاصہ یہ کہ اسلام نہ تو سرمایہ دی (کیپٹلزم) کی طرح بے قید مطلق العنان ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور نہ اشتراکی نظام کیونز م کی طرح نفس ملکیت کا انکار ہی ہے جو اعتدال کی راہ فطرت کے ہر گوشہ میں جاری و ساری ہے وہی اسلام کے معاشی نظام میں ہے اسلام کی اخلاقی معاشرتی تعلیم جن روحانی قدروں پر رکھی گئی ہے وہ انسانوں کے خود غرضی سے ہٹا کر بے غرضی و بے لوثی و ایثار پسندی کی طرف لے جاتی اور انسانوں میں

باہمی انس و محبت کو پروان چڑھاتی اور طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکانے کے بجائے
 بین الانسانی ہمدردی کے جذبہ کو ابھار کر پوری انسانیت کو بل جل کر رہنے کی دعوت
 دیتی ہے اس کا معاشی نظام اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے

اقترابات و اتفاقات

امام ولی اللہ دہلوی نے اپنی حکمت ربانی یا فکر الہامی میں انسانی زندگی
 کے انفرادی و اجتماعی تقاضوں کے لیے اقترابات اور اتفاقات کی اصطلاحات
 وضع فرمائی ہیں

اقترابات جس کا مطلب قرب خداوندی ہے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے ارشاد
 فرماتے ہیں کہ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ انسان اپنے ریاضت و مجاہدہ سے اس
 مقام پر پہنچ جاتے کہ انسانی خواص کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں گم ہو جاتے
 جیسے کہ بعض روحانی مذاہب میں اسی کو مقصود حیات یا راہ نجات بتایا گیا ہے
 جیسے *بدھ مت* یا *عیسائیت*، لیکن دوسرا تقرب الی اللہ کا راستہ جو صحیح راستہ
 ہے کہ انسان اپنے اعضاء و جوارح کی صحیح تربیت کرے اور انسانیت کے جامعہ میں
 رہتے ہوئے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے شریعت کے اس شعبہ کو عبادت
 سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کا مقصد
 ہے۔

(۲) اتفاقات سے مراد اجتماعی ادارے ہیں یعنی انسان کی اجتماعی زندگی گزارنے
 کے لیے جن قوانین و ضوابط کی ضرورت ہے وہ عمومی ہیں فطرت انسانی کے قواعد
 پر پورے اثر میں خواہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے سے الگ ہوں۔
 کیوں کہ ہر قوم خاص خاص عادتیں اور خاص خاص خصلتیں ہوتی ہیں یوں تو
 انسانی فطرت اپنے لیے اتفاق یعنی اجتماعی ادارے کی تشکیل کا تقاضہ کرتی ہے
 جو ترقی انسانی کا پہلا درجہ ہے دوسرے درجہ میں تجربیاتی علوم (سائنس) اور

صحیح اخلاق پیدا ہوتے ہیں (بدور بارغہ ص ۵۱) پھر اسی کتاب بدور بارغہ میں شاہ صاحب نے اقترابات و اتفاقات کے باہمی ربط کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے ارشاد فرماتے ہیں وہ تمام اتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ گل کے گل اقترابات یعنی خدا تک پہنچنے کے ذرائع و وسائل ہیں۔ حق شناسی و حق طلبی اور خدا رسی فطرت انسانی میں روز ازل سے ودیعت ہیں جو عبادات و احسان اور برائیوں سے احتراز پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے کلی قاعدے تو ایک ہیں مگر ان کی شکلیں الگ الگ ہیں جیسے نکاح کا اعلان ڈھول باجے کی شکل میں کچھ لوگوں نے کیا لیکن مذہب اسلام نے گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کرنے کے اعلان کو ضروری کھڑا یا اصل مقصد نکاح سے ایک عورت کا ایک مرد کے لیے تعین کہ دوسرا مرد اس کے اندر دخیل نہ ہو سکے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ملت حنیفی کے نقطہ نظر سے ہم نے اقترابات و اتفاقات کی شکلیں بطور مثال پیش کی ہیں وہ ان دو شکلوں تک محدود نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اصل معاملہ کا تعلق ہے کوئی ملت کوئی مذہب ہی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو جو شخص بھی ان کہے جانے کا مستحق ہے وہ اصل حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہے کہ وہ احکام کو بجا نہ لائے جھگڑا اصل حقیقت میں نہیں ہوتا نزاع اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے میں پیدا ہوتا ہے (بدور بارغہ ص ۱۸)

مذہب کے اصل الاصول

شاہ صاحب اپنی بالغ نظری و ژرف نگاری سے مذاہب عالم کے اصل الاصول تک پہنچ کر اس کی تشریح عالم گیر انسانی قدروں کی بنیاد پر کرتے ہیں چنانچہ اپنی کتاب لمعات میں لکھتے ہیں کہ جو اصول تمام مذاہب کے نقطہ مشترک

بن سکتے ہیں وہ چار اصول ہیں (۱) خدا پرستی (۲) عدل و انصاف (۳) صحت و صفائی (۴) تربیت نفس۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ہر مذہب کا فرض ہے کہ ان چار مقاصد کے لیے انسانوں کی رہنمائی کرے گو مذہب کے طریقے علیحدہ علیحدہ ہوں لیکن ہر مذہب کی یہی کوشش ہونا چاہیے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی راہ لوگوں کو بتائے۔ نیکوکاروں کی پہچان خدا پرستی ہے نہ کہ رسوم پرستی بہر حال ہمارے نزدیک شاہ صاحبؒ کے فکر کی سب سے بڑی خصوصیت حیات انسانی میں اقتصادی و معاشی توازن کا نظریہ ہے ان کی یہ فکر روح عصر سے ہم آہنگ ہے مغربی مفکرین کو جب کہ اس عدم معاشی مساوات کا احساس تک نہ ہوا تھا مشرق کے ایک حکیم صوفی نے اپنے الہام سے نہ صرف انسانیت کے اندر پھیلی ہوئی اس مرض کی تشخیص کی بلکہ اس مہلک و مزمن بیماری کے لیے نسخہ شفا بھی تجویز فرمایا شاہ صاحبؒ اپنے عقیدے کو اپنی کتابوں میں بار بار دوہراتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب ہی اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے شاہ صاحبؒ تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح رسول اللہؐ کے زمانے میں قیصر و کسریٰ نے متمدن دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور قدرت الہی نے اس مریضانہ نظام کو ختم کر دیا اسی طرح آج کی حکمران سوسائٹی بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہے اور اس کا مٹنا یقینی ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

شاہ صاحبؒ نے اس عقیدے کو اپنی مختلف کتابوں میں بار بار دوہرایا ہے جس کا نقل کرنا طویل عمل ہے لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک قرآن کی انقلابی دعوت اس وقت تک عالم میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور ہماجر بن کے معاشی و معاشرتی طرز عمل کو نمونہ حیات نہ بنایا جائے جن کو قرآن کریم نے

اَلْسَابِقُونَ اِلَّا وَتُوْنُ كَالْقُب دیا ہے اور جنہوں نے اپنے گھر بار اور تمام کاروبار کو اعلیٰ مقصد کے لیے ٹھکرا دیا ان صحابہؓ کی زندگیاں ہمارے لیے شمع ہدایت ہیں شاہ صاحبؒ کے نزدیک صحابہؓ کی انقلابی روح اور ان کی سیرت ایک معیار اور مثالی نمونہ ہے۔
(تحریر ص ۶۱)

مرزا مظہر جان جاناں کے تصدیقی کلمات

شاہ صاحبؒ کے یہ انقلابی نظریات اس دور کے خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے وہ عہد مستقبل سے تعلق رکھتے تھے آج کل کی زبان میں شاہ صاحبؒ وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے بقول غالبؒ

ہوں گرمی نشاۃ تصور سے نغمہ سچ
میں عندلیب گلشن تا افسریدہ ہوں

اس لیے ہم ان افکار پر اس عہد کے روشن ضمیر و صاحب دل بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے تصدیقی کلمات نقل کرتے ہیں۔ ”حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نیا طریقہ بیان معارف و علوم کے اسرار کی گہرائیوں میں ان کی تحقیقات کا خاص طرز ہے وہ علمائے ربانیین میں سے ہیں ایسے محقق و صوفی جو علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہوں اور ایسے علوم بیان کتے ہوں دور ماضی میں بھی کم ہوئے ہیں۔ (کلمات طیبات ص ۸۳-۸۴)

اب ہم شاہ صاحبؒ کے انقلابی نظریات کو بصورت دفعات تحریر کرتے ہیں۔
شاہ صاحبؒ نے حرمین شریفین کا سفر ۱۱۷۳ھ میں کیا وہاں سے واپسی پر محسوس کر لیا کہ تمام خرابیوں کی بنیاد وہ نظام حیات ہے جو مغل حکومت کے زیر سایہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر چھایا ہوا ہے اس لیے ۱۱۷۳ھ میں ذریعہ اہمام بوسیدہ نظام کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کا اظہار فرمایا اور اس بات کا اشارہ کیا کہ اسلام کی تکمیل کے لیے انبیاء جیسے صبر کی ضرورت ہے (تفہیم ص ۱۲ تا ص ۱۲۱)

چنانچہ اس وقت کے امرا و رؤسا اور اونچے طبقہ کے ہر حلقہ کے لوگوں کی خرابیوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی بد انجامی سے آگاہ کیا لیکن اس تخریب کے پردہ سے تعمیری پروگرام کیونکر منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو اس کے لیے حسب ذیل اقتصادی اصول بتائے۔

شاہ صاحب کے اقتصادی اصول

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے مزدور اور کان قوت کا سبب ہیں ان کا تعاون مدنیت کی روح رواں ہے جب تک کوئی شخص ملک و قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدین البدور البالغہ بحث الاتفاق - الثالث)

(۲) مزدور کاشت کار اور جو لوگ ملک و قوم کے لیے ذہنی و دماغی کام کریں وہی دولت کے مستحق ہیں ان کی ترقی و خوش حالی ملک و قوم کی ترقی و خوش حالی ہے جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے (حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق)

(۳) جو سرمایہ دار محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے مزدوروں کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے قوم کا دشمن ہے (حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدنی)

(۴) جو پیداوار اور آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء رزق)

(۵) تعاون باہمی کا بڑا ذریعہ تجارت ہے لہذا اس کو صحیح اصول پر جاری رہنا چاہئے تاجروں کے لیے بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کا competition کر کے تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی (حجۃ اللہ البالغہ باب البیوع المنہی عنہا)

(۶) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے ملک

اور انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب الارفاق الرابع)
 (۷) وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و
 عشرت کے باعث دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو اس کو جلد از جلد ختم
 کیا جائے اور عوام کو مساویانہ زندگی کا موقع دیا جائے (حجۃ اللہ باب الرسوم الساترہ
 بین الناس) باب سیاست المدنیہ۔

(۸) زمین کا حقیقی مالک خدا ہے باشندگان ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی
 مسافر خانہ میں کھڑے والوں کا حق ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے حق نفع اندوزی میں
 دوسروں کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے (حجۃ اللہ باب ابتغاء الرزق)

سیاست نظام حکومت کے بنیادی اصول

(۱) انسان انسان برابر ہیں کسی کو حق نہیں کہ وہ خود کو مالک الملک، ملک الناس
 کہے یا انسانوں کی جانوں کا مالک خود کو تصور کرے نہ یہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی
 صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔ (منصب امامت ذکر سلطنت
 صناعہ)

(۲) حکومت کے سربراہ کی حیثیت وہ ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے
 متولی اگر ضرورت مند ہو تو بقدر ضرورت اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام
 باشندہ ملک کی طرح زندگی گزار سکے (ازالۃ النحقا جلد دوم)
 (۳) جو ااورسہ اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں جن کی موجودگی میں
 تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

بنیادی حقوق کے متعلق شاہ صاحب کے نظریات

(۱) روٹی پیرا مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کو تعلیم و
 تربیت دے سکے بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۲) مذہب رنگ و تفاوت کے بغیر عام باشندگان کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور اس کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۳) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے (حجۃ اللہ البالغہ اور البذور البالغہ)

مذہبی حقوق

(۱) (الف) دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے اس کے پیش کر نیوالے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(ب) داعیان صداقت ہر ملک اور ہر قوم میں گزرے ہیں ان سب کا احترام ضروری ہے۔

(ج) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں مثلاً پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(د) ساری دنیا کے سماجی اصول اور ان کا مقصد و منشاء ایک ہے۔ مثلاً ہر ایک مذہب اور ہر ایک فرقہ جنسی انار کی کونا پسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے ایسے ہر فرقہ مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے اور اختلاف اسی میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

(حجۃ اللہ البالغہ باب اصل الدین واحد البدور البالغہ)

(۲) جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں مقدس چیز کے لیے انسان اپنے اندر جذبہ خدائیت پیدا کرے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو ان اصولوں

کے لیے فنا کر لے۔ (البذور البازغہ بحث الارفاق الثالث اور حجة الله البالغة)
 شاہ صاحب اس انقلاب کے طریقہ کار میں عدم تشدد (اہنسا) کے قائل نہیں
 معلوم ہوتے وہ فوجی طاقت سے انقلاب برپا کرنے کے قائل تھے مگر وہ فوجی طاقت
 جس کی تربیت جہاد کے اصول پر ہوتی ہو جس کی حقیقت دشمن کشی، غارت گری
 اور ملک گیری نہیں بلکہ اس کی حقیقت محنت، جفا کشی، صبر و استقلال، ایثار و
 قربانی یعنی اپنی ذات اور ذاتی مفادات کو ختم کر کے اعلیٰ مقاصد انسانی کی تکمیل کو
 اپنی زندگی کا مقصد بنا لینا پھر اس مقصد کے لیے اپنی ہر چیز یہاں تک کہ زندگی کو
 بھی داؤ پر لگا دینا ہے جس کو شہادت کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے جب اپنی انقلابی دعوت فکح کل نظام کا الہامی زبان
 میں اعلان کیا اس وقت یورپ ارباب کلیسا کی گرفت میں تھا اور کوپرنیکس
 گلیلیو جیسے آزاد مفکرین کو بے دریغ تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ قدیم پاپائیت کا
 اقتدار پرستانہ دور عہد پیری میں پہنچ کر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہر جدید نظریہ
 ہر ایجاد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا اور اس کو مذہب کے مخالف قرار
 دیکر قابل گردن زدنی قرار دے رہا تھا قدیم کلیسائی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور
 جدید سائنسی تہذیب اس کے بطن سے رد عمل کے طور پر نمودار ہو رہی تھی ابھی انقلاب
 فرانس ۱۷۸۹ء کی صبح طلوع ہونے میں آدھی صدی اور مشینی دور کے آغاز میں
 چالیس سال باقی تھے کیونکہ کم از کم معلم اول کارل مارکس کے اشتراکی مینی فیسٹو
 میں ایک صدی اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء میں اٹھاؤں سال باقی تھے اشتراکی
 مینی فیسٹو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور پہلی انٹرنیشنل کانفرنس ۱۸۶۴ء میں منعقد
 ہوئی اس حساب سے شاہ صاحب پہلی انٹرنیشنل کانفرنس سے ایک سو دس سال
 اور مارکس کے اعلان اشتراکیت سے پچاسی سال پہلے وصال فرما چکے تھے۔ د تحریک
 شاہ ولی اللہ (ص ۶۲)

اس وقت جیسا کہ لکھا گیا مغل شہنشاہیت کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اس کے

ناخلف حکمران عیش و عشرت کے شبشتاں میں محو خواب تھے شاہ صاحب کا قلب و دماغ بیدار اور ان کی روح پاک خدا اور اس کے مخلوق کی محبت میں سرشار انسانیت کے لیے راہِ نجات کی تلاش میں تھے شاہ صاحب نے جو انقلابی پروگرام عالم انسانیت کے لیے تجویز کیا اس کو شخصی حکومت کی جگہ بندیوں کی وجہ سے باقاعدہ منشور دینی فیسٹو کی شکل نہ دے سکے لیکن حجۃ البالغہ بدور باز غہ مختلف کتابوں میں ان انقلابی دفعات کو حقوق انسانی کے نام سے پھیلا دیا ہے۔

شاہ صاحب کی دعوت کی اساس

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دعوت پہلا مخاطب اہل عجم کو بنایا ہے جس طرح قرآن حکیم نے اہل عرب کو اپنا اولین مخاطب بنایا تھا۔ پھر ان کے واسطے سے تمام عالم کو مخاطب بنایا اہل عرب اپنے مزاج عقلی کے اعتبار سے سادہ اور سپاٹ فکری سے زیادہ عملی قوم ہے جب کہ عجمی اقوام جن کے اندر خصوصیت سے ایران و ہندوستان شامل ہیں عملی سے زیادہ فکری ہیں اسلامی تعلیمات فکر و عمل کے حسین امتزاج کا مجموعہ ہے وہ صد ہا رنگ و بو کے پھولوں کا دلکش چمنستان ہے جو ایک عالم گیر اور بین الاقوامی مذہب کا خاصہ ہونا چاہیے اس کے لیے ہر قوم نے اسلام کو اختیار کر کے خوشہ چینی کی اور اپنے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے زندگی اور معاشرے کے سلیخے بنائے قرآن و سنت کے کلیات (قواعد کلیہ) کی روشنی میں فرعیات و جزئیات کا استخراج مصالح شرعیہ اور احوال زمانہ کے اعتبار سے علماء و فقہاء کرتے اور اسلامی معاشرے کو آگے بڑھاتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب (ولادت ۱۱۳۱ھ وفات ۱۲۰۶ھ) نے اسی ماحول کے زیر سایہ اٹھارہویں صدی میں اپنی دعوت تجدید کا افتتاح کیا شاہ صاحب سلف صالح کے مسلک کے مطابق قرآن و سنت کو اصل مآخذ مانتے ہیں پھر اس کی تفسیر ایسے مجتہدانہ اسلوب سے فرماتے ہیں جو ہندوستانی ذہنیت کے لیے قابل قبول

ہو جاتی ہے امام ابن تیمیہ اور ان کے پیروکار امام شیخ محمد بن وہاب نجدی (ولادت ۱۱۵۰ھ وفات ۱۲۰۶ھ)، محمد بن علی بن محمد شوکانی (ولادت ۱۲۱۰ھ وفات ۱۲۵۰ھ)، اسلامی توحید کی ایسی خشک و سخت گیر انداز میں تعبیر کرتے ہیں جو عرب کی ذہنیت سے میل کھاتی جس کے اندر فکر سے زیادہ عمل کا پہلو غالب رہتا ہے لیکن ایرانی ذہنیت اس سے تسکین نہیں پاتی۔

ہمارے نزدیک ایمان کے بسیط و مرکب ہونے میں فقہاء و محدثین کا اختلاف اسی ذہنیت کا شاخصانہ ہے (واللہ اعلم)

شاہ ولی اللہ نے ایرانی و ہندوستانی ذہنیت کو اسلام سے قریب کرنے کے لیے اپنی دعوت کی اساس وحدت الوجود پر رکھی ہے جیسا کہ لکھا گیا۔

شاہ صاحب کا یہ انقلابی اسلامی فکر انسانی قدروں پر مبنی ہے وہ پوری انسانیت کے لیے ایسے معتدل و خوش گوار انقلاب کے داعی ہیں جس کا فائدہ ہر فرد انسانی کو پہنچ سکے حضرت شاہ صاحب ایک فرد کو انسانِ صغیر اور پوری انسانی برادری کو انسانِ کبیر قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک پوری انسانیت کو اتحاد کی لڑی میں پرونے والا ہر عمل اور جملہ بنی آدم کو ایک کرنے میں مدد دینے والا ہر قدم زندگی کو ترقی کی منزل تک پہنچانے والا عمل ہے اسی طرح عالمگیر امن و امان اور باہمی ربط و اتصال کو قطع کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی جسم میں کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے جس کو صدیوں پہلے ببلشیراز (سعدی شیرازی نے) یوں ادا فرمایا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش زیک جو ہر اند
چوں عضو بدر آورد روزگار دگر عضو ہارا نما ند قرار

شاہ صاحب اس کے قائل ہیں کہ قرآنی اصولوں پر جو انقلاب برپا ہوگا اور جو انقلابی سوسائٹی قائم ہوگی اس سے وہ ہی نتائج پیدا ہوں گے جو قرن اول میں ہوتے تھے کسی آدمی یا زمانے کی خصوصیت نہیں۔

توحید اسلامی کی بنیادی نقطہ توحید فی العبادۃ ہے جس کے اندر خدائے وحدہ لا شریک کی تنہا عبادت کے عقیدہ کا نقش دل میں بٹھایا گیا ہے۔ چونکہ عرب کے مشرک ہو یا ہندو۔ یونان کے سب کے سب شرک فی العبادت کی لعنت میں گرفتار تھے۔ دیوتی دیوتاؤں کو تقرب خداوندی کا وسیلہ جانتے تھے اس لیے توحید کے ذریعہ شرک کی ہر بنیاد کو اکھیڑ کر پھینک دیا گیا۔ توحید فی العبادت کا محکم و بنیادی عقیدہ انسان کی عملی زندگی کا دروازہ کھولتا ہے اور خدائے وحدہ لا شریک کے حکم کے بحالانے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے اور اپنی ہر حاجت اور ہر ضرورت کیلئے اس کے ہی آگے ہاتھ پھیلانے کی دعوت دیتا ہے جو عبادت و استعانت کا خلاصہ ہے دعوت توحید القدر سے مادی علاقوں اور ہر طرح کے رشتوں کو توڑ کر خدائے وحدہ لا شریک سے رشتہ جوڑتی ہے۔ بے شک معبود حقیقی ایک ہی ہے۔ اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہی انسانی ضمیر و وجدانی کا فیصلہ ہے۔ لیکن عقل انسانی اپنی بے چین فطرت شک پسند مزاج کی وجہ سے وجدان کے اس فیصلہ پر فوراً سر خم نہیں کرتی بلکہ ذرا آگے بڑھ کر اس کی دریافت، اس کی فکری بنیاد کی کھوج کرتی ہے کہ وہ ذات احد لم یزل ولم یزال ہے۔ تنہا عبادت کی وہی مستحق ہو سکتی ہے شرکت کی اس کے اندر ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں اگرچہ حقیقت کی تہ اور اصلیت تک عقل خالص کی رسائی دشوار ہے جب تک نور و جی نہ شامل حال ہو۔ لیکن عقل ادراک کے لیے کبھی ٹھکتی نہیں اپنے غور و فکر کے وظیفہ کو وہ کبھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ محفل کائنات میں وجود کی پھیلی ہوئی روشنیوں کو اپنے دام خیال میں اسیر کرنے اور اس کے اصل مطلع و منبع تک پہنچنے کے لیے ہر دم اور ہمہ دم بے تاب و بے قرار ہے۔ وہ جب اپنے فکر و خیال کے جال کو زمین و آسمان میں پھیلاتی ہے تو اس کو ہر جگہ ایک قانون وحدت کی بنیاد جلوہ فرماتی اور ذرے سے آفتاب تک اور قطرے سے دریا تک ایک ہی تجلی کا نور افشانی نظر آتی ہے۔ جب انسانی فکر خدا کی

وحدانیت کے بحر بیکراں اور توحید خداوندی کے دریائے بے پایاں میں غوطہ کھاتی ہے تو ایک گویا ہر بے ہوا اس کے ہاتھ آتا ہے کہ اصل وجود اس آفتاب حقیقت کا ہے۔ جو اللہ نور السموات والارض کا منظر اعلیٰ ہے جو کچھ اس کے ماسوا زمین سے آسمان تک وہ اس نور مطلق کی پرچھائیاں اور سائے میں سورج کی ان ہی ہفت رنگ شعاعوں سے دنیا آئینہ خانہ بنی ہوئی ہے ساری محفل کائنات اسی روشنی سے مستیز اور جلوہ تاب ہے جب بھی آفتاب کسی چیز سے اپنا رخ پھیرے وہیں اُس پر ظلمت عدم طاری ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل وجود اور حقیقی وجود صرف آفتاب حقیقت کا ہے۔ اور پوری کائنات کا وجود ظلی و عارضی ہے وحدت الوجود کی صہ ہا پیرائے ہیں۔

جس کا خلاصہ ہم نے اپنے لفظوں میں بیان کر دیا یہی فکر ایرانی و ہندوستانی یونان کے حکماء و فضلاء اور شعراء میں پھیلی ہوئی تھی اور صدیوں سے وہاں کے عوام اس سے مانوس چلے آ رہے تھے بقول مولانا نانوتوی کہ وحدۃ الوجود ایک حقیقت ہے البتہ وحدت الموجودات مختلف فیہ اور معرکہ آرا مسئلہ ہے ہندوستان میں دیدانت کا فلسفہ بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے البتہ اسلامی تصوف کے وحدت الوجود کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بقول مولانا روم شیر درندہ، اور شیر دودھ، میں تحریری اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں لیکن ان کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہے چنانچہ وحدت الوجود کے داعی اکبر حضرت شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے۔

والرب رب العالمین تنزل والعبد عبد وان ترقی

خدا ہی رہے گا بلند بالا۔ اور فکر انسانی سے ماورا۔ چاہے اس کو تنزلات کی سیر صیحوں سے کتنا ہی اتارا جائے اور بندہ بندہ ہی رہے گا چاہے اس کو ترقیات کتنی ہی بلند چوٹیوں پر چڑھا دیا جائے۔ بہر حال ایرانی و ہندوستانی ذہنیت وحدت الوجود سے یلگونہ مناسب و انسیت رکھتی ہے اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ

اس دعوت کو اس بنیاد پر اہل مشرق کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اگرچہ ہندوستان قدیم زمانہ سے شرک کا گڑھ رہا ہے اور آج شاید دنیا میں اس وقت واحد ملک ہے جہاں چھٹی سڑکروڈیو تاؤں کا غلبہ بلند ہے۔ مگر علامہ ابو ریحان بیرونی نے تین مقامات پر ہندوؤں کے عقیدہ توحید پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ: ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا واحد ہے ازلی جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہاء۔ وہ اپنے فعل میں مختار ہے قادر ہے حکیم ہے زندہ ہے اور رہی بت پرستی۔ ہندو عوام کی رسم کے طور پر ہے ہندوؤں کے خواص اس سے بری ہیں اوم کلمہ تکوینی مسلمانوں کے بسم اللہ یا کے قائم مقام ہے (کتاب الہند ص ۳۴-۱۲۴-۲۳) علامہ بیرونی کی ان تحقیقات قدیم ہندو قوم کے خواص۔ یعنی اہل فکر و نظر کے یہاں توحید حقیقی کو جلوہ گر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی فلسفیانہ موشگافیوں نے اصلی حقیقت کو گڈ مڈ کر دیا۔ جس طرح اصلی صوفیائے اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ بعض غلط متصوفین کی طرف سے اس مسئلہ کی ایسی غلط تعبیریں اختیار کی گئیں۔ اور اصل حقیقت کے ساتھ غلط اجزاء کو خلط ملط کر کے خدا و بندہ کے لطیف و نازک پر پردہ ڈال دیا۔ اس لیے حضرت مجدد الف ثانی۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بر خود غلط صوفیاء کے خلط ملط کئے ہوئے غلط اجزاء سے پاک و صاف کر کے توحید حقیقی کا پاکیزہ عقیدہ پیش کیا۔

تفہیمات الہیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہم سے پہلے جو مشائخ گزرے ہیں وہ وحدۃ الوجود کی سراغ میں بہت آگے بڑھ گئے اور ان کا علم اس منزل پر پہونچا کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے ان پر ملاء اعلیٰ میں وجود حقیقی۔ اور مخلوقات میں جو اتحاد و اختلاف ہے اس کا علم مشکل ہوا۔ پھر حضرت شیخ مجدد آئے اور اس علم کے ارد گرد جو ملاء اعلیٰ میں ہو چکا تھا۔ گشت فرماتے رہے کبھی فرمایا کہ عالم وجود فی الخارج ہے۔ اور کبھی عالم کو موہوم بتاتے

اور کبھی ارشاد فرمایا کہ عالم اسماء الہی کا پرتو ہے۔ لیکن اس مسئلہ کی صراحت نہ فرمائی۔ آخر کار اسی دور کا فاتح آیا۔ اس نے جو حقیقت تھی وہ کھول کر بیان کر دی۔ (ص ۱۰۲، ۱۰۳) اس کے مقابلہ میں علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور ان کے پیروکاروں نے اس خلط ملط اجزاء کے مل جانے کی وجہ سے حقیقت توحید کو اکھاڑ کر رکھ دیا اور وحدۃ الوجود کے ماننے والوں کو اپنی تیرمزا جی پر۔ اپنی پریشانی پر خارج اسلام قرار دیا۔ یہاں تک کہ ان کے قلم کی تیغ براں یا شمشیر عریاں سے شیخ اکبر جیسا عظیم محدث و صوفی بھی نہ بچ سکا۔ لیکن خود امام ابن تیمیہ کے ہندوستانی معتقدین اس بارے میں ان سے متفق نہ ہو سکے مولانا اسماعیل صاحب شہید نے اپنی کتاب ”العیقات“ میں وحدۃ الوجود کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کے مسلک کے خلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے نواب صدیق حسن صاحب ابن عربی کے بارے میں اپنی رائے التاج المکمل میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ ابن عربی کے بارے میں صحیح نقطہ نظر وہی ہے جس پر محقق علماء دجو علم و عمل کے جامع ہیں، عامل ہیں وہ یہ کہ ان کے مسلک کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے اور ان کے یہاں جو باتیں خلاف شرع نظر آتی ہیں ان کی تاویل کی جائے اور ان کی تکفیر سے روکا جائے ان کے علاوہ اور جو مشائخ گزریے ہیں جن کا تقویٰ سب کے نزدیک مسلم تھا اور ان کے علم و فضل کو سب مانتے ہیں اور عملی صالح ہیں وہ بلند مقام رکھتے تھے ان کے معاملہ میں یہی مسلک اختیار کرنا چاہئے (التاج المکمل) ہندوستان میں اہل حدیث کے مسلک کے بانی مبنی نذیر حسین دہلوی انھیں خاتم الایۃ الحمد یہ کہہ کر پکارتے تھے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ اساطین علم و توحید ایرانی یا ہندوستانی فکر کی اصلیت کو پہونچ چکے تھے۔ بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآنی اصول دعوت کے اعتبار سے اس نقطہ مشترک کو اختیار کیا۔ جس کو عجمی یا ایرانی و ہندوستانی ذہن پہلے سے مانتا چلا آرہا تھا۔ اور تعالوا الی کلمۃ

سَوَاءٌ بَيْنَنَا كے مصداق ایسے کلمہ کی طرف بلایا جس کو وہ پہلے سے تسلیم کرتے تھے۔ بڑے شاہ صاحب نے اپنے مخصوص شاگردوں کو اس دعوت کے لیے تیار کیا اور چھوٹے شاہ صاحب دشاہ عبدالعزیز صاحب نے، اس دعوت الہی کو عام کیا چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ سراج الہند کی صحبت مبارکہ یا محفل شریف میں جو شخص بھی بیٹھتا۔ (خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو) مطمئن ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کے یہاں ہر مشکل سے مشکل کا جواب موجود تھا۔ حکمت ولی اللہ کا آپ جیسا زبردست شارح اور عملی قائد پھر نہ مل سکا۔

ولی اللہی پارٹی کا اقدام

سب سے پہلے دعوت ولی اللہی کو پھیلا نے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک جماعت پارٹی سراج الہند نے قائم فرمائی۔ اس جماعت کے دو بازو یا دو شعبے تھے۔ (۱) شعبہ ہدایت۔ وارشاد (۲) شعبہ جہاد۔ شعبہ ارشاد دوسرے شعبہ جہاد کے لیے بمنزلہ رسد اور ملک کے تھے اور اپنا مستقل وجود بھی رکھتا تھا چونکہ اصلاً اسلام اصلاحی دعوت ہے لیکن جب مخالف طاقتیں ہدایت اور ارشاد میں سب سے راہ بن جاتیں تو وہ انقلابی جماعت بن جاتی ہے۔ ارشاد و ہدایت۔ یا تہذیب و اصلاح کا راستہ طویل ہے سخت کھٹن دشوار کانٹوں سے بھرا ہوا ہے اس راستہ میں زندگی مرمر کر جتنے جانے کا دوسرا نام ہے راہ جہاد میں اگرچہ خون سے بھرے ہوئے دریا سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کا انجام یا نتیجہ کامیابی، یا ناکامی، سرداری یا بغاوت کی شکل میں جلد نکل آتا ہے۔ شاہ صاحب کے ذریعہ قائم شدہ دونوں جماعتیں ابتداءً شانہ، بشانہ ساتھ کام کرتی رہیں۔ لیکن آگے چل کر ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی پڑا۔ چنانچہ پہلی جماعت نے قرآنی و حدیث کی تعلیم و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا اور ہندوستانی و افغانستانی اور ایشیاء کے علاقوں میں ولی اللہ چراغ حکمت سے

یہ سارے چراغ روشن ہوئے اور ہر علاقہ میں اسی مشرق حکمت سے روشنیاں پھیلی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے آج کل جہاں بھی قال اللہ وقال رسول اللہ کی آوازیں گونج رہی ہیں وہ اسی مکتبہ ولی اللہ کی صلاہات بازگشت ہیں اور قرآن و سنت کے یہ جلتے ہوئے چراغ پھونکوں سے نہ بجھائے جاتیں گے لیکن دعوت جہاد کو کے معرکہ بالاکوٹ پر ختم کر دیا جاتا ہے یہ امر حقیقت سے بعید ہے ولی اللہی دعوت اسکے بعد بھی فرنگی سامراج سے.... اور خود ہندوستان میں مختلف تحریکات کے واسطے لڑھکتی رہی امام عبدالعزیز کے بعد شاہ اسحاق و شاہ یعقوب اور ان کے بعد حاجی امداد اللہ۔ اور مولانا نانوتوی، اور مولانا گنگوہی سامراج نبرد آزما ہے آخری امام حضرت شیخ الہند نے اسی تحریک جہاد کو بیرونی اسلامی حکومتوں کی امداد و معاونت جاری کرنے کا منصوبہ بنایا جو حالت کی نظر بندی پر ختم ہوا۔

ولی اللہی دعوت کی کامیابی

جیسے کہ لکھا گیا تاریخ انسانی سمندر کی طرح ہے جہاں ہمیشہ مد و جزر ہوتا رہتا ہے جس کی رفتار اکثر مدھم اور سست ہوتی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی طوفانی موجوں کا ایسا زور ہو جاتا ہے کہ بہت سے جزیرے غرقاب ہو جاتے اور بہت سے نئے جزیرے سطح پھر پر نمودار ہو جاتے، میں چنانچہ تاریخ انسانی کا بھی یہی حال ہے کہ اس کی انقلابی لہروں کی وسعت میں آکر بہت سی قومیں ڈوب جاتی اور بہت سی نئی قومیں ابھراتی ہیں یوں تو تاریخ انسانی میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے لیکن بعض بعض صدیوں میں ایسے طوفانی خیز انقلابات برپا ہوتے ہیں کہ جنہوں نے سطح کو زیر و بر کر دیا ہے چنانچہ سو لہوئیں ^{سنت} و ستر ہوئیں ^{سنت} صدیوں کی اور گیارہویں بارہویں صدی ہجری مشرق کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس نے بہت سی قوموں کو ابھرا اٹھایا اور بہت سی قوموں کو نیچے گرا دیا ان ہی صدیوں میں ہمارے ملک کے اندر حکومت مغلیہ

عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہوتی۔

اسی افراطی دور میں مرکز کی کمزوری نے طوائف الملوکی پیدا کی سلطنت
آصفیہ لکھنؤ ٹینالول کی ریاست روہیل کھنڈ جیدر آباد، بھوپال، رام پور اور
لوٹک مسلم ریاستیں قائم ہوئی۔ اسی مادی زوال کے پہلو میں سے روحانی
تحریکات ابھریں۔

مسلم افغانی ترک کے دور میں جس طرح تحت حکومت پر طاقت ور و مسدور
شخصیتیں بیٹھ کر ملک کو ترقی و خوش حالی کے راستے پر آگے بڑھاتی گئی۔ اسی طرح
روحانی مسندوں پر ایسی عظیم روحانی شخصیتیں قدرت کی طرف سے ظاہر ہوئیں کہ
جن کی روحانی سلطنت نے مادی شہنشاہیت کو بھی دبا دیا تاریخ اسلام کے
گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ہزار سالہ دور میں روحانی شخصیتوں کا
دور تھا۔ جنہوں نے باطنی اصلاح و تربیت کے زبردست کارنامے انجام دیئے
سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، حضرت بایزید بسطامی، شیدنا شیخ عبدالقادر
جیلانی خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی خواجہ شہاب الدین سہروردی۔
خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، سہروردی خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی، خواجہ
عبید اللہ احرار۔ خواجہ نظام الدین اولیاء۔ خواجہ علاء الدین علی احمد صابر۔
خواجہ باقی باللہ۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسے زبردست
روحانی مشائخ گزرے، ہیں جن کی باطنی فتوحات سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ لیکن
دور ہزار سالہ کے بعد جب دوسرا دور آیا تو پھر انفرادی شخصیتوں کا پچھلا جاہ و
جلال روحانی شکوہ ظہور میں نہیں آیا جماعتوں نے ان کی جگہ لے لی۔ گویا
شخصیت کے ظہور کے بجائے اجتماعی یا جمہوری رنگ میں مادیت کی طرح روحانیت
جلوہ گر ہوئی اس اجتماعیت کے دور میں ولی اللہی جماعت کا سب سے زبردست
ہاتھ ہے ولی اللہی دعوت سے پہلے قرآن و حدیث کا ہمارے ملک میں عام چرچہ
نہ تھا، سندھ، گجرات، اور کوکن میں محدثین ضرور پیدا ہوتے لیکن علم حدیث

عوام تک نہ پہنچ سکا۔

ولی اللہی دعوت سے پورا ملک قرآن و حدیث کے غلغلے سے معمور ہو گیا اور شمال سے جنوب تک قرآن و سنت کی اشاعت کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ذات بابر کات سند الکل کی حیثیت رکھتی ہے ان سے شاہ ولی اللہ کی دونوں دعوتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ دعوت جہاد اور دعوت ارشاد بہر حال یہی وہ صدی ہے جب کہ مغربی ممالک نے صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہو کر ایک نئی انگریزائی اور کلیسائی نظام کو توڑ کر دسویں صدیوں سے شہنشاہیت کا مددگار اور دیل بن کر عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا، حریت و آزادی کا نعرہ بلند کیا اور سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت کی تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا کلیسائی نظام کے مقابلہ میں ان کی زبردست قربانیاں رنگ لائیں۔ اور سائنس جدید کے ذریعہ علم تحقیق کا پرچم بلند ہوا۔ زندگی کی ایک متحرک لہر تھی جو پورے یورپ میں پھیل گئی اور ترقیات کا ایک ولولہ آفریں طوفان تھا جو غلط و باطل عقائد اور پچھلے دقیانوسی افکار و خیالات کو بہا لے گیا۔ سترہویں صدی میں مغربی اقوام سائنسی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مادی فلسفہ کے تحت جس نے عیسائیت کے مقابلہ میں فتح حاصل کر لی تھی۔ مشرقی ممالک پر حملہ آور ہو گئیں کیوں کہ مادیت کی بناء پر ہر طاقت و رکھ کو کمزور پر حکومت اور اس کی محنت کے استحصال کا دنیا جائز نفع اندوزی کا حق حاصل ہے ان پوری قوموں کے جنگی و تجارتی بیڑے مشرقی کے ساحلوں پر اترنے لگے۔ اسلام جو ایک ہزار سال سے مشرقی اقوام کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے نام لیوا اقتدار اور سیاست کے چکر میں پھنس کر اب خانہ جنگی اور برادر کشی میں مصروف عوام اور رعایا کی فرائض کی ادائیگی سے غفلت پسندی کا شکار ہو چکے تھے اکثر مسلم ممالک میں مذہب کے نام پر، جاہل، فریبی مکار پیروں اور جھوٹے دنیا دار عالموں نے مسلم عوام کو اپنے جال میں پھانس لیا اور دین کے

کے ذریعہ دنیا کماتا ان کا مشغلہ بن گیا تھا اور مذہب کی روح سے بے گانہ ہو کر رسوم و روایات کو انھوں نے اصل مذہب قرار دے رکھا تھا علاوہ ازیں دنیا کی دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول سے ان کے باطل افکار و نظریات خود مذہب اسلام میں داخل ہو گئے تھے اسلام کی نکھری اُجلی اور صاف و شفاف توحید، شرک کی آمیزش سے گندی اور میلی ہو گئی تھی پیر پرستی نے قبر پرستی کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ کیا عرب کیا عجم کیا ایران کیا افغانستان اور کیا ہندوستان روح مذہب کے خلاف ایک ایسی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ اسلئے قانون فطرت کے مطابق اصلاح و انقلاب کی ضرورت تھی جس طرح نجد و حجاز میں امام عبدالوہاب (ولادت ۱۱۵۰ھ وفات ۱۲۰۴ھ) اور یمن میں محمد ابن علی شوکانی (ولادت ۱۱۷۲ھ وفات ۱۲۵۰ھ) عرب میں اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ نے ایران و ہند کو اور افغانستان کو اپنی دعوت کا جولان گاہ بنایا۔ عرب ممالک کے بہت سے حصوں میں زیادہ تر شافعی مسلک اور کمتر حنبلی مسلک کے ماننے والے ہیں جب کہ مسجد اقصیٰ اور افریقی ممالک میں فقہ مالکی کو عام مقبولیت حاصل ہے لیکن ایشیاء کے بہت سے بڑے علاقے میں حنفی مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ اور اکثر مسلمان حکومتوں کا یہی مذہب رہا۔ لیکن حنفی علماء کو حکومت چلانے کے لیے حدیث سے زیادہ فقہ کی طرف توجہات کو مبذول کرنا پڑا۔ نت نئے حوادث اور ہنگامی ضروریات و مشکلات کے حل کرنے کے لیے فقہی استنتاجات کی ضرورت پیدا ہوتی رہی کیوں کہ نظام قضا زیادہ تر حنفی علماء کے ہاتھوں میں رہا۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک انقلابی عالم اور ایرانی طرز فکر کے مجتہد تھے اس لیے انھوں نے فقہ کی ترتیب و تردین ایسے طریقہ سے اختیار کی کہ عجمی ذہن بھی اس کو فوراً قبول کر لے یا درکھئے کہ ایرانی ذہن ہر مسئلہ کو ایک عقلی اور کلی اصول کے ماتحت حل

کرنے کا شائق رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتاب و سنت سے اپنے
ملکہ اجتہاد کی روشنی میں ایک اصل کلی اخذ کرتے اور پھر تمام جزئیات کو
اس پر منطبق کرتے ہیں اس اصل کلی کے خلاف اگر کوئی حدیث آجائے
تو اس کی تاویل حسن کر لیتے ہیں۔ لیکن حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو
چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں تک اصول کی روشنی میں ہو سکتا ہے اس قاعدہ
کلیہ کو لوٹانے نہیں دیتے۔

بہر حال ہندوستان کے کچھ ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہمارا ملک
حنفی عوام کا مرکز بنا رہا۔ لیکن حنفی علماء کو فقہی جزئیات اور انکی فروعات
اس قدر غلو ہوا اور اس کے اندر اس قدر جمود پیدا ہوا کہ وہ اصل مآخذ
قرآن و سنت سے دور ہوتے چلے گئے فتاویٰ تاتار خانیہ فتاویٰ عمادیہ ،
فتاویٰ عالمگیری جیسے بے شمار مجموعہ یہاں تیار ہوئے۔ لیکن فن حدیث
میں پچھلے دور کے علماء مشارق الانوار سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور شاہ
عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے اس جمود کو توڑا اور انکے خاندان
کے افراد نے حدیث کی طرف توجہ فرمائی۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ اس
دور کے فاتح اقلیم بن کر آئے اور انھوں نے حرمین شریفین سے واپس
ہو کر قرآن و سنت کی اشاعت اس انداز سے کی کہ ہر طرف قال اللہ
اور قال الرسول کی صداؤں سے فضا میں گونج اٹھی آج ہندوستان کا
کوئی علمی حلقہ ایسا نہیں ہے جو شاہ صاحب سے نسبت نہ رکھتا ہو علمائے
دیوبند شاہ صاحب کی اس علمی و عملی میراث کے وارث بنے چنانچہ علمائے ہند
کی اس صدی میں حدیث پاک کے اہتمام کا اعتراف علامہ رشید رضا
مصری نے شاندار لفظوں میں فرمایا کہ اگر ہندوستانی علماء اس درمیان
میں اس علم شریف کی طرف توجہ و اہتمام نہ کرتے تو یہ علم دنیا سے اٹھ جاتا۔
(مقدمہ مفتاح کنوز السعاده)

علامہ کا یہ گراں قدر اعتراف ولی اللہی دعوت کی کامیابی کی زبردست سند ہے۔ ریاست بھوپال جو روزِ وال سے ولی اللہی دعوت کا مرکز بنی اس نے ریاستی حالات کے ماتحت دعوت ارشاد کو اپنا نصب العین بنایا۔ اور شاہ عبدالعزیزؒ و محدث دہلوی کے شاگردوں کی تشریف آوری سے یہ خطہ شروع ہی سے منور ہو گیا جن کا تفصیلی تذکرہ تاریخ بزرگان بھوپال میں ہے یہاں ایک اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔

ولی اللہی پارٹی کی تشکیل

حضرت شاہ ولی اللہؒ صرف ایک مفکر عالم ہی نہ تھے بلکہ ایک عملی قائد بھی تھے۔ انھوں نے بالواسطہ اس وقت کی عملی سیاست میں بھی حصہ لیا مرکز کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ (جو) شاہ صاحبؒ کا خصوصی مرید تھا۔ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی ایرانی و تورانی کشمکش کو دور کرنے کے لیے دعوت دی۔ (مکتوب شاہ صاحبؒ)

لیکن ابدالی کے عہدوں کے بانٹ دینے سے بھی مرکز کو استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ ابدالی کے چلے جانے کے بعد پھر جوتیوں میں دال بٹنے لگی کیونکہ جس محل کی بنیادیں اور چھتیں اور دیواریں ساری کی ساری بوسیدہ و خستہ اور شکستہ ہو چکی ہوں ان کو سہاروں اور ٹیکوں سے کیوں کر روکا جاسکتا ہے اس لیے فک کل نظام شاہ صاحبؒ کا انقلابی پیغام بنا ظاہر ہے کہ اس انقلابی نعرے کی زد میں خود مغل شہنشاہیت بھی آتی تھی کیونکہ شاہ صاحبؒ نے اس دور کے بادشاہ اور عام امرا سے صاف صاف اظہارِ بیزاری کیا تھا اس لیے شاہ صاحبؒ کو اس سلسلہ میں مصائب و امتحانات کی راہ سے گزرتا پڑا شاہ صاحبؒ کو فک کل نظام کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ اس سنگ لاخ و دشوار گزار راستہ پر چل کر منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے انبیاء علیہم السلام نے صبر کی ضرورت ہے لہذا اس مرد حق آگاہ ہمدرد خلق درویش کو آزمائش کے اس کٹھن راستہ میں قدم رکھنا پڑا۔

شاہ صاحبؒ کے ان مقدس ہاتھوں کو قلم کرایا گیا جن سے دکھی انسانیت

پریشان حال مفلس بھوکے ننگی سوسائٹی کی تصویریں کھینچی تھیں اور ان کے لیے امتضادی مساوات کا نسخہ تجویز کیا تھا شاہ صاحب کے پہنچوں کو اتر دیا گیا فتح پوری مسجد (دہلی) سے باہر نکلتے وقت بد معاشوں کے ذریعہ ان پر حملہ کرایا گیا وہ خدا کی مدد سے اپنے بہادر ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے ورنہ ان کے چراغ حیات کو گل کرنے کا پورا پورا منصوبہ تھا اس لیے انھوں نے اسلامی و انقلابی پروپیگنڈہ کے لیے ایک جماعت قائم کی جو تسلیم و اصلاح کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھائے جو ان کے جاں نثار و جاں باز ساتھیوں اور شاگردوں پر مشتمل تھی۔ اس کے ارکان خصوصی یہ تھے؛

(۱) شاہ محمد عاشق پھلتی جو حجتہ اللہ کی تصنیف کے محرک ہیں (۲) شاہ نور اللہ بڑھانوی (جد امجد شاہ عبدالقیوم محدث بھوپال) (۳) مولانا شیخ محمد امین کشمیری (۴) ملا معین الدین سندھی جن کے مرید سندھی کے مشہور شاعر شاہ عبداللطیف ٹھٹائی تھے۔

شاہ صاحب نے دارالسلطنت دہلی کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلادیں (۱) پہلی شاخ مدرسہ نجیب آباد میں جہاں نواب نجیب الدولہ برسر اقتدار تھے جن کے جانشین ضابطہ خاں ہوئے (۲) دائرہ شاہ علم اللہ جہاں شاہ ابوسعید جیسے چہیتے شاگرد رونق افروز تھے (۳) ملا معین کا مدرسہ ٹھٹا سندھ میں تھا۔ شاہ صاحب کے بعد امامت کا تاج شاہ عبدالعزیز دہلوی کے سر پر رکھا گیا چنانچہ مدرسہ نجیب آباد کے مرکز میں حضرت مفتی الہی بخش نے یہاں کام کیا نواب ضابطہ خاں کے بعد حضرت مفتی صاحب کے دارالاقبال بھوپال کو اپنی علمی و عملی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اس طرح ایک طرف مفتی صاحب کی تشریف آوری سے اور دوسری طرف حضرت مولانا ضیاء الدین بھوپالی شاگرد شاہ ولی اللہ اور خلیفہ شاہ ابواللیث کے واسطے سے ریاست شروع سے ہی اس تحریک سے جڑ گئی۔

مالوہ کی مختصر تاریخ

ہمارا ملک ہندوستان جو سرزمینِ ایشیا کی جنت ہے۔ یہ سرزمین اپنے رنگارنگ علاقوں اور بوقلموں خطوں کی وجہ سے ایک برصغیر کی حیثیت سے دنیا کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے۔ اس سرزمین کا ہر ٹکڑا اپنی اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بے حد دلربا اور دلکش ہے۔ جس کی کچھ تفصیل ”اسلام ہندوستان کے سایہ“ میں ہم کر چکے ہیں۔ پورے ملک میں موجودہ صوبہ مدھیہ پردیش رقبہ کے لحاظ سے تمام صوبوں میں سب سے بڑا اور اپنے پھیلے ہوئے جنگلاتی اور معدنیاتی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ علاقہ عہدِ تاریخ سے پہلے بھی اپنی مذہبی پاکیزگی و برگزیدگی، شعور و ادب، فلسفہ و نجوم (جیوتش) کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خطے کے پہاڑوں اور دریاؤں میں کوہِ ندیا چل اور دریائے نریدا مشہور و معروف ہیں۔ جس طرح کوہِ ہمالیہ اپنی رفعت و بلندی میں شہرہ آفاق ہے اسی طرح وندیا چل اپنی وسعت و فراخی میں یکتا و بے نظیر ہے۔ پرانے زمانے میں اس کا ایک قطعہ ددھیاری و رکشا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جو ریوا میں واقع ہے۔ اور ہمارے علاقہ بھوپال میں سر بہار پاتر کے نام سے پہچانا جاتا تھا لیکن پھر سارا وندیا چل کہلایا جانے لگا۔ پرانی قوموں میں حیات و کائنات کے بارے میں جو دلچسپ قصے کہانیاں اور عہدِ طفلی کے کہاوٹ چلی آرہی ہیں جن کو ”علم الاصنام“ (دیو مال) کہا جاتا ہے۔ اس علم الاصنام (ہندو دیو مال) کی روشنی میں یہ چوڑا چکلا پہاڑ رشیوں کی عبادت گاہ رہا۔ خاص طور پر اگست مہنی نے یہاں ریاضت (تپسیا) کی تھی۔ اس پہاڑ پرش اور عظیم ترمہنی کے حکم

اس پہاڑ نے سر جھکا دیا اور ان کو دکن جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ وہ جب دکن سے نہ پلٹے تو وہ اسی شان سے کھڑا رہا۔ اور اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اس لیے یہ کوہ ہمالیہ سے پست نظر آتا ہے۔ بھگوت پران کی دوسری روایت ہے کہ اس نے اپنی بلندی کی بنا پر کوہ ہمالیہ سے مقابلہ کرتے ہوئے سورج دیوتا کے رتھ کا راستہ روک دیا تھا جس پر دیوتاؤں نے اگست مہاتما سے شکایت کی اس پر اس کو طلب کیا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ سر بسجود ہو گیا۔ تو مہاتما نے اس کی یہی سزا مقرر کر دی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد پھر اس نے سرتابی اختیار کی۔ بہر حال وندیا چل کا پھیلاؤ ہمارے ملک کے تمام پہاڑوں سے زیادہ ہے۔ اس سر زمین کا سب سے بڑا دریا نربدا بھی اپنے پانی کی خوشگوار، شیریں، روانی و صحت افزائی غذا کے لیے زود ہضمی اور قلب و جگر کی تقویت بخشی کے لیے خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ اس کے اندر ہڈی اور لکڑی کچھ مدت رہ کر پتھر بن جاتی ہے نربدا میں پارس پتھر کا ہونا بھی بتایا گیا ہے۔ اکبر اعظم نے اس کا کھوج بھی لگایا تھا۔ نربدا ندی امر کنٹک پہاڑ کی دیوی ہے جو سونی ندی کے ساتھ اسی پہاڑ سے نکلی ہے۔ ہندو دیو مالا میں ہے کہ یہ دونوں ندیاں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گلے مل کر رہتی تھیں کسی بات پر ان کے درمیان رنجش ہو گئی جس کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے سے منہ پھیر لیا۔ سون ندی نے مغرب کا رخ پکڑا اور نربدا مشرق کی طرف بہہ نکلی۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں یہی وہ واحد دریا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے ورنہ اور تمام دریا مغرب کی طرف — بہہ رہے ہیں۔ دریائے نربدا تین صوبوں مدھیہ پردیش، مہاراشٹر و گجرات کو سیراب کرتا ہے۔ لیکن اس کے پانی کا بڑا حصہ ہمارے صوبہ کو فیض پہنچانے کے لیے وقف ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جس کی مشہور تاریخی راجدھانی اُجین میں بکرماجیت جیسا زبردست مدبر علم پرور و ادب نواز مہاراجہ نے جنم لیا اور دوسری طرف یہیں پرمار خاندان کے حق پسند راجہ بھوج دھارنگری میں جلوہ افروز ہوا۔ ایک طرف مشہور عالم ادیب و ڈرامہ نگار کالیداس نے زبردست

شہرت حاصل کی تو دوسری طرف بھر تری ہر تری جیسے حقیقت نگار شاعر نے معرفت کے
 نغمے بکھیرے۔ عوام کے لیے یہ حیرت ناک واقعہ ہو گا کہ جبکہ مشہور عالم فاتح شہاب الدین
 غوری نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی پر قبضہ کیا تو اسی خطہ کے ایک بادشاہ بہادر شاہ
 اس سے معرکہ آرائی کے لیے دہلی کی طرف بڑھا اور لڑ کر شہید ہو گیا۔ اس تاریخی واقعہ
 کھل کر سامراجی اس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ غوری کے حملہ سے مسلمانوں کی حکومت
 قائم ہوئی اور انھوں نے اس ملک میں سکونت اختیار کی۔

پھر مشہور فاتح علاء الدین خلجی کے دور ۱۳۰۹ء میں طوطی ہند امیر خسرو صاحب
 خزانہ الفتوح دہلی سے ملک کافور کے ہمراہ ہو کر جنوبی دکن کی طرف جا رہے تھے تو
 بھوپال کے دریائے بھوج کے سرسبز و شاداب جنگلوں کو اپنے مدھ بھرے گیتوں سے
 بھر دیا۔ امیر خسرو کا یہی وہ دریائے بھوج ہے جس نے بعد میں بیتواندی کا نام پایا۔
 انھوں نے دریائے بیتوا کو بھوج ہی تحریر کیا ہے اور وہ ان پانچ دریاؤں میں سے
 آخری دریا تھا جس کو عبور کر کے ملک کافور کا لشکر سلطان پور (موجودہ بابینا)
 ۵۱ جمادی الثانی ۷۰۹ھ کو پہنچا تھا۔
 (ترجمہ خزانہ الفتوح)

پرمار خاندان

ہندوستان کا یہ وسطانی علاقہ (سینٹرل انڈیا) جو بعد صوبہ مالوہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ صوبہ کوہ وندیا چل اور دریائے نربدا کو آغوش میں لیئے ہونے کی وجہ سے سبزہ زار و پُر بہار علاقہ ہے۔ مالوہ کا علاقہ دریائے نربدا کے شمال کی وہ سرزمین ہے جو عہد قدیم میں اونی (سلطنت اجین) کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس علاقہ کی حکومت کے سلسلہ میں پرمار خاندان تاریخ کی پیشانی میں جھوم کی طرح درخشاں ہے۔ اس خاندان کی بنیاد نویں صدی مسیح کے آغاز میں ایک سردار اپندرما کرشن راج نے رکھی تھی۔ جس کی بادشاہت کا سلسلہ چار سو برس تک قائم رہا۔ نویں صدی کا دور وہ دور ہے جبکہ ہم کو مختلف علاقوں سے مختلف حکومتیں قائم ہوتی نظر آتی ہیں۔ گویا اس دور میں بہادر سردار اور جنگ جو سپہ سالار اپنی طاقت و قوت کے جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پرمار راج کا بانی راجپوتانہ کے کوہ ابو کے قریبی اضلاع چندراوتی، اچل گڑھ سے چل کر ۹۵-۹۴ء میں یہاں آکر آباد ہوئے جہاں یہ قوم مدتوں سے آباد تھی۔ اس خاندان کے ساتواں راجہ راجہ ۹۵-۹۴ء سب سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے علم و فضل، زبان و بیان، فصاحت و بلاغت میں خصوصی کمال کا حامل تھا۔ اور خود مشہور و معروف شاعر تھا اور شاعروں کا سر پرست تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا قصہ بھی قابلِ عبرت ہے۔ چندر پال کا بیٹا ہے جس کا دلدادہ تھا۔ ایک روز جنگل میں ایک درخت کے نیچے ایک نو زائیدہ بچہ ملا اس کو اولاد کی طرح پالا پوسا۔

اور اس کا نام تیج رکھا۔ جب راجہ کا آخری وقت ہوا تو اس کا لڑکا بھوج نابالغ تھا اس نے تیج کو جانشین بنادیا۔ اس دور کی منتخب ادبیات میں اس کی طرف نظمیات ہیں اس عہد کا مشہور مصنف دھیمیا اور خود اس کا بھائی دھنگ بھی مشہور شاعر تھے۔ جو اس کے درباری تھے۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ و جدل میں گزرا تھا۔ چھ بار اس نے چلو کیا خاندان کے راجہ نیل کو شکست دی۔ تیج مہاراجہ نیل کی شمالی سرحد دریائے گوداوری کے پار تک گیا تھا۔ وہاں شکست کھا کر گرفتار ہوا اور ۹۹۵ء میں مارا گیا۔ بہر حال اس کی اولوالعزمی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ علم و ادب کی سرپرستی میں پیش پیش رہا۔ اسے کئی ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ وگیتی اول، انیل راج، امور گھوشی، پرتھوی دلہہ اور شری دلہہ۔

پونوار خاندان جس کے اٹھارہ راجہ ہوئے

کہا جاتا ہے کہ پونوار راجپوت قوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو قدیم موریوں کی نسل سے بتاتے ہیں۔ جو موریہ خاندان کی ہی ایک شاخ تھی یہ خاندان مالوہ و راجپوتانہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک شاخ کوہ آلو کے شہر چندراوتی میں سکونت پذیر تھی۔ دوسری شاخ انتی (اجین) میں اور تیسری شاخ دھار میں تھی ۸۳۰ء میں اگر سین کوہ آلو سے اتر کر راجہ بن گیا۔ بہر حال اس خاندان کے راجاؤں میں سب سے زیادہ جس مہاراجہ نے شہرت حاصل کی وہ راجہ بھوج ہے۔ جو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اس لقب سے زیادہ مشہور ہے۔ مہاراجہ بکر جیت کے بعد تاریخ وسط ہند میں جس راجہ کی سب سے زیادہ شہرت ہوئی وہ راجہ بھوج ہے۔ ہمارے نزدیک راجہ بھوج لقب ہے۔ بہت سے راجہ اسی لقب سے ملقب ہوئے بہر ۵۲۱ء سمت میں دھار میں راجہ بھوج تخت نشین ہوا اور

بہت سے ملکوں کو فتح کر کے اپنے قلمرو میں شامل کیا۔ وہ علم و ہنر کا مربی اور اہل علم (پنڈتوں، جیوتشیوں) کا قدر داں تھا۔ اس کے دربار میں پانچ سو اہل کمال رونق بڑھاتے اور ہر وقت علم و فضل کا چرچا کرتے رہتے تھے۔ ان میں سب سے اعلیٰ شاعر سرسزید مزاح پھر دھن پال گزرے ہیں۔ جن کے رنگین و دلآویز اشعار بعد کے آنے والوں کے لیے بیش بہا ذخیرہ اور قیمتی تحفہ ہیں۔ علم ہیئت و فن تعمیر اور علم عروض میں اور دیگر علوم میں ان کی طرف کئی کتابیں منسوب ہیں۔ وہ بھی سندرگیت کی طرح غیر معمولی لیاقت کا انسان تھا۔ اس نے دھار میں سنسکرت کے علوم و فنون کی ایک یونیورسٹی قائم کی۔

۱۲۶۸ء
(تاریخ ہندوستان ص ۳۱۱ ترجمہ مولوی سید غلام ربانی بانی)
راجہ بھوج کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے غلط فہمی سے یا جنم پتری بنانے والوں کی غلطی سے اس کو منحوس قرار دیا۔ اور وہ جنگل میں پھینک دیا گیا۔ سرفج پنڈت نے جو اس وقت راجہ کے دربار میں نہ پہنچ سکا تھا اس کو اٹھایا اور اس کا زائچہ تیار کیا۔ سرفج نے اس جنم پتری کو راجہ کی گزرگاہ پر پھینک دیا۔ جے نند نے اس کو پڑھ کر حقیقت حال سے آگاہی حاصل کی بھوج آٹھ برس کا ہوا تو تیج نے اس کو قتل کرانا چاہا۔ لیکن راجہ کے لوگوں کو اس پر رحم آگیا۔ بھوج کے بعد اس کا لڑکا جے چند حکمراں ہوا اور پھر پوتوار خاندان کی حکومت ختم ہوئی۔
(تاریخ ہندوستان مولوی ذکار اللہ ص ۳۵۹ تا ۳۶۰ ج ۲)

جب بھوج کے بیٹے جے چند (جو اٹھارہواں حکمراں تھا) ختم ہوا تو جیت تو نور جو زمینداروں میں سے تھا اس کے خاندان میں حکومت منتقل ہوئی اس خاندان کے گیارہ راجہ ہوئے۔ آخری راجہ کنور پال کے راجہ مالو کے زمانہ میں غزنی سے شیخ شاہ آکر مالوہ کا حکمراں بن گیا۔ پھر اس کے بیٹے علاء الدین کی خورد سالی کی وجہ سے اس کا وزیر دھرم راج حاکم بن بیٹھا۔ پھر علاء الدین جب بڑا ہوا تو اس نے دھرم راج کو مار ڈالا۔ پھر جیت پال جو مانگ دیو کی نسل سے تھا

اور کمال الدین کا ملازم تھا وہ تخت پر قابض ہو گیا۔ پھر راجہ تپرسین کے عہد میں ایک افغان نے راجہ کو قتل کر کے جلال الدین لقب اختیار کر کے بادشاہ بن گیا۔ تپرسین کے لڑکے کھڑک سنگ نے گجرات سے آکر مالوہ پر حملہ کیا اور انتقام لیا۔ پھر سنگت سنگ کے زمانے میں بہادر شاہ نامی سردار دکن سے آکر مالوہ کا بادشاہ بن گیا۔ پھر جو اس کی شامت آئی تو وہ شہاب الدین غوری کو تخت دہلی سے ہٹانے کے لیے دہلی پہنچا۔ اور اس کے ہاتھوں ۱۳۱۶ء میں مارا گیا۔ پھر شاہان دہلی میں سلطان غیاث الدین نے سب سے پہلے ملک مالوہ فتح کیا۔

اب ہم ایک فہرست ان حکمرانوں کی جس کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی پیش کرتے ہیں جنہوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے پہلے اس علاقہ میں حکومت کی تاکہ فرنگی سامراج کے اس تاریخی مفروضہ کی تردید کھلے طور پر ہو جائے کہ مسلمان ہندوستان میں غوری کے بعد آئے۔

”فہرست حکمران“

نام حکمران	مدت حکومت
۱۔ شیخ شاہ	۱۰ سال
۲۔ دھرم راج	۱۰ سال
۳۔ علاء الدین	۱۰ سال
۴۔ کمال الدین	۱۰ سال
۵۔ جیت پال چوہان	۱۰ سال
۶۔ ہرچند	۱۰ سال
۷۔ کیرت چند	۱۰ سال

نام حکمران	مدت حکومت
۸ - اگر سین	دو سال
۹ - سورج نند	بارہ سال
۱۰ - تیر سین	دش سال
۱۱ - جلال الدین	باہیس سال
۱۲ - عالم شاہ	چوبیس سال
۱۳ - کھڑک سین	آٹھ سال
۱۴ - نرما سین	بیس سال
۱۵ - بیر سال	سولہ سال
۱۶ - پورن مل	انٹالیس سال
۱۷ - ہرنند	باہیس سال
۱۸ - سکت سنگھ	ساتھ سال

(بحوالہ شعلہ حیات ۱۵ جولائی ۱۹۶۴ء)

خط بھوپال کی پچھلی تاریخ

ہمارا یہ شہر بھوپال اس خطہ کا ایک جدید و نوخیز شہر ہے۔ اس خطہ میں بکراجیت کی تاریخی راجدھانی اجین اور پرمار خاندان کے پایہ تخت دھار کی طرح یہ شہر اتنا پرانا نہیں ہے۔ پرمار خاندان کے مشہور و معروف عالم راجہ بھوج کو اس شہر کی تعمیر کا اولین فخر حاصل ہے جو ہم کو ہزار ڈیرہ ہزار سال پہلے کے تاریخی عہد تک پہنچا دیتا ہے۔ جبکہ پرمار حکمرانوں کے اس علمی خاندان سے اس خطہ کو علم و ہنر و تہذیب و تمدن اور ثقافت و کلچر کے حسین و جمیل نقوش سے سجایا۔ بہر حال ہمارا شہر ایک نو پیدا شدہ شہر کی حیثیت سے تاریخ کے صفحہ پر ابھرا ہے۔ مگر اب جبکہ آثار قدیمہ نے تاریخی عہد سے پہلے کے احوال و واقعات پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا کر ہندوستان کی پچھلی قوموں کے چہروں پر سے نقاب الٹ دے ہیں اور ان محققین و مکتشفین کی مسلسل سرگرمیوں کے نتیجہ میں اور بروز نت نئے قدیمی پردہ کشائی کا سلسلہ جاری ہے۔

جب ہم ان آثار قدیمہ کی روشنی میں پہاڑوں کے دامن میں آباد جھیلوں کے اس شہر (بھوپال) پر نگاہ تحقیق ڈالتے ہیں تو ان پہاڑیوں، ٹیکریوں اور اونچے نیچے میدانوں کے سینہ سے ایسے پرانے آثار برآمد ہوتے ہیں جو ہم کو ہزاروں سال پہلے (ما قبل تاریخ) کے دور میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس سے اس بستی کی قدامت آشکارا ہوتی ہے۔

بھوپال کے آثارِ قدیمہ کی دریافت

قدیم شہر بھوپال کے ملحقہ جدید آبادیوں جیب گنج، ٹی۔ ٹی نگر، اریرہ کالونی، گوند پورہ، سنگر نگر، شملہ پہاڑی، جھری دور، پتھر کا زمانہ، معدنی دور (تانبے و کانسہ کا دور) کے آثار ہاتھ لگے ہیں۔ ان پہاڑیوں کی بعض گپھاؤں میں ایسے نقوش ملے ہیں جو دورِ ماضی کے باشندوں کے احوال زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جب ہم دورِ ماضی کے جھروکے میں سے جھانک کر ان گزری ہوئی قوموں اور پھیلی ہوئی نشانیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس علاقہ میں تیسری خاندانوں کے قافلے اپنا جھنڈا لہراتے اور یہاں کے باشندوں پر حکومت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

عہدِ ماضی کے تین حکومتی دور

(۱) سب سے پہلے جس عہدِ حکومت کی تصویریں یا نقوش ابھرتے وہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مہاتما گوتم بدھ کے عہد سے پہلے کے ہیں۔ بقول آر۔ ڈی۔ تیواری ”مہاتما گوتم بدھ سے پہلے سولہ جن پدوں کے عہدیں علاقہ بھوپال ادھنی (ادھین) کے مہاراجہ پردھوت کی ریاست کا حصہ تھا۔ راجہ پردھوت مگدھ کے راجہ اجات شترو کے ہم عصر تھے۔“

(۲) دوسرا دور موریہ حکومت ہے۔ اس عہد میں بھوپال کا علاقہ اشوک کی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ اشوک نے شہنشاہیت کا تاج پہننے سے پہلے اجین کے صوبیدار کی حیثیت سے اس علاقہ پر حکومت کی تھی۔ جب اشوک نے شہنشاہیت کا تاج اپنے سر پر رکھا تو اس علاقہ میں بہت سے اسٹوپ اور خانقاہیں (بدھ دیہار)

قائم کیں چنانچہ مشہور عالم ساپنجی کے اسٹوپ کا سنگ بنیاد رکھا۔ ساپنجی کی مہا اودلوگری کی تعمیر میں مہاراجہ اشوک کی مہارانی دیوی کا بڑا ہاتھ ہے۔ جو ودیشہ کی تھیں۔ بھوپال شہر میں باغ امر اوڈولھا جو سنگیں ستون ہے وہ اسی موریہ عہد کا ہے۔

(۳) پھر تیسرا دور گپت خاندان کا ہے۔ گپت خاندان کے حکمرانوں نے اپنے دور حکومت میں اس علاقہ کو خصوصی مرکز بنایا جس کا ثبوت ساپنجی کی گچھاؤں اور عمارتوں سے اودے گری کی گچھاؤں وغیرہ سے ملتا ہے۔

شہر بھوپال کی پہلی تشکیل

شہر بھوپال اس وقت صفحہ تاریخ پر ابھرا اور معرض وجود میں آیا جب عہد وسطیٰ میں ”پرمار“ فرما رواؤں کو عروج ہوا چنانچہ پرمار خاندان کے سب سے بڑے مہا پرش راجہ بھوج نے جب اس جگہ ایک عظیم بندھ باندھا اور ”بھوج تال“ کی وسیع جمیل معرض وجود میں لایا گیا۔ موجودہ شہر کا نام اسی ”بھوج پال“ کی بنا پر رکھا گیا۔ بھوپال کے مغربی رویہ مشہور منوا بھانڈ کی ٹیکری پر ایسے مندر کے آثارِ قدیمہ ملتے ہیں جو ”پرمار عہد“ دسویں صدی سے سترھویں صدی سے پہلے کے ہیں۔ چور پورہ کے ماتا مندر میں جو مور تپتی ہے وہ بھی پرمار عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے ہی مشرقی جانب جہانگیر آباد میں (جہاں اب پولس کوارٹرس ہیں) جو مورتیاں ملی ہیں وہ بھی مسلمانوں کے عہد سے پیشتر کی ہیں۔ بہر حال شہر بھوپال کے ارد گرد پتھروں پر جو کتبات یا نقش دستیاب ہوئے ہیں وہ پرمار راجاؤں کی عہد حکومت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بھوپال میں اسٹیٹ بینک کی عمارت سے ملحقہ جین جھرنا مندر میں جین مورتیاں دسویں و گیارھویں صدی کی ہیں۔ اسی طرح لال گھائی پور پرمار زمانہ کی بہت سی مورتیاں ملی ہیں جو بھوپال کے عجائب خانہ میں رکھ دی گئی ہیں۔ ایسے ہی گووند پورہ

(حال ایچ۔ ای۔ ایل) برکھڑہ پٹھانی میں بھیر و گن پتی، سورہ سمیت کئی مورتیاں (جس میں عورتوں کے نقش بھی شامل ہیں) پائی گئی ہیں۔ بھوپال میں ۱۱۹۹ء اودھے دائیں راجہ کے تانبے کے کتبے پر مارہ عہد کے ملے ہیں۔

بھوپال سے بیس کلومیٹر دور قدیم شہر بھوچپور کی بنیاد بھی پرمار سمرات بھوج نے رکھی تھی مہاراجہ بھوج نے ہی بھوچپور کے شنولنگ مندر کو تعمیرایا تھا۔ جو اس کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

”بھوپال تال“

بھوپال کے بڑے تالاب کا پشتہ (جس کو پرانی بولی میں پال کہا جاتا تھا) عام روایت کے مطابق مشہور راجہ بھوج کا عہد (۱۰۵۳-۱۰۱۰) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دو ہزار مربع ہیکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی راجہ بھوج کے پوتے اودے دتہ پرمار کی بیوی سال منی بڑی علم دوست خاتون تھی وہ شہر بھوپال کو علم و فن تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دینا چاہتی تھی۔ اس لیے انھوں نے یہاں ایک عظیم درس گاہ ۱۰۸۴ء میں تعمیر کروائی اور اس دور کی مروجہ تعلیم کا نظام جاری کر کے سبھا منڈل نام رکھا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد جب اس خاندان کو زوال ہوا تو رفتہ رفتہ وہ سبھا منڈل حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کی وجہ سے افراط فری کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گیا۔ سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارھویں صدی کے شروع میں یہ شہر گونڈ راجاؤں کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ جس کی آخری حکمران کملاپتی رانی تھی۔ جو ایک شریف علم دوست خاتون تھیں جن کی خوبصورتی و خوش سیرتی کی وجہ سے اس دور میں اس علاقہ کے اندر دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس کی شہادت اس لوک گیت سے ہوتی ہے۔ جس کی گونج آج تک ہے۔

تال ہے تو بھوپال سب میں تلیاں رانی ہے تو کملاپتی سب میں رنیاں

اس بڑے تالاب اور چھوٹے تالاب کے درمیان ایک پختہ عمارت رانی کلاپتی کا محل تھا جو آج بھی کلا پارک کے نام سے شہر بھوپال کی حسین جمیل پارک ہے۔ رانی کلاپتی کے قلعہ کے کھنڈر ہندو مسلم فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ یہ قلعہ رانی کلاپتی کے لڑکے نول شاہ کے کتبہ کا آخری ٹھکانہ تھا۔ جب سردار دوست محمد خاں بانی ریاست بھوپال کے اس مقام کو اپنی ریاست کی راجدھانی بنانے کا منصوبہ بنایا تو پھر نیا قلعہ فتحگڑھ تعمیر کرایا تو یہ قلعہ پرانے قلعہ کے نام سے شہرت پذیر ہوا جو اسی نام سے آج تک مشہور چلا آرہا ہے۔

بھوپال مختلف ادوار میں

شہر بھوپال جب پرمار خاندان کا آفتاب اقبال زوال میں آیا تو نہ صرف اس شہر کی علمی مرکزیت کو دھکا لگا بلکہ تھوڑے عرصہ میں خود اس کی شہرت بھی ختم ہو گئی پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ راجہ بھوج کا آباد کیا ہوا یہ شہر مچھیروں کی ایک بستی ایک معمولی گاؤں بن گیا۔ پرمار خاندان کے بعد پورے صوبہ میں طواف الملوکی رہی اس لیے یہ خطہ بھی بھاگ کر دوؤں، راجپوتوں اور گوندوں کے ہاتھوں میں رہا جب مہاراجہ پر تھوی راج کے بعد دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو خاندانِ غلامان میں سے سب سے پہلے التمش ^{۶۳۳ھ} نے صوبہ کے صدر مقام بھیلہ یا دیشہ کو فتح کر کے اس علاقہ کو مرکز کے ماتحت بنایا۔ جب خاندانِ خلجی مرکز دہلی میں برسرِ اقتدار آیا تو اس خاندان کے اولوالعزم شہنشاہ علا الدین خلجی ^{۹۹۲ھ} میں اس علاقہ میں اس فتحمندی کا پرچم لہرایا، دہلی کا یہی وہ بلند حوصلہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے شمالی ہند سے آگے بڑھ کر جنوبی ہند میں فاتحانہ اقتدار حاصل کر کے متحدہ ہند کے تصور کو سب سے پہلے عملی جامہ پہنایا۔ اس سے پہلے کوہ وندھیا حل اور ست پڑا کی پھیلی ہوئی پہاڑیاں اور دریائے نربدا کی

وادیوں شمالی ہند کے راجاؤں کو قدم پکڑ کر آگے بڑھنے سے روک لیتی تھیں۔ جب
 خلجی خاندان کی بساط اقتدار بھی لپٹ گئی اور تغلق خاندان کے بادشاہوں نے
 دہلی کو پایہ تخت بنا کر پورے ملک کو اپنی جولاہیوں اور معمر کہ آرائیوں کا آماجگاہ
 بنایا تو شہنشاہ تغلق نے ۷۷۷ھ میں اس خطہ کو فتح کیا اور مرکز کا صوبہ بنایا۔ اس
 کے بعد جب تیموری حملہ نے مرکز کو زیر و زبر کر دیا تو پھر صوبہ مالوہ میں دلاور خاں
 غوری نے ۸۲۸ھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور دھار کو راجدھانی بنا کر
 اس علاقہ کو اپنے ماتحت بنالیا۔ غوری خاندان کے بعد مالوہ میں بھی خلجی خاندان
 برسر عروج ہوا تو محمود شاہ خلجی نے ۷۵۹ھ میں اپنی دینداری اور بزرگوں کے ساتھ
 خوش عقیدگی کے تحت دھار میں شاہ عبداللہ چنگل اور ان کے مرید راجہ بھوج
 عرف عبداللہ وغیرہ کے مقابر تعمیر کرائے اور خطہ بھوپال میں حضرت شاہ فتح اللہ
 چشتی کی درگاہ شریف بنوائی۔ پھر اولاً شہنشاہ ہمایوں نے ۹۳۱ھ میں مالوہ کو
 فتح کیا۔ مگر پھر باز بہادر نے بازیاب کر کے اپنی حکومت قائم کی یہاں تک کہ
 اکبر اعظم نے اپنی مشہور عالم فتح مانڈو ۹۶۸ھ میں اس کو مرکز دہلی کے ماتحت
 کر دیا۔ اس کے درمیان حکومت مالوہ پر بہادر شاہ گجراتی نے حملہ کر کے ۹۶۲ھ
 میں اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا تھا اور پھر آخر دور عالمگیر ثانی ۱۱۸۶ھ تک
 یہ علاقہ دہلی کے زیر نگیں رہا۔ دار السلطنت دہلی سے مختلف صوبیدار آتے جاتے
 رہے یہاں تک کہ سردار دوست محمد خاں ۱۱۸۶ھ میں ریاست بھوپال کی بنیاد ڈالی۔

ریاست بھوپال کی اجمالی تاریخ

چونکہ ہماری اس کتاب کا تعلق سابقہ ریاست بھوپال سے ہے اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ریاست کی تشکیل اور اس کے اولوالعزم بانی اور اس کے اخلاف نوابوں اور بیگمات کے زمانے کے ان خصوصی واقعات کی رونمائی کرائی جائے جس کے اندر ان کی حریت پسندی انسان دوستی، رعایا پروری اور ریاست کے باشندوں کے درمیان اتحاد باہمی کی ان پرانی قدروں کے نقوش کو اجاگر کیا جائے جن کو سامراجی مورخوں نے اپنی ستھری اور روپہلی مصلحتوں کی خاطر مدھم کرنے کی کوشش کی ہے حصول اقتدار اور شہرت و ناموری کے لیے رستہ کشی بلند حوصلہ انسانوں کی پرانی بیماری ہے۔ جس سے کوئی قوم، کوئی ملت خالی نہ رہی جس کو پچھلے زمانہ میں خدمت خلق کے پیرایہ میں اور مغربی سامراج نے غیر مہذب قوموں کو مہذب بنانے کے پردہ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

حکومت و سلطنت کے لیے خانہ جنگی و براہ کشتی تاریخ انسانی کی ایک دل خراش و غمگین گوشہ ہے جس کے نقوش کو اس دور میں ابھارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ریاست بھوپال کی تاریخ کے لیے گلستانِ ارم کا یہ لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بانی ریاست دوست محمد خاں جب اپنی قسمت آزمائی کے لیے سرزمین مالوہ میں فروکش ہوئے تو عام مسلمانوں خصوصاً سیدھے سادے پٹھانوں کی طرح ایک صاحب کشف درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سردار صاحب اس وقت بھوکے تھے اور ان روشن ضمیر بزرگ کے سامنے ابلے ہوئے چاول رکھے ہوئے تھے۔ درویش نے فرمایا: ”خان اگر تو یہ سب

چاول کھالے تو ہم تجھ کو دہلی کی حکومت دے دیں گے اور اگر آدھے آدھے چاول
 کھالے تو حیدر آباد کی ریاست عطا کریں گے اور اگر ایک چوتھائی کھالے گا تو تجھ کو مالوہ
 بخش دیں گے۔ سردار صاحب نے بہت کوشش کی لیکن چوتھائی سے زائد نہ کھاسکے
 درویش نے فرمایا: حکم رب العالمین تجھ کو مال و متاع، کثیر اولاد اور حکومت عطا کی گئی
 لیکن تیری اولاد آپس میں اس طرح لڑے گی جیسے دو کتے ہڈی پر لڑتے ہیں

(بحوالہ فرما روایان بھوپال ص ۲۹)

اس لیے راقم السطور نے تاریخ کے ان اوراق کو قصداً ان لوگوں کے لیے
 چھوڑ دیا ہے جن کو ہڈیوں کی چھینا چھینٹی سے دلچسپی ہے۔

حکومت مغلیہ کا زوال اور ریاست بھوپال

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی سلطنت کا مرکز ضعیف و کمزور ہو جاتا ہے اور اپنے ماتحت علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو ملک میں طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور ماتحت صوبے خود مختاری کا جھنڈا لہرانے لگتے ہیں چنانچہ مغل شہنشاہیت جو ظہر الدین بابر کے ہاتھوں ہمارے ملک میں قائم ہوئی درمیان میں شیر شاہ سوری کی مختصر مدت چھوڑ کر نصیر الدین ہمایوں سے اس کو استحکام حاصل ہوا اور جلال الدین اکبر نے وسیع و عریض فتوحات ہندوستان کے جنوب و شمال کو ایک لڑی میں پرونے کی عظیم سعی کی پھر نور الدین جہانگیر اور شہاب الدین شاہجہاں کے سنہری دور میں ہندوستان مغلوں کے ترقی و ذوق ملک کی سرسبزی و شادابی اور خوشحالی کی جنت بن گیا۔ مغل سلطنت کا نقطہ عروج عالمگیر اعظم اور ان کے جانشین بہادر شاہ اول کا دور ہے جبکہ ہمارے ملک کی سرحدیں ایک طرف بلخ و بخارا تک اور دوسری طرف نیپال و تبت تک پہنچ گئی تھیں اور نگ زیب نے اپنے عہد میں سب سے پہلے جنوبی ہند کی جملہ ریاستوں کو مرکز کے ماتحت کر کے متحدہ ہند کے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا۔ لیکن قدرت کا یہ قانون ہے کہ ہر عروج و راز و ال جب بھی کوئی چیز درجہ کمال پر پہنچ جاتی ہے تو وہی نقطہ کمال اس کے زوال کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یوں بھی بقول علامہ ابن خلدون ہر شخصی سلطنت چوتھی پانچویں پر پہنچ کر روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس قدر عظیم و طویل و عریض سلطنت کے لیے جس بھاری بھر کم متحرک و فعال شخصیت کی ضرورت تھی افسوس کہ عالمگیر اعظم کے بعد پھر اس خاندان تیموری میں اس درجہ کا کوئی بادشاہ پیدا نہ ہو سکا اور آخر میں بادشاہ امر کے ہاتھوں مغل بادشاہ

ایک کھلونہ بن کر رہ گئے۔ اور پھر اس مغل خاندان کو وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ
بقول اقبالؔ

حیثیت جس کو کہتے ہیں گئی تیمور کے گھر سے

سامراجی مورخوں نے اپنی ڈپلومیسی و حکمت عملی کی بنا پر اورنگ زیب جیسے
عظیم کردار انسان کے توراتی چہرہ پر تعصب کا گرد و غبار اڑایا اور اس درویش
صفت بادشاہ کو مغل شہنشاہیت کے زوال کا ملزم گردانا ہے۔ اس لیے یہاں
پہنچ کر ہم کو مغل حکومت کے زوال کے بنیادی وجوہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب
معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو بقول غالب ہر تعمیر میں تخریب کی صورت مضمر ہوا کرتی ہے
کیونکہ یہ عالم ہی عالم کون و فساد ہے لیکن سلطنت یا حکومت جو مختلف انسانی طبقات
میں توازن قائم رکھنے سے چل سکتی ہے اس کے اندر باہمی توازن قائم کر کے اس
قافلہ حیات کو آگے بڑھاتے رہنا ہر ایک انسان کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ ان مختلف
طبقوں میں اقتدار پرستی کی کھلی ڈھکی جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ جیسے عناصر
اربعہ کے اعتدال کا نام حیات و زندگی ہے اسی طرح انسانی اجتماعیت میں اس
اعتدال و توازن کا قائم رکھنا مدبرانہ سیاست کا کام ہے۔ مغل شہنشاہیت کا
قوام ایرانی و توراتی امارات کے عہدوں اور مناصب سے تیار ہوا تھا۔ جب تک
ایسے طاقتور بادشاہ رہے جو ان امارات پر قابو پاتے اور توازن قائم رکھتے رہے
مغل حکومت کا نظام صحیح طور پر چلتا رہا اور جہاں اقتدار کی باگ ڈور رکھنے والے
ہاتھ کمزور ہوئے سلطنت کے اندر خانہ جنگی و برادر کشی کا چکر چلنے لگا۔ ایرانی
و توراتی آویزش کی جرّ بنیاد یہ ہے کہ جب ہمایوں بادشاہ سوری خاندان سے
شکست کھا کر ایران پہنچا اور صفوی بادشاہ سے مدد کا طالب ہوا تو ایرانی شہنشاہ
نے اس شرط کے ساتھ ہمایوں کو ایدادی کہ سلطنت کا وزیر اعظم ایرانی ہوگا
اور امیر الامرات توراتی چنانچہ اس پر عمل درآمد ہوتا رہا اور اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ
اول تک جیسے طاقتور فرماؤ اس نظام کو مضبوطی سے قائم رکھتے رہے لیکن عالمگیر اعظم

کے اٹھ جانے کے تھوڑے دنوں بعد توازن قوت (بلیس آف پاور) درہم برہم ہونے لگا اور اندرونی تصادم رنگ لانے لگا۔ بقول علامہ گیلانی "تاریخ اسلام کی ابتداء سے جن کے دل میں دنیا طلبی کی انگلیٹھی سلگی اس نے دین کے اس سلسلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص و ہوس کی جہنم روشن کی۔"

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۱۹۲)

بہر حال مغل شہنشاہیت ایرانی، تورانی (شیعہ و سنی)، آویزشوں کا شکار ہو کر بیرونی خطرات سے آنکھیں بند کئے تیزی سے زوال کی طرف جا رہی تھی اندرونی فتنے بار بار سراٹھا رہے تھے اور ہر ایک کا نزلہ کمزور عضو (دار السلطنت دہلی) پر گر رہا تھا۔ نہ تخت طاؤس باقی رہا تھا نہ اس کے مستحق مسند نشین رہے تھے۔ نادر شاہ شامت اعمال بن کر خون کے دریا بہا کر تخت طاؤس لے کر ایران جا چکا تھا اور مغل بادشاہ ان امرا کی کٹھ پتلی بن کر مسلسل بدلتے رہتے تھے مگر عہد گردی جاٹ گردی نے دار السلطنت کی خاک اڑا دی تھی۔ رہی ہی کسرا بدالی نے پوری کردی۔ دہلی والوں کے لیے ہر صبح، صبح محشر اور ہر شام، شام قیامت بن کر آرہی تھی۔ بادشاہ گرسادات کے ہاتھوں فرخ سیر کا قتل پہلا سانحہ تھا جس نے سلطنت کے رعب و داب کو ختم کر کے رکھ دیا آصف الدولہ نظام الملک سے جب حسین علی خاں کا خاتمہ ہوا تو محمد شاہ کو از سر نو سانس لینے اور خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے سلطنت کے مردہ جسم میں روح زندگی پھونکنے کا موقع ملا لیکن پھر نادر شاہ درانی کے حملہ نے حکومت کی چولیس ہلا دیں۔ بعد میں احمد شاہ بدالی پانی پت کی فوجیابی کے بعد ہر چند سابقہ احوال کی بحالی کی کوشش کی لیکن مغل سلطنت بھر نہ پنپ سکی۔ بہر حال مرکزی حکومت کی کمزوری سے ایک طرف اس وقت کی منہ زور طاقتوں کی بن آئی اور دوسری طرف جو طاقتور امرا اور صوبیدار تھے انہوں نے اپنے علاقوں میں خود مختاری کا علم لہرا دیا۔ مشرقی ہند (پورب) میں ایرانی سلطنت (حکومت آصفیہ) کی لکھنؤ میں داغ بیل پڑی اور جنوبی ہند (دکن) میں نظام الملک نے اپنی حکومت قائم کی۔

سیاستِ ہند میں سرحدی پٹھانوں کا داخلہ

اب یہاں پر ایک اہم تاریخی سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ جب مغل سیاست ایرانی و تورانی امرار سے وابستہ رہی تھی تو سرحدی پٹھانوں کی یہ تیسری طاقت کہاں سے ابھر آئی۔ آزاد سرحد کی یہ خوانیں درہ خیبر اور گولان کی پہاڑیوں کے اندر محصور آزاد قبائلی زندگی میں مست و مگن، بیرونی دنیا اور اس کے سیاسی جھگڑوں سے کوسوں دور اپنے آزاد علاقہ میں خوشحال خاں خٹک کے آزادی کے گیت گاتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے۔ یہ ان سرحدوں کو پھاند کر مضطرب ہندوستان کی سیاست میں کیوں کر داخل ہوئے؟ اس اہم تاریخی سوال کے حل سے ریاست بھوپال کی تشکیل کا پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے اس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کا حقیقی جواب حملہ نادر کی میں مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نادر شاہ درانی بھی امیر تیمور کی طرح ایک قہر الہی بن کر آیا تھا اس کی تلوار کے سامنے بھی کوئی نہ ٹک سکا۔ مغل شہنشاہیت اپنے پورے لاؤ لشکر اور جاہ و حشم کے باوجود اس کے وحشیانہ حملوں کی تاب نہ لاسکی۔ مغل حکومت کا مضبوط و مستحکم محل ایک جھٹکے میں زمین بوس ہو کر رہ گیا۔ تین دن تک چاندنی چوک اور دلی میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ قزلباشوں نے کشتوں کے پشتے لگا دئے اور کوئی طاقت اڑے نہ آسکی۔ بہر حال نادر شاہ چونکہ کابل و قندھار اور یاغستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ راستہ میں آزاد سرحد کے ان آزاد قبائل نے روک بننا چاہا لیکن یہ سرحدی پٹھان بھی اس کی تاب نہ لاسکے ہر مقام پر ان کے پاؤں اکھڑ گئے

آفریدی و مہندری و مسعودی اور دوسرے پٹھان قبیلوں کو اس کے مقابلہ میں زک
ایٹا بنا پڑی اور اس قہر خداوندی کی تلوار نے ان کو منتشر و پراگندہ کر دیا۔ چنانچہ
ان بکھرے ہوئے افراد نے اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت ہو کر جنگی خدمات
کے لیے آزادانہ یا ملازمانہ مرکز بنانا شروع کر دیے۔ (سیر المتاخرین ص ۴۸)

محمد خاں (روہیلے) نے قندھار وغیرہ کے جرگوں کو اکٹھا کر کے اور اعتماد الدولہ
کی نگاہ التفات سے سرفراز ہو کر روہیلکھنڈ کی بندیل کھنڈ کے مقابل بنیاد ڈالی
اور آملہ کو پایہ تخت بنایا جس کے جانشین حافظ الملک رحمت خاں نے ایک
فلاحی ریاست قائم کی۔ جس کو فرنگی سامراج کے اشارہ پر شجاع الدولہ لکھنؤ نے
ختم کیا اور نجیب الدولہ نے نجیب آباد کی ریاست ہمالیہ کی ترائی میں قائم کی
احمد شاہ ابدالی نے اس منتشر طاقت کو منظم کر کے پانی پت کے آخری میدان میں
ان خانہ برباد پٹھانوں کے لیے نہ صرف زمین ہموار کی بلکہ شاہ عالم سے عہد لیا کہ
بادشاہ تو مغل رہیں گے اور قلمدان وزارت نواب اودھ اور امیر الامرائی کا عظیم
عہدہ نجیب الدولہ کے سپرد ہوگا۔ اس نظام سے مغل شہنشاہیت نے کچھ دن سنبھالا لیا
لیکن اندر سے اس کی جان نکل چکی تھی۔ فرنگی سامراج کی ریشہ دوانیاں اندر ہی
اندر چل رہی تھیں اس لیے یہ آخری نسخہ بھی سلطنت کی زندگی بڑھانے کے لیے
کار گزرنہ ہو سکا۔ بہر حال روہیل کھنڈ، نجیب آباد، فرخ آباد، باندہ، ٹونک وغیرہ
پٹھانوں کی ریاست بنیں۔ ریاست بھوپال جو ہماری موضوع بحث ہے وہ بھی
ان پٹھانوں کی یادگار تھی جو نیم آزاد سابقہ ریاستوں کی طرح ۱۹۴۹ء تک رہی
اور پھر انڈین یونین میں ضم ہو گئی۔

بانی ریاست سردار دوست محمد خاں کی اولوالعزمی و سادگی اور

انسان دوستی

سابقہ ریاست بھوپال کے بانی سردار دوست محمد خاں افغانی قوم آزاد سرحد (تیسرا)

کے باشندے ایک سیدھے سادے مسلمان اور انسانیت دوست پٹھان اور ایک
 اولوالعزم بہادر انسان تھے۔ حکومت و ریاست کی نخوت و غرور سے نفور اور
 درباری شان و شوکت سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے
 انتقال کے بعد جب بہادر شاہ اول اس کے جانشین ہوئے اور مرکز کی کمزوری
 نے ہر طاقتور و حوصلہ مند سرداروں کو اقتدار قائم کرنے کا سنہرا موقع دیا اور ہر
 دلیر و بہادر اپنی فوجی و جنگی طاقت کی بنیاد پر مغل شہنشاہیت کے اندر حصہ بٹانے
 کے لیے سرگرم ہوا تو سردار صاحب ہندوستان رحمۃ اللہ علیہ آئے۔ اولاً جلال آباد پھر
 دہلی اور مالوہ پہنچے۔ اس دور میں فرنگی سامراج کی لائی ہوئی فرقہ پرستی کی پرچھائیاں
 بھی کسی پر نہ پڑی تھیں اس لیے منگل گڈھ کی رانی کے یہاں ملازم ہو گئے اور اپنی
 بہادری و وفاداری کا یقین رانی کے دل میں قائم کیا کہ ان کو بیٹا بنالیا۔ یہیں سے
 ان کے روشن مستقبل کا دروازہ کھلا وہ مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔
 پھر جب یہاں ان کے قدم جم گئے تو اپنے رشتہ داروں کو بلا کر ایک جمعیت تیار کی
 اور قسمت آزمائی کے لیے اس علاقہ کو منتخب کیا۔ بیرسیہ کو اس کے جاگیردار تاج محمد خا
 سے قاضی محمد صالح اور سب دل رائے کے واسطے سے حاصل کیا۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں
 اور ٹھاکروں کے ظلم و زیادتی سے بد امنی کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مظلوموں، کمزوروں
 کی دعوت پر ان کی طاقت کو توڑ کر پاداشوں و جگدیش پور (اسلام نگر) وغیرہ پر
 قابض ہوئے۔ محمد فاروق حاکم بھیلہ سے معرکہ آرائی میں کامیاب ہو کر یہ علاقے
 ان کے تصرف میں آ گئے۔

سردار صاحب کی خوش آئند ترقیات کا عروج

جب وہ دور آیا کہ نظام شاہ گونڈ کی بیوہ رانی کملاپتی نے اپنے شوہر کے
 قاتلوں کو بدلہ لینے کے صلہ میں سردار صاحب کی بہادری و ہمدردی کی وجہ سے
 ان کو اپنا بیٹا بنالیا اور ان کو موضع بھوپال دے دیا۔ انھوں نے ایک حکم جاری کر دیا

کہ جو شخص اس خطہ میں سے جتنا برو (گھاس) کاٹ کر صاف کرے وہ زمین اسکی ہے چنانچہ برو کاٹ بھوپالی کی اصطلاح اس دور کی یادگار ہے۔ شہر بھوپال کی دوبارہ قسمت اس وقت جاگی جبکہ سردار صاحب نے بھوپال کو ریاست کی راجدھانی بنایا اور اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مزدور بن کر قلعہ کی چار دیواری تعمیر کرنا شروع کی اور بھوپال کے پہلے قاضی محمد معظم کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھوائی شہر کے دروازوں کو ہفتوں کے نام سے موسوم کیا اور اپنی بیوی کے نام پر قلعہ کا نام فتحگڑھ رکھا۔ فتح بی بی ان کی بیوی نے ایک ہندو بچے کی پرورش کی تھی جو مسلمان ہو کر ابراہیم خاں کہلایا وہ اس قدر وفادار ثابت ہوا کہ سردار صاحب کو ایک بار بھوپال چھوڑنا پڑا تو ابراہیم خاں جملہ امور خانگی کے ذمہ دار بنائے تھے آج بھی محلہ ابراہیم پورہ ان کی یادگار ہے۔

راقم السطور کے بچپن میں جب مسجد ابراہیم پورہ کی نئی تعمیر کے وقت ان کی نقش نکلی وہ صحیح و سالم حالت میں تھی۔ بھوپال کے مشرقی و مغربی علاقہ آشتہ سہیور خین پوری باڑی وغیرہ ان کے قبضہ میں آگئے دیوان وجے رام نے اپنا علاقہ شجالیپور کی از خود پیش کش کی ان کی نیکی و بزرگی کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب وہ ان علاقوں پر فتیاب ہو گئے تو انھوں نے اپنے والد نور محمد سے اور ان کے انکار کرنے پر بھائیوں سے حکومت کرنے کی درخواست کی۔ جب سب نے متفق ہو کر خود ان کو سردار بنانا طے کیا تو اس منصب کو قبول کیا۔

(سلک مردارید)

وہ اپنی رعایا میں گھل مل کر رہتے اور عام رعایا ہندو مسلم ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتے تھے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی امداد کے لیے میدان میں کود پڑتے جس کی وجہ سے اس علاقہ میں ہردلعزیز ہو گئے۔ ان کی انسان دوستی کا واقعہ یہ ہے کہ ایک لڑائی میں وہ زخمی ہو کر گرے ان کے پاس ایک اور زخمی پیاس سے تڑپ رہا تھا جب یو چھا تو معلوم ہوا کہ وہ مخالف فوج کا سردار ہے۔ لیکن انھوں نے

اپنی پانی کی چھاگل نیزہ میں لگا کر اس کے منہ کے قریب کر دی اور اس کو پانی پلا کر حیات نو بخشی۔

سردار صاحب نے تیس سال کی مدت میں ریاست کے رقبہ کو پچیس ہزار مربع میل تک وسیع کر کے ایک چھوٹی سی ریاست چھوڑ کر ^{۱۱۵۳ھ} ۱۷۴۰ء میں انتقال کیا اور قلعہ فتحگڑھ میں دفن ہوئے۔

نواب یار محمد خاں ان کی دلاوری اور علوم نوازی

جب سردار دوست محمد خاں کا انتقال ہوا تو ان کے بڑے صاحبزادے یار محمد خاں نظام کے یہاں حیدر آباد میں نظر بند تھے جس کا قصہ یہ ہے کہ نظام الملک آصف خاں ^{۱۱۳۳ھ} ۱۷۲۰ء میں صوبیدار مالوہ محمد شاہ بادشاہ کی طرف سے ہو کر آیا تھا اور اس کا مقابلہ دلاور خاں نے برہان پور میں ^{۱۱۳۳ھ} ۱۷۲۰ء میں کیا تھا۔ دلاور محمد خاں کی مدد سردار صاحب کے بھائی منیر احمد خاں نے کی تھی جس کی وجہ سے جب نظام الملک صوبیدار دکن بھوپال سے ^{۱۱۵۲ھ} ۱۷۳۹ء میں گزرے اور سردار صاحب کی گوشمالی کرنا چاہی تو سردار صاحب نے باہمی صلح کر کے یار محمد خاں کو برغال کے طور پر نظام کے ساتھ کر دیا۔ جب ان کے انتقال کی خبر وہاں پہنچی تو نظام نے بلا کر تعزیت کی جس کے جواب میں یار محمد خاں نے عرض کیا کہ ایک پٹھان کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو کیا ہوا حضور کا سایہ تو باقی ہے۔ اس جواب سے نظام نے خوش ہو کر نوابی کے خطاب و شاہی مراتب کے ساتھ ان کو بھوپال روانہ کیا۔ اس اثناء میں ریاست کے تخت پر ان کے بھائی سلطان محمد خاں کو بٹھایا گیا۔ ان کے آنے پر یار محمد خاں تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے دیوان عاقل محمد خاں کے انتقال پر دیوان مجے رام کو اپنا دیوان یا مدار المہام بنایا۔

مانجی مولا بی اور ان کی حسن تدبیر و رعایا پروری

نواب یار محمد خاں اولوالعزمی و بہادری میں اپنے پدر بزرگوار سے پیچھے نہ تھے

چنانچہ دائرہ ریاست کو بے حد وسیع کیا کوٹہ بوندی کے علاقہ تک وہاں کے راجہ سے جنگ کر کے فتحیاب ہوئے اور وہاں کی راجکاری مولابی سے بعد قبول اسلام عقد نکاح کیا جو مانجی مولابی کے لقب سے مشہور ہوئیں اور حضرت غوث قادری سے بیعت ہو کر درجہ ولایت کو پہنچ گئیں۔ امور سلطنت میں ان کا برابر کا ہاتھ رہا۔ اس قدر رعایا پر ور و رحمدل تھیں کہ جب تک یہ نہ معلوم کر لیتیں کہ شہر میں کوئی بھوکا باقی نہ رہا اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ مانجی صاحبہ کی مساجد اور باؤلی داسلام نگر یادگار ہیں۔

یار محمد خاں ایک دلیر و بہادر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے علم دوست اور علماء نواز بھی تھے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ہی مفتی قاضی خیر اللہ صدیقی کو جو مالوہ کے زبردست عالم فاضل تھے ریاست کے افتار کے لیے خصوصی حقوق و مراعات کے ساتھ بلایا۔ موصوف کی آمد سے شہر بھوپال علم و فضل کا شہر بن گیا۔ ان کے زمانہ ہی میں ایک گننام نگر زبردست مورخ رستم علی شاہ آبادی نے شہر بھوپال کے پرسکون خطہ کو اپنا مستقر بنا کر ہندوستان کی سچی اور اہم تاریخ لکھی جس تاریخ نے سر جان مالک کو بقول یوسف قیصر مالوہ کی تاریخ کا مورخ بنا دیا۔ اس تاریخ کا ایک نسخہ قلمی و غیر مطبوعہ برٹش میوزیم میں ہے۔

اسی طرح اخوند جی ہردہ کو بھی بھوپال مدعو کیا۔ جو ایک قابل فاضل عالم اور مورخ تھے۔ ہنڈیا جہانگیر ان کو دی گئی۔ رستم علی کی تاریخ اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے بلار و رعایت خوشامد پرستی ہندوستان کی سچی تاریخ

بھوپال کی آزاد فضا میں تحریر کی۔ یار محمد خاں نے تیرہ سال برسر اقتدار رہ کر اور ریاست کی علمی و توسیعی ترقی دیتے ہوئے ۱۱۶۴ھ میں انتقال کیا۔ اپنی قائم کردہ راجدھانی اسلام نگر میں دفن ہوئے

نواب فیض بہادر شاہ اور ان کی روحانیت و درویشی

ریاست کا یہ دور ہر دو فرار و اوّل کی دلاوری و بہادری کی بنا پر توسیع ریاست کے حق میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ لیکن اس کے بعد جب نواب فیض محمد خاں مسند نشین ہوئے تو ایک طرف اندرونی خانہ جنگی اور دوسری طرف بیرونی طاقتوں مرہٹوں کی حملہ آوری سے یہ ریاست خطرات میں گھر گئی تھی۔ نواب صاحب کم سن و نو عمر تھے لیکن مانجھی مولابی کے حسن تدبیر اور انتظامی صلاحیت نے ریاست کو منجھدار سے نکال لیا۔ جو مدعی ریاست بن کر کھڑے ہو گئے تھے ان کو نواب صاحب نے اپنی بہادری اور مانجھی مولابی نے اپنی حکمت عملی سے خاموش کر دیا۔ نواب فیض محمد خاں کا اہم کارنامہ قلعہ رائسین کو اور اس کے قلعہ دار نوید خاں سے فتح کر کے حاصل کرنا ہے جو ایک نہایت کاہل الوجود اور عیش پرست آدمی تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب بادشاہ دہلی کو مع نذرانہ کے دی گئی تو وہاں سے ان کو فیض الدولہ فتح جنگ کا خطاب دیا جا کر یہ علاقہ ریاست کے قبضہ میں دیدیا گیا جیسا کہ لکھا جا چکا کہ اس دور کے اندر ایک نئی طاقت (مرہٹوں کی) جنوبی ہند سے ایک طوفان بن کر پورے ملک کو زیر و زبر کر رہی تھی اور یہ ریاست رہ گزر میں کانٹا بن کر کھٹکتی تھی۔

اس لیے پونا کے پیشوا نے جو صوبیدار مالوہ بن کر آیا تھا بھوپال پر چڑھائی کی جس کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لیے مانجھی مولابی کے مشورہ سے آدھی ریاست دے کر صلح کر لی گئی۔ اس وقت کے حالات کی پر آشوبی اور خود

نواب صاحب کی درویشانہ طبیعت نے ان کو عبادت الہی کی طرف مائل کر دیا اور شاہ محمد غوث قادری کے حلقہ ارادت میں داخل اور اشغال باطنی کی تکمیل سے وہ نواب کے بجائے فیض بہادر شاہ ایک ولی کامل کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے اور ان کی کرامت کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے کہ جب ۱۱۴۳ھ میں باگی راہ پیشوا

ابدالی سے مقابلہ کے لیے پانی پت جا رہا تھا تو اس نے فیض بہادر شاہ کے ساتھ جانے کے انکار پر دھمکی دی کہ واپسی میں اس پٹھان کو سمجھ لوں گا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ بھاؤ واپس ہی نہ آئے گا۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں ہی ۱۱۴۵ھ میں مرہٹہ طاقت کی شکست ہوئی۔ تاریخ مالوہ میں ہے کہ نواب چاہتے ہیں وہ غیب سے ہوتا ہے۔ دیوان بجے رام نے ان کے دور میں وفات پائی جو ریاست کا مخلص وفادار تھا اور خود نواب صاحب نے ۱۱۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ وہ ایک عابد و زاہد، صوفی منش، گوشہ نشین، فیاض، رحمدل انسان تھے۔ ان کا قد سات فٹ کا اور ان کے ہاتھ بھی بڑے تھے۔ اہل بھوپال ان کو ایک ولی اللہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی بیوی صالحہ بیگم نے ان کے مزار پر گنبد وغیرہ تعمیر کیا۔

نواب حیات محمد خاں اور انکی گوشہ نشینی

نواب فیض محمد خاں چونکہ لا ولد تھے اس لیے ان کے بھائی حیات محمد خاں کافی ہنگامہ آرائی کے بعد مسند ریاست پر بیٹھے۔ انھوں نے دیوان چھوٹے خاں جو ایک نو مسلم تھے اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالا تھا۔ دیوان ریاست بنایا تھا جن کی خدمات ریاست کے لیے دیوان بجے رام سے کم اہم نہ رہیں۔

دیوان چھوٹے خاں کے کارنامے

سب سے پہلے اس نے خانہ جنگی (جو سردار صاحب کے خاندان کے اندر ادکی طرف سے ریاست کے لیے برپا تھی) اس کو بزور طاقت ۱۲۰۱ھ میں ختم کیا۔ پھر بیرونی فتنوں جس کے اندر سب سے بڑا فتنہ پنڈاروں کا تھا، دبا دیا۔ پنڈاروں کے جب بھوپال پر حملہ ہوئے تو اس نے شکست دے کر ہر ایک کو ایک ایک پگڑی اور نذرانہ دے کر احسان مند بنالیا۔ راجہ بھوج کے بندھ کے بعد سے دوسرا بندھ شہر کے

مشرق رویہ اسی نے باندھا اس لیے وہ چھوٹا تالاب کہلایا۔ بعد میں یہ کچا پل "پل پختہ" بن گیا۔ دیوان چھوٹے خاں ایک مدبر و منتظم دیوان ثابت ہوا۔ یہی وہ چھوٹے خاں ہے جس نے خانوادہ دلی اللہ کے چشم و چراغ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو بھوپال کیلئے دعوت دی، وہ علماء و فضلاء کا بے حد قدرداں تھا۔ اس کے انتقال ۱۲۰۹ھ کے بعد ریاست میں افراتفری پیدا ہوئی۔ ہوشنگ آباد ریاست کے ہاتھ سے نکل گیا۔ نواب صاحب گوشہ نشین عبادت تھے۔ ان کی بیوی عصمت بیگم نے جو ایک بیدار مغز خاتون تھیں اور ان کا اور نواب صاحب کا معاملہ جہانگیر و نور جہاں کا تھا، اپنی انتظامی صلاحیت سے بد امنی کو دور کرنا چاہا۔ مرید محمد خاں کو دیوان بنایا لیکن بگڑی حالت نہ سنبھل سکی تب وزیر محمد خاں کو ملایا جو سردار صاحب کی اولاد سے تھے اور جنھوں نے دوسروں کے یہاں ملازم ہو کر اپنی بہادری کا سکہ دلوں پر بٹھایا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ریاست کو مرہٹوں کے زرعہ سے نکالا۔ نواب وزیر الدولہ خطاب ملا۔ قلعہ راسین کو دوبارہ ریاست میں داخل کیا۔

نواب وزیر الدولہ اور ان کی غیر معمولی بہادری

جب نواب حیات محمد خاں کا انتقال ۱۲۳۲ھ میں اور اقتدار حاصل ہوا نواب غوث محمد خاں نواب بنائے گئے لیکن سارے اختیارات وزیر الدولہ کے ہاتھ میں رہے۔ غوث محمد خاں نے ساز باز کر کے راگھوجی بھونسلہ ناگپور کے ذریعہ نواب صدیق علی خاں کو بلا کر ان کی طاقت کو توڑنا چاہا قریب تھا کہ ریاست ختم ہو جائے کہ وزیر الدولہ بھوپال کے نجات دہندہ کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور ریاست کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکال لیا۔ راگھوجی بھونسلہ ناگپور اور سندھیا وغیرہ مرہٹہ متفقہ افواج نے بھوپال پر ۱۸۱۴ء میں اس شدت سے حملہ کیا کہ شہر خطرہ میں پڑ گیا۔ اس وقت شہر کی عورتوں نے اس قدر بے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن جو اندرون شہر گھس آیا تھا اس کو باہر نکال دیا اور دشمن کے چھکے چھڑادے یہ ریاست کے لیے

ایک خطرناک دور تھا کہ شہر بھوپال کو جنگی سات حملوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن نواب وزیر الدولہ کی کمال جواں مردی سے ریاست خون کے دریا سے سرخ رو ہو کر شکلی ان کی فتوحات سے ان کا رعب داب ملک میں بیٹھ گیا اور بانڈے گھوٹے والے نواب کے نام سے شہرت پائی۔ یہی وہ دور تھا جب کہ فرنگی سامراج نے پورے ملک میں سیاسی ریشہ دوانیاں پھیلا رکھی تھیں ریاست بھوپال کو بھی معاہدہ باہمی کے جال میں پھانس لیا۔ جس کے نتیجہ میں ریاست غوث محمد خاں کی اولاد سے منتقل ہو کر ان کے بیٹے نظر محمد خاں کو ملی۔ جن کی شادی نواب گوہر بیگم دختر غوث محمد خاں سے اتحاد باہمی کے لیے کر دی گئی۔

نواب نظر محمد خاں اور انگریزوں کی معاہداتی جکڑ بندی

نواب وزیر محمد خاں کے ۱۲۳۱ھ و ۱۸۱۶ء میں اپنے پرانے بیٹے نظیر الدولہ کے ساتھ نواب بھوپال بن گئے۔ اس وقت کی بدامنی اور مرہٹہ گردی کے فتنہ سے بچنے کے لیے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کر کے ریاست کی نیم آزادی پر قناعت اختیار کر لی۔ سیہور چھاؤنی پولیٹیکل ریجنٹ مقرر ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے والد مرحوم کی بہادری و انتظام ملکی میں قدم بہ قدم تھے۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ باہمی معاہدہ ان کو اس نہ آیا اور ان کے خاندان میں ناراضگی و برہمی پھیل گئی اور تین سال حکومت نہ کر پائے تھے کہ ایک روایت کے مطابق اپنے برادر نسبتی فوج دار محمد خاں کے ہاتھ سے شہید ہو گئے ان کی موت سے نوابان بھوپال کے پر آشوب خونیں دور سے ریاست نکل کر بیگماتی پر امن زریں عہد کے اندر داخل ہو گئی۔ نواب گوہر بیگم ان کی جگہ پر مسند ریاست پر بیٹھ گئیں۔

نواب قدس بیگم ان کی شانِ ولایت و غربا پروری

گوہر بیگم دختر نواب غوث محمد خاں جن کو اپنی پاکیزہ نفسی اور غیر معمولی نیکی و پرہیزگاری

کی وجہ سے قدسیہ لقب ملا اپنے شوہر کے سانحہ شہادت پر ان کو فرماں روا ۱۲۵۳ھ میں بنادیا گیا۔ راجہ خوشوقت رائے حاکم شہر نے مع ان صاحبان کے جو ریاست کے قدیمی خیر خواہ تھے ریاست کے فتنوں کو دبایا۔ لیکن پولٹیکل ریجنٹ انگریز بہادر کے اولاد منیر محمد خاں پھر جہانگیر محمد خاں کے ساتھ ان کی بیٹی سکندر بیگم کے ساتھ رشتہ نکاح کے لیے مجبور کر کے نظم و انتظام میں ابتری پیدا کر کے اور آخر میں ایک لیکہ کاملہ اور ایک درویش منش بیگم کو ۱۲۵۳ھ میں تخت ریاست سے اتار دیا۔

قدسیہ بیگم نے اولاً اپنے بھائی میاں فوجدار محمد اور پھر منیر محمد خاں کو مختار ریاست بنانا چاہا لیکن پولٹیکل ریجنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی خاطر اجازت نہ دی۔ پھر راجہ خوشوقت رائے مختار ہوئے جو وزیر خوش تدبیر ثابت ہوئے۔ خود قدسیہ بیگم ایک نہایت مدبر و منتظم خاتون تھیں۔ ہندو مسلم رعایا ان کی نظر میں یکساں تھی۔ وہ ہر ایک کی فریاد بذات خود سنتیں اور پھر گھر گھر جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے جملہ معاملات دارالقضار میں فیصلے پاتے۔ ان کی دین داری کی شہادت بھوپال کی پختہ و سنگین و بلند و بالا جامع مسجد ہے۔ انھوں نے ذوق روحانی کی تکمیل قادری سلسلہ میں کی۔ ان کی زندگی اولیاء اللہ کی تھی۔ وہ اپنی رعایا کے پریشان حال اور مصیبت کے ماروں کے پاس خود پہنچتی اور ہر ایک کی امداد کرتی۔ وہ پہلی والیہ جنھوں نے اپنے مصارف سے آب رسانی کا انتظام (نل وغیرہ) جاری کئے اور ٹھیکس سے رعایا کو مستثنیٰ رکھنے کے لیے خزانہ میں روپیہ جمع کیا۔ جس کا فیض آج تک جاری ہے۔ ان کی عادت شریفہ تھی کہ دسترخوان بچھانے سے پہلے پوچھتیں کہ شہر کی غریب رعایا میں سے کوئی ایسا گھر تو نہیں رہ گیا جہاں فاقہ ہو۔ ان کے نقیب محلے مقرر تھے جو اس کی خبر پہنچاتے کہ ہر غریب و مسکین کو دیوڑھی سے کھانا پہنچا دیا گیا ہے۔ پھر وہ سوال کرتیں کہ مسجدوں، سراؤں اور دھرم شالاؤں میں تو کوئی بھوکا نہیں رہ گیا۔ ان کے ملازم ڈھونڈ ڈھونڈ کر، دوڑ دوڑ کر ہر جگہ کی خبر لا کر ان کو پہنچاتے تو پھر کہتیں کہ بھڑو دا شہر کی چار دیواری کے باہر بھی قافلے اور مسافر اترتے ہیں

اس کی رپورٹ لا کر دو کہ وہ بھی پیٹ بھر کر سو گئے۔ فقیر کے دادا (سید شاکر علی صاحب مرحوم) فرماتے تھے کہ بعض اوقات رات کا کھانا آدھی آدھی رات کو کھایا جاتا تھا جبکہ ان کو یقین دلایا جاتا کہ شہر میں کوئی بھوکا پیاسا نہیں سویا۔ ان کے باورچی خانے سے غریبوں، مسکینوں کو رنگارنگ کے کھانے کھلائے جاتے لیکن وہ خود سوت کات کر اس کی آمدنی سے جوار کی روٹی اور مسور کی دال اکثر کھاتی تھیں قدرت نے ان کی عمر شریفہ میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی کہ انھوں نے اپنی نواسی (شاہجہاں بیگم) کے نواسے نواب نصر اللہ خاں اور جرنل عبید اللہ خاں کو دیکھا۔ ان کی داود دہش کے بہانہ ڈھونڈنے کا لطیفہ مشہور ہے۔ پرانا بھوپال چار دیواری میں آباد تھا اس سے لگا ہوا جنگل تھا جہاں صحرائی جانوروں کا زور تھا۔ ایک بار سردیوں کی رات میں گیدڑوں کی آوازیں سن کر پوچھا کہ آخر یہ اتنا شور کیوں کر رہے ہیں۔ مصاحبوں نے عرض کیا حضور ٹھنڈ کی وجہ سے شور مچا رہے ہیں۔ یہ جواب سن کر خاموش ہو گئیں اور سویرے شہر کے تمام غریبوں میں لحاف تقسیم کرانے کا حکم جاری کر دیا۔ قدسیہ بیگم اپنے باؤں گاؤں جو ان کو جاگیر میں ملے تھے سب کو بھلائی کے کام اور رفاہ عام کے لیے زندگی میں وقف کر دیا تھا۔ جس کے اندازاً اڑتیس ہزار روپیہ سالانہ مسلمانوں کے لیے اور بیس ہزار روپیہ ہندو رعایا پر خرچ کئے جاتے تھے۔ وہ اسی فیاضی و دریادلی اور غیر معمولی عبادت گزاری اور خشیت الہی کا مجسمہ تھیں اسی طرح اپنے مالک کی مخلصانہ عبادت اور مخلوق خدا کی سچی خدمت فرمائی، مرنے پر بھوپال کی مادر مہربان جو والیہ ریاست سے زیادہ ولیہ کاملہ تھیں ۱۲۹۹ھ میں اپنے پیچھے پوری ریاست کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔

نواب جہانگیر محمد خاں اور ان کی ادب نوازی

نواب قدسیہ بیگم کی صاحبزادی سکندر جہاں بیگم تھیں جو کمپنی کے معاہدہ کے ماتحت ریاست کی جائز وارث تھیں ان کی کم سنی سے کمپنی بہادر نے ناجائز فائدہ

اٹھا کر ایک طرف قدسیہ بیگم کو عارضی والیہ بنایا۔ لیکن اختیارات نائب سلطنت کے ہاتھ میں دینا طے کیا اور نائب سلطنت کو ریجنٹ بہادر کے ماتحت بنادیا۔ اس طرح برطانوی ڈپلومیسی ڈیوائنڈ اینڈ زول نے افراطفری پیدا کر دی۔ سکندر جہاں بیگم کا عقد جہانگیر محمد خاں سے کر دینے پر مجبور کیا۔ اور دوسری طرف ان کے غلط کار مشیروں کے ذریعہ ان کو نوابی اور خود مختاری کے لیے اکسایا۔ اس رستہ کشی میں دوبارہ ریاست کی کشتی پھر گرداب سیاست میں پھنس گئی۔ لیکن قدسیہ بیگم اور قدیمی ہی خواہان ریاست نے اس کو ڈوبنے سے بچایا اور جہانگیر محمد خاں نواب بنادے گئے۔ جہانگیر محمد خاں بذات خود ایک شریف النفس، علم دوست، فیاض، دلیز، ادب نواز اور شاعر تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے باہر کے علماء و فضلاء شیخ احمد عینی نقیہ الہین قاضی شریف حسین دہلوی (جو شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان سے تھے) مشہور حکیم اعظم حسین اور دیگر فضلاء و شعراء کو خصوصی طور پر بھوپال مدعو کیا۔ اور بے حد قدر دانی کی۔ جس کی وجہ سے ریاست میں علم و ہنر کو فروغ حاصل ہوا۔ شہر کے باہر ایک مستقل محلہ محلہ جہانگیر آباد عالیشان عمارت سے آباد کیا لیکن فرنگی سامراج نے ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ نواب ادر بیگم میں باہمی نزاع کی چلیج پیدا کر دی کہ ایک دوسرے کا منہ نہ دیکھ سکتے تھے۔ غرض وہ اپنے بر خود مشیروں کے ہاتھوں (جن کو کمپنی بہادر سے شہ ملتی رہتی تھی) شکار ہو کر تریپن سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۳ء میں اس عالم ویران سے گزر گئے اور نور باغ جہانگیر آباد میں مدفون ہوئے۔

نواب سکندر جہاں بیگم اور ان کی انتظامی صلاحیت و مردانگی

جس وقت ان کے والد نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوا تو وہ سب سے کم عمر تھیں اس لیے اولاد قدسیہ بیگم پھر جہانگیر محمد خاں انتظام ریاست ان کی طرف سے چلا رہے تھے۔ سکندر بیگم کو تخت ریاست پر پہنچنے تک مصیبتوں کے جنگل اور خانہ جنگی کے خطرناک میدانوں کو طے کرنا پڑا جیسا کہ ابھی گذرا انگریز بہادر نے وارث تخت

ان کو تسلیم کیا تھا۔ لیکن ان کے شوہر کے لیے نواب ہونا اور فوجدار محمد خاں کو مختار ریاست مگر پولٹیکل ریحیٹ کے ماتحت ہونا تجویز کیا تاکہ یہ سب آپس میں لڑتے رہیں اور صاحب بہادر اس باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ قدرت نے نواب سکندر جہاں سیکم کے اندر مدبرانہ دماغ اور اعلیٰ درجہ کی انتظامیہ صلاحیت اور معاملہ فہمی کے جوہر ودیعت کیے تھے اور ان کی والدہ کی پرورش اور اپنے وقت کے باکمال علماء کے فیض و تعلیم و تربیت سے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ پھر ان کی پوری زندگی بچپن سے (جس میں یتیمی کا داغ لگ گیا تھا) جوانی تک سخت خطرناک حالات اور جہاں گسل امتحانات کی بھیڑ میں تب تپا کر کندن بن گئیں اپنے ملک سے پیار مورثی طور پر ملا تھا جس کی یہودی و ترقی میں برابر لگی رہتی تھیں جس کی وجہ سے ترقی و خوشحالی کی منزل کامیابی تک پہنچایا ریاست بھوپال کی تاریخ میں ان کا وہی مقام ہے جو منسل حکومت میں اکبر کو دیا گیا ہے۔ جس وقت حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو ریاست بد امنی و خانہ جنگی کے دور سے گزر رہی تھی۔ بھوپال کا وہی حال تھا جو استاد ذوق نے کہا تھا۔

سنستے ہیں بھوپال میں شمشیر حل کر رہ گئی

اندرون ریاست میں امن و امان پیدا کر کے اس کو ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ چنانچہ ۱۲۷۶ھ میں اس کی باقاعدہ صدر نشینی کی تقریب منعقد ہوئی اور ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم کو ولی عہد بنادیا گیا۔ ان کے دور حکومت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا بگل پورے ملک میں بج گیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فرنگی سامراج کے خلاف آزادی پسند اٹھ کھڑے ہوئے۔ بغاوت کے ان شعلوں کی آبیج ریاست میں بھی محسوس کی گئی اور خاندان ریاست کے دو معزز جاگیردار فاضل محمد خاں اور جمال محمد خاں راحت گڑھ میں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا کر جام شہادت نوش کیا۔ خود شہر و سیہور وغیرہ میں اس کے شعلے بھڑک اٹھے تھے لیکن سکندر جہاں سیکم نے دودھ کا جلا چھاج بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے کہ مصداق اپنی حکمت عملی سے ریاست کو بچا لیا۔ ان کے وزیر مدد المہام منشی جمال الدین نے

فنون کا مرکز بنا دیا۔ ولی اللہی خانوادہ کے چشم و چراغ شیخ الحدیث مولانا مفتی عبدالقیوم دہلوی اور قاضی زین العابدین ایمانی۔ شیخ الحدیث حسین عرب بحث بھوپال مولانا حیدر علی دآخری شاگرد شاہ عبدالعزیز رح صاحب منہجی الکلام اور حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی جیسے روحانی و علمی بزرگوں کے فیوض و برکات سے یہ خطہ مشہور ہوا۔ وہ پہلی رئیسہ تھیں جنہوں نے پوری ریاست کا تفصیلی دورہ کیا اور عدالتی و انتظامی ہر طرح کے شعبے قائم کیے۔ ہندوؤں کے فیصلے شاستر اور مسلمانوں کے شریعت کے مطابق کرنے کے احکامات جاری کیے گئے۔ زمینوں کی پیمائش اور کاشتکاروں کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنا راجدھانی سے پرگنوں کو ملانے کے لیے سڑکیں بنوانا۔ خصوصاً غریب رعایا کی دیکھ بھال ہر وقت ان کے مد نظر رہتی تھی وہ ایک خاتون ہو کر فوجی اسپرٹ اور سپاہیانہ خصائل کی حامل تھیں اس لیے فوجی اصلاحات اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر کیں کہ انگریزوں کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا۔ جملہ رعایا کا تعلیمی نظام قائم کیا اور مدارس دینی و دنیوی دونوں طرح کے جاری کئے۔ مشرقی علوم کا سب سے بڑا مدرسہ سلیمانہ اس کی یادگار تھا سب سے پہلے انھوں نے فارسی کی بجائے اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنایا۔ شہر و دیہات میں جملہ رعایا کے لیے شفا خانے تعمیر کرائے وہ ایک اعلیٰ درجہ کی شہسوار، بہترین انشا پر دار اور بیدار مغز مدبر اور منتظم دیندار حکمران تھیں۔ جن کے حسن تدبیر و انتظام سے بھوپال کا شمار مہذب و ترقی یافتہ ریاستوں میں ہونے لگا۔ ریاست کے علاوہ انھوں نے دہلی الہ آباد و جبل پور کے درباروں اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں سفر کئے اور وہاں کے ارباب فضل و کمال کی قدر افزائی کی۔ جب دہلی پہنچی تو شہر کے بعد جامع مسجد نمازیوں کے لیے بند کر دی گئی تھی۔ وہاں رئیسہ تھیں جنہوں نے مسجد کو کھلوا کر نماز ادا کی اور بازیابی کی کارروائی کی۔ اور زیارت حریم شریف کی سعادت حاصل کی۔ ان کے دور میں اپنی ریاست خوش حالی و ارزانی اور ارباب کمال کی قدر دانی کی وجہ سے ملک میں نیک نام ہوئیں۔ ان کو جدید تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ ان کے تمام ابتدائی نام پر موتی مسجد، موتی محل اور بے شمار عالی شان عمارت تیار کیں۔ ان کے

ہی زمانہ میں بھوپال ریلوے لائن سے پورے ملک سے جڑ گیا۔ تاریخ بھوپال میں وہ معمار ریاست کی حیثیت سے یاد کئے جانے کی مستحق ہیں۔ آخر یہ امور خیر و رفاه عوام کے کام انجام دینے والی، مخلوق خدا کی سچی خدمت گزار ^{۱۸۶۵ء} ^{۱۸۶۹ء} کو اللہ کو پیاری ہوئیں اور اپنے باغ فرحت افزا میں محو خواب ابدی ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم اور اُن کا ذوق تعمیر و دریا دلی

سکندر جہاں بیگم کی اکلوتی لڑکی ہیں۔ جو اسلام نگر ^{۱۸۵۴ء} ^{۱۸۳۸ء} میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی والدہ نے سابقہ باہمی خانہ جنگی کے واقعات کے پیش نظر یہ طے کر لیا کہ میری لڑکی رئیس اور اُن کے شوہر برائے نام نواب ہوں گے اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت کامل استادوں کے ذریعہ دلائی گئی کہ وہ بعد میں والیہ ریاست بن سکیں جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو حسب معاہدہ ان کو رئیس بنادیا گیا اور اختیارات سکندر جہاں بیگم کو دیئے گئے۔ ان کا نکاح نواب باقی محمد خاں عرف امراؤ دولہا سے منعقد ہوا۔ جو اُنھوں نے ریاست میں تھے اور میر بخشی تھے۔ شاہجہاں بیگم کی صدر نشینی ^{۱۸۶۶ء} میں عمل میں آئی۔ جبکہ مادرِ مہربان کا انتقال ہو گیا۔ اور اُن کی بھی اکلوتی لڑکی سلطان جہاں بیگم کو ولیعہد بنادیا گیا۔ جب وہ والد بھوپال ہوئیں تو داغ بیوگی سے دوچار ہوئیں۔ اس لیے گورنمنٹ سے عقد ثانی کی حسب حکم شریعت اجازت مانگی اور نواب صدیق الحسن صاحب سے نکاح ثانی ^{۱۸۸۸ء} میں ہوا۔ اسی قرآن السعدین سے بھوپال کی تاریخ کا ایک زبردست دور شروع ہوا۔ دور سکندری میں جن جن انتظامی امور و تعمیری امور کا آغاز کیا گیا عہد شاہجہانی میں اُن کو پایہ تکمیل تک پہنچا گیا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے جو قوانین و دستور تجویز کئے گئے اُن کا حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے ترمیمات کرا کے نافذ کیا۔ صحت عامہ میں مریضوں کے لیے دیسی شفا خانے قائم کئے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ ہسپتال قائم کئے۔ مدرسہ سلیمانہ کو کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق کر کے معیار تعلیم کو بلند کیا۔ اپنے والد کے نام پر دینی مدرسہ جہانگیر یہ قائم کیا۔ محکمہ تعلیمی کو

نظارۃ المعارف العمومیہ کا نام دیا۔ تعلیم نسواں کا بھی آغاز کیا۔ رفاہ عام کے لیے سرائے سکندری بنوائی۔ پتلی گھر تعمیر کرایا۔ محکمہ آب رسانی کی توسیع کی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بقول سکندر جہاں بیگم "اس اندھی ریاست کو جس کے اندر نہ ریل نہ تار برمی اس کا احبرا کر کے ملک کے ہر حصہ سے جوڑ دیا۔

شاہجہانی تعمیرات:-

نواب شاہجہاں بیگم کو منل شہنشاہ شاہ جہاں کی ہم نامی کا شرف ہی حاصل نہ تھا بلکہ وہ ذوق تعمیر بھی اُن کی طرح رکھتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی والیہ ہونے کے باوجود، بھوپال کی خوشنما و خوبصورت عمارتوں سے آراستہ کیا۔ شہر کے مشرقی رویہ ایک مستقل آبادی شاہ جہاں آباد، آباد کی عام رعایا کو اس کی ترغیب و امداد کی۔

(۱) تاج محل (۲) عالی منزل (۳) بے نظر کی عجیب و غریب اور دل فریب و دیدہ زیب عمارت تعمیر کرائیں۔ تاج محل میں ہر کمرہ کارنگ علیحدہ اور اس کے مطابق فرنیچر سے آراستہ کیا۔ تفریح کے لیے پائیں باغ اور اُس کے اندر ساون بھاؤ اور مختلف قسم کے خوش تر درختوں کے باغات لگوائے۔ اُن کی آخری تمنا ایک ایسی عظیم مسجد کی تعمیر جو نادرہ اور یادگار ہو اس کے لیے تاج المساجد کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اُسی دور میں پندرہ سو لاکھ روپے خرچ ہو چکے۔ اُس کا صحن بلوری بنانے کا منصوبہ تھا۔ جو واقعہً اس طرح بن جاتی تو ایشیا کی ایک ہی مسجد ہوتی۔ اُن کی دو ہی آرزوئیں تھیں جن کو لے کر وہ دنیا سے چلی گئیں۔ ایک یہ کہ کوئی مجھ سے ایک لاکھ روپیہ مانگتا اور وہ اُس کو دیتی دوسرے تاج المساجد اُن کے ذہنی منصوبہ کے مطابق مکمل ہو جاتی جس کا حوض موتیا تالاب بتا۔ مسجد کا پورا فرش اور سارے گنبد بلوری ہوتے۔ اور اس کے چاروں طرف عربی و اسلامی جامع ازہر کی طرح کی ایک یونیورسٹی بنائی جاتی۔

نواب شاہ جہاں بیگم عالمہ فاضلہ اور شاعرہ خاتون تھیں۔ اُن کے اندر انتظامی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ وہ بیحد فیاض و سخی اور رعایا پرور اور ارباب کمال کی

قدرِ دال تھیں۔ وہ جملہ رعایا کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھیں۔ اُن کی سخاوت و فیاضی کا لطیفہ یہ ہے کہ بھوپال کی جامع مسجد کے میناروں کے کنگوروں پر حرم کے کبوتروں کو لا کر پالا گیا تھا۔ اُن کے لیے کئی من غلہ کی بوریاں منجانب ریاست مقرر تھیں۔ ایک افسر بالانے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لئے رپورٹ سرکار میں پیش کی کہ حضور کبوتروں کی تعداد اتنی ہے اُن کے لیے چند بوری غلہ کافی ہے۔ رپورٹ دیکھ کر گالی دے کر فرمایا: کیا میں اتنی نادان ہوں کہ اس کو نہیں جانتی آخر غریبوں کا بھی پیٹ ہے؟ اور کاغذ پھینک دیا۔ جلا کی قافیہ شناس تھیں ایک شخص نے دستِ سوال دراز کیا انھوں نے ایک روپیہ دیا۔ اُس نے کہا کہ حضور میں تو بہت اُمید لے کر آیا تھا تو انھوں نے اس سے قرعہ ڈالوایا۔ قرعہ میں وہی ایک روپیہ اُس کے لیے نکلا تو فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تیری قسمت میں اتنا ہی ہے۔

اُس کے ساتھ وہ بہت ہی رحم دل اور تمام رعایا کے لیے جاں نثار تھیں۔ چنانچہ اُن کے زمانہ میں جب طاعون کا حملہ ہوا تو انہوں نے رعایا کی آسائش و آرام کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ محلہ محلہ پہونچکر انتظام فرمایا۔ وہ ایک سچی مذہبی خاتون تھیں ریاست میں محکمہ مساجد قائم کیا اور ہندوؤں کے لیے سدا برت قائم کیے۔ جہاں اُن کو اٹا دال پکانے کے لیے دیا جاتا۔ لندن میں شاہ جہانی دوکنگ مسجد پہلی مسجد ہے جو ان کی یادگار ہے۔ اُن کو دو بارہ صدمہ بیوگی سے دوچار ہونا پڑا لیکن مستقل مزاجی سے اپنی ہندو مسلم رعایا کی خدمت کرتی ہوئی کینسر میں مبتلا ہو کر ^{۱۳۹۹ھ} ۱۹۱۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں اور باغِ نشاطِ افرا میں آرام فرماہیں۔

تحریک جہاد اور نواب صدیق حسن خاں

ہندوستانی ریاستوں کے بارہ میں

انگریزی ڈپلومیسی

جیسا کہ لکھا جا چکا کہ آزاد سرحد کے باشندوں (پٹھانوں) نے ہندوستان کے طوائف الملوکی کے دور میں ریاست بھوپال کو قائم رکھا تھا۔ یہ حکمران اپنی فطری

سادگی پر قائم رہے۔ حکومتی ضرورت و نخواست اُن کے اندر نہ پیدا ہوئی۔ اس لیے راعی و رعایا میں کوئی دوری نہ پیدا ہوئی۔ بقول اقبال محمود و ایاز ایک ہی صف میں رہتے چلے آ رہے تھے۔ نوابوں کا دور تاریخ ہند کا خطرناک دور تھا۔ اس لیے خانہ جنگی کے علاوہ ریاست بیرونی حملوں سے دوچار ہوتی رہی اٹھارویں میں جب کہ مغربی سامراج نے مشرق کو اپنے استحصال و غارتگری اور بوٹ کھسوٹ کے لیے تاکا تو ملک مرکز کی کمزوری کی وجہ سے افراتفری کا شکار تھا۔ فرنگی سامراج نے اپنی رسوائی عالم ڈپلومیسی (ڈپلومٹائینڈرول) کے تحت ہر جگہ اس پر فریب کھیل کو کھیلا۔ حافظ رحمت الملک دانی روہیلکھنڈ کو شجاع الدولہ سلطنت آصفیہ سے شمالی ہند میں ٹکرا دیا۔ جس طرح جنوبی ہند میں نظام حیدر آباد ٹیپو سلطان (میسور) کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا۔ جہاں اس قسم کی دراندازی کا موقع نہ ملا دیال افراد خاندان میں ریشہ دوانی کر کے ایک دوسرے سے لڑوا دیا۔ حکومت برطانیہ کی توسیعی پالیسی کا بانی ہسٹنگز تھا۔ ابتداً لارڈ کارنوالس یک کمپنی کی پالیسی یہی رہی کہ ہر مضبوط و خوش حال ریاست کو ایک دوسرے کے ٹکڑاؤ اور توڑ پھوڑ کر اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے قبضہ میں آیا اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان معافی جاری ہوا تو اب معاہداتی سیاست کے ذریعہ جکڑ بندی کی پالیسی کو اختیار رکھا گیا۔ چنانچہ ریاست بھوپال بھی اس سے ایک ریاست ہے جہاں فرنگی سامراج نے من مانی شرائط کھوپ کر نیم غلامی کی زنجیروں میں ریاست کو باندھ لیا۔ سب سے پہلے نواب نظر محمد خاں کو والی ریاست بنا کر نواب غوث محمد خاں کی اولاد (معر محمد خاں) فوجدار محمد خاں جن کو درایت طور سے نواب ہونا چاہیے تھا اُن اس منصب سے ہٹا کر خاندان شاہی میں بغض و عداوت اور دشمنی کا بیج بو دیا۔ پھر نواب نظر محمد خاں کے سانحہ شہادت کے بعد قدسیہ بیگم کو اپنے خیال میں ضیف نازک سے متعلق ہونے کی وجہ سے کمزور سمجھ کر تخت ریاست پر بٹھا دیا۔ لیکن جب وہ زیرک و دانشمند اور مدبر و منتظم ثابت ہوئیں تو اُن کو

تحت ریاست سے اتار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل اس لیے کی جا رہی ہے کہ فرنگی سامراج نے ریاستوں کے بارے میں جو ہتھکنڈے اختیار کیے تھے وہ سامنے آجائیں۔ ایٹ انڈیا کمپنی کی یہ معاہداتی سیاست ہندوستانی ریاستوں کے لئے مکڑی کا ایک پرفریب جال تھا۔ جس کے اندر پھنس جانے کے بعد گلو خلاصی و رہائی مشکل تھی۔ ان معاہدات کے اندر فرنگی سامراج نے اپنا پلہ ہمیشہ بھاری رکھا۔ نواب بنانے کا اختیار، انگریزی فوج رکھنے پر اصرار جس کے مصارف ریاست ادا کرے۔ اور اپنی حیلہ سازی کے ماتحت جہاں ضرورت ہو مداخلت کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اس لئے دیسی ریاستیں فرنگی سامراج کی کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئیں۔ جو اُس کے چشم و آبرو کے اشارہ پر ناجہتی رہتی تھیں۔ جہاں کوئی مدبر فرمانبردار برسرِ اقتدار آجاتا تو اس کو حکمتِ عملی سے معزول یا برطرف کر دیا جاتا۔ جیسے نواب محمد علی خاں وائی ٹونک کو ریاست سے برطرف کر کے بنارس میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی طرح نواب نظر محمد خاں کے سانحہ شہادت پر قدسیہ بیگم کو اس خیال سے فرمانروا تسلیم کر لیا گیا کہ وہ عورت ہونے کی وجہ سے نظم و نسق نہ چلائے گی اور انگریز ایجنٹ کی محتاج بن کر رہیں گی۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا تو ایجنٹ نے اُن کے خلاف ریشہ دو انیاں شروع کر دیں۔ اس لئے اُن پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی بیٹی سکندر جہاں بیگم کا عقد منیر محمد خاں سے باوجود، دونوں کی کمسنی کے کر دیں اور یہ کہ عاقل بالغ ہونے کے بعد وہی مختار ریاست ہوں گے۔ لیکن منیر محمد خاں نے اپنا حق جمانا اور نظامِ ریاست میں ابتری پھیلانا شروع کر دیا۔ تو اُن کی منگنی کو مجبوراً منسوخ کرنا پڑا۔ پھر اُن کے چھوٹے بھائی جہانگیر محمد خاں سے ایک طرف سکندر جہاں بیگم کی نسبت طے کر دی اور نواب نظیر الدولہ خطاً بھی دے دیا اور دوسری طرف اُن کے غلط کار مشیروں اور پولٹیکل ایجنٹ بہادر کی تائید نے اُن کو بھی مخالفت پر لا کھڑا کر دیا۔ اور خانہ جنگی شروع کر کر گورنر جنرل سے پولٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ مداخلت کر کے بیگم صاحبہ کو تخت سے اتار دیا۔ اور ایک ناجبر بہکار و نو عمر نوجوان کو نواب بنادیا۔ اور سکندر جہاں بیگم کو بھی اُن کے ماتحت

کر دیا گیا جس کو مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ لیکن گورنمنٹ کی شہ پر انہوں نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کے لیے وار کیا جو اوچھا پڑا اور ماں بیٹا دونوں اسلام نگر جانے پر مجبور ہوئیں۔

نواب جہانگیر محمد خاں بذات خود ایک شریف، علم دوست اور شاعران تھے۔ لیکن گورنمنٹ کی غلط پالیسی کے آلہ کار بن گئے۔ اُن کی عمر نے وفات کی اور حواں عمری میں گذر گئے۔ اس لیے سکندر جہاں بیگم کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا۔ اگرچہ شہرہ میں اُن کی دلی ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ تھیں۔ جس کے لیے قاضی شریف حسین کو دہلی روانہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہندوستان کا پانسہ پلٹتا ہوا دیکھا تو پھر اپنی حکمت عملی سے ریاست کو ان شعلوں سے بچالیا۔ اور تاج برطانیہ سے یہ معاہدہ لکھوایا کہ اُن کے بعد اُن کی لڑکی شاہجہاں بیگم ہی ریسہ ہوں گی۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ اُن کو پہلا نکاح امر اودو لہا سے شہرہ سے ہوا۔ لیکن جب اُن کا انتقال ۱۳۸۲ھ ۱۸۶۷ء ہو گیا تو نواب صدیق حسن صاحب کے ساتھ عقد ثانی ۱۳۸۸ھ ۱۹۰۱ء میں ہوا۔

”نواب صدیق الحسن کے خاندانی و تعلیمی حالات“

نواب صدیق الحسن بخارا کے سادات سے تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد سید جلال اعظم سرخ بخارا سے آکر بابا فرید الدین شکر گنج کی خانقاہ ملتان میں اترے اور حضرت زکریا ملتانی کے مرید ہوئے اُن کو شہر اوتچہ خلیفہ بن کر روانہ کیا گیا۔ جہاں ان سے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ پھیلا۔ اُن کے صاحبزادے سید احمد ہوئے جن کے بیٹے مخدوم سید جلال الدین بخاری صاحب جو جہاں بان گشت کے مشہور لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ حضرت مخدوم کی اولاد میں سید جلال ثالث بہلول شاہ لودھی کے عہد میں دہلی آئے اور قنوج اُن کو جاگیر دے کر بھیجا۔ بعد میں جب آصفیہ حکومت کے دور میں شیعہ گردی کا زور ہوا تو اُن کے اخلاف بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ نواب صدیق الحسن کے دادا سید انور علی اُسی رنگ میں رہے۔ وہ قنوج سے حیدرآباد

پہونچکر گولکنڈا کے جاگیردار ہوئے۔ اُن کے لڑکے سید اولاد حسن قنوج میں رہے۔ والد ماجد
 (نواب صدیق الحسن کے) سید اولاد حسن کو تحصیل علوم و فنون کا فطری ذوق تھا۔ اپنے وطن
 میں شیخ عبدالباسط سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ شیخ حسن علی محدث لکھنوی (شاگرد
 شاہ عبدالعزیز دہلوی) سے کسب علم کیا مزید تکمیل کے لیے دارالخلافت دہلی پہونچکر شاہ
 رفیع الدین دہلوی سے علم و تفسیر و حدیث فقہ کو حاصل کیا۔ ان بزرگوں کے فیض صحبت
 نے اُن کے اندر جہاد حق اور ایسی ایمانی حرارت پیدا کی کہ اپنے آبائی مذہب شیعیت
 سے تائب ہو گئے۔ اور اس قدر حق پسندی کا ثبوت دیا کہ اپنے خاندان والوں سے
 قطع تعلق کر لیا۔ حیدر آباد کی جاگیر اور مال و دولت سنہری زنجیروں کو ٹھکرا دیا۔ ملت
 اسلامیہ کی زبوں حالی اور مسلم اقتدار کی پامالی احساس نے اُن کو قربانی و جہاد ایمانی
 کے راستہ پر ڈال دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک کے طول و عرض خصوصاً شمالی ہند میں
 سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کا چرچا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہ
 تحریک جہاد بارہویں ستائیسویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں بنوت و
 خلافت کے خطوط پر اٹھائی گئی تھی۔ جو انسانی نظام حیات کی معراج ہے۔ اس جہاد
 کا اصل نشانہ فرنگی سامراج تھا لیکن فی الوقت اس کے لیے اندرون ملک فضا ساز
 گار نہ تھی اس لیے ہجرت کے اصول پر وطن کو خیر باد کہہ کر اس کامرکز آزاد سرحد کا
 علاقہ بنایا گیا۔ فرنگی سامراج کے خلاف یہ ایسی عجیب و غریب غیر معمولی تحریک تھی جو
 ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی تھی اور نہایت رازداری کے
 ساتھ منظم طریقہ پر افراد و رسل کے نیچے کا سلسلہ قائم تھا جو تحریک کاروں کے خلوص
 نیت اور غیر معمولی جانفشانی و قربانی کا مظہر تھا۔ یہ تحریک اگرچہ کامیابی سے ہم کنار نہ
 ہو سکی اور سانحہ بالا کوٹ میں ایک مرحلہ تک سر دہڑ گئی پورے ہندوستان میں فرنگی
 سامراج کے خلاف بناوت کی آگ کو پھیلا دیا جو ۱۸۵۷ء میں دھیرے دھیرے سلگ
 اٹھی اور پورے ملک کو حیرت انگیز طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہر حال حضرت
 مولانا سید اولاد حسینؒ سید شہد کے معرکہ جہاد میں ہم رکاب رہے۔ وہ اس معرکہ

جہاد کے ایک عظیم مجاہد اور سید احمد شہید کے زبردست شیدائی اور فدائی تھے۔ معرکہ بالا کوٹ شہادت پر ختم ہو جانے کے بعد سید احمد شہید کے مرید و مخلص اس تحریک جہاد کو فریضہ ہدایت و ارشاد کی شکل میں بدلنے کے لیے ملک کے ہر گوشہ میں بھیج دیے گئے۔ جیسے مولانا کرامت علی، مولانا سخاوت علی بنگال میں، اور مولانا ولایت علی و صادق علی صادق پور بہار میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ یو۔ پی کے لیے جن بزرگوں کو اس عظیم فریضہ کے لیے منتخب کیا تھا ان میں سر فہرست نام انہیں مولانا اولاد حسن قنوجی کا ہے۔ وہ تحریک جہاد کے اہم رکن سید شہید کے مرید خلیفہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی، مولانا اسماعیل شہید کے رفیق خاص تھے۔ اُن کی پوری زندگی مجاہدانہ اور درویشانہ تھی بیس سال تک قنوج میں دعوت حق کا فرض انجام دیا۔ تعمیل شریعت اور اتباع سنت جو سید شہید کے مریدوں کا خصوصی شیوہ تھا اس کے اندر یہ ممتاز تھے۔ سید اولاد حسن ایک متبع شریعت اور صاحب عزیمت بزرگ تھے۔ اس لیے نواب صدیق الحسن کے قلب و دماغ پر جو کچھ ابتدائی تعلیم کے نقوش ثبت تھے وہ اسی بزرگوار ہستی کے تھے۔ جس کے قلب پاک میں خدا کی محبت کے ساتھ فرنگی سامراج کی طرف سے بغض و نفرت اور عداوت کی آگ شعلہ زن تھی جس کی چنگاریاں اس بزرگوار باپ کی طرف سے سعادت مند بیٹے کی طرف یقیناً منتقل ہوئی ہوں گی۔

نواب صدیق الحسن ولادت اور تعلیمی زندگی

نواب صدیق الحسن کی ولادت ۱۲۳۸ھ میں قنوج میں ہوئی تھی۔ یورپ کے قصبات علماء و شرفاء کے گہوارہ تھے۔ جہاں صدیوں سے علوم و فنون کی شمعیں روشن تھیں۔ چھ برس کی عمر میں داغ یتیمی لگ گیا۔ تعلیم کے لیے باہر جانا پڑا اُن کی والدہ مفتی محمد عویض کی بیٹی تھیں۔ نواب صاحب نے اپنے بھائی سید احمد حسن عرشی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر کانپور میں (جو علماء کا مرکز تھا) تکمیل علوم کی۔ مولانا سخاوت علی جوہری، مولانا ولایت علی، مولانا خرم علی بلہری، مولانا محمد علی (خلفاء سید احمد)

وغیرہ کے مواعظ سے آگے آکر ایمانی حرارت قلب میں پیدا ہوئی۔ وہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ان میں اکثر وہ بزرگ تھے جنہوں نے شاہانِ دہلی (سراج الہند شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر) کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی حکمت ولی اللہ کے شاہ اور شاہ ولی اللہ کے جہاد کے عملی پروگرام کے سچے قائد تھے۔ جن کی دوہین نگاہوں نے فرنگی سامراج کی ملک میں بڑھی ہوئی عیاری و مکاری اور فرعونی سیاست کو بھانپ کر مسئلہء میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا سب سے پہلے فتویٰ دیا تھا۔ اور فتویٰ کا تکمیل کے لیے مجاہدین کی جماعت حضرت سید احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں تیار ہوئیں اور اس تحریک کا پہلا مرحلہ بالا کوٹ پر پہونچ کر پورا ہوا۔ لیکن جو چنگاریاں بچپن میں نواب صاحب کے دل میں سے اپنے والد ماجد کے سینہ سے منتقل ہوئیں اور کانپور کے علماء کی گرمی صحبت سے شعلہ بن گئیں۔ اُن کے شعلہ جو الہ بنانے میں دہلی کے دو سالہ قیام کو بڑا دخل ہے۔ جو اُجڑ جانے کے بعد بھی اس وقت علماء و فضلاء سے آباد تھی۔ بقول اُن کے جب وہ ۱۲۶۹ھ میں کانپور سے دہلی آئے تو صدرالفاضل مفتی صدرالدین دہلوی نے اُن کو مہمان بنایا اور نواب مصطفیٰ شیفہ کے یہاں ٹھہرایا۔

اس وقت مولوی مخصوص اللہ (خلف شاہ شاہ رفیع الدین) مولوی محبوب علی مشہور مجاہد شیخ نصر الدین، نواب قطب الدین، شاہ ابوسعید مجددی، شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی وغیرہ کے نفوس قدسیہ سے یہ شہر پر نور و مہمور تھا۔ مفتی صدرالدین جیسے عالم و فاضل نے اس جوہرِ قابل کو اپنی خصوصی تعلیم و تربیت سے چمکایا۔ اور مذکورہ بالا بزرگوں کے فیض صحبت نے جذبہ جہاد کو روشن کیا۔ خود مفتی صاحب بھی شہداء کے جہاد کا فتویٰ دینے والوں میں سے تھے نواب صاحب نے سلطنت مغلیہ کی آخری بہار کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ اور فرنگی سامراج کے ظلم و ستم کے ہاتھوں کو اس چمن کی تاراجی میں بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں

نے فرنگیوں کی مغل دربار میں ریشہ دوانیوں کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ بادشاہ سلطنت اور مغل شاہزادوں کی حصول اقتدار کے لیے باہمی کشمکشوں رنگ رلیوں اور نظام سلطنت سے غفلت انگیزیوں نقشہ اُن کی نگاہوں میں تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانیوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کس طرح کھسکتی جا رہی ہے۔ اور سرزمین ہند کا وسیع و عریض اور طویل رقبہ سات سمندر پار کے اس اجنبی قوم کے ہاتھوں میں پہنچ رہا تھا۔ جن کو مغل شہنشاہوں نے اپنا مہمان بنا کر خاطر تواضع کی تھی میزبان کی کمزوری سے چالاک مہمان ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اندر ہی اندر سرگرم تھے۔ مرکز کی کمزوری سے جو خود مختار حکومتیں قائم ہو رہی تھیں۔ اُن کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر کپنی بہادر کی غاصبانہ پالیسی ہر محبت وطن ہندوستانی کی نگاہ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ عہد گذشتہ کی تاریخ، دور رفتہ کے واقعات اور انگریزوں کی مکروہ سیاسی چالیں ایک نو آموز اور نو وارد طالب علم کی نظر میں سرمہ بصیرت بن کر مستقبل کی بربادی کا نقشہ کھینچ رہی تھیں۔ ریاست روہیل کھنڈ جیسی نو عمر جمہوری ریاست اور نواب نجیب الدولہ کی بیٹے نواب صاحبہ خاں کے دور میں تباہی کا منظر نگاہوں میں تازہ تھا۔ نواب صاحب کے حساس قلب میں جو ایک مجاہد باپ کے مجاہد فرزند تھے رہ رہ کر شعلے بھڑکتے تھے۔ یعنی عوام و خواص کی نا طاقتی و بے شعوری کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے۔ جیسا کہ ابھی گذرا پھر جس آنکھوں نے مغل شہنشاہیت کا آخری جاؤ جلال و شوکت و اقبال کا نظارہ کیا تھا اس حکومت کی تباہی و بربادی اور اُس پر بہار چین کی تاراجی، فرنگی سامراج کی درندگی و سفاکی کو نگاہِ عبرت سے دیکھنا پڑا۔ حالات زمانہ کی بوقلمونی اور احوال زندگی کی گونا گونی کے مشاہدے اُن کی اسلامی غیرت و حمیت اور خود دار فطرت میں جوش و اشتعال کی آگ کو خوب خوب بھڑکایا۔ اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل بنانے کی دعوت دی۔

عملی زندگی کا آغاز

اپنی تعلیمی دور کے اختتام ^{۱۸۹۷} سالہ میں یہ اکیس سالہ نوجوان جب دہلی سے اپنے وطن قنوج پہونچا تو اس کو معاشی نقطہ نظر سے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا چونکہ پورے خاندان کی کفالت کا بوجھ تن تنہا اُن کے کندھے پر آ پڑا تھا۔ لیکن وطن میں معاش کے سارے دروازے بند اور معیشت کی راہیں تنگ تھیں۔ چاروناچار وطن کو چھوڑ کر ہجرت کی راہ پر قدم رکھنا پڑا۔ دارالاقبال بھوپال اس وقت بیرونی شرفاء اور علماء و فضلا کی پذیرائی کے لیے اپنی آغوش کھولے ہوا تھا۔ اس کی سن گن ملنے پر رخت سفر باندھا اور پریشان حال خاندان کا ایک مسافر بھوپال پہونچکر سب سے پہلے مسجد ابراہیم پورہ میں فروکش ہوا۔ جو ہمیشہ سے دینی طبقہ کی پناہ گاہ رہی تھی۔ پھر برسوں موتی مسجد کے بالائی کمرہ میں ٹہرے رہے۔ کچھ دن قیام کے بعد منشی جمال الدین مدارالمہام کے ذریعہ سے دربار میں رسائی ہوئی اور منشی گیری کی خدمت معمولی مشاہرہ پر سپرد ہوئی۔ دو سال تک وقت گزاری کی۔ لیکن جیسا کہ والد مرحوم (جو نواب نور الحسن خلیف نواب صدیق الحسن کے ہمیشیں تھے) فرمایا کہ اچانک سرکار انگریزی کی طرف سے وارنٹ گرفتاری اور حکم جاری ہوا۔ راتوں رات سرزمین بھوپال کو خیر باد کہہ کر وطن واپس ہونا پڑا۔ یقینی بات ہے کہ جب حکومت برطانیہ کی خفیہ پولیس نے ان کا ریکارڈ فراہم کیا ہو گیا اُن کے والد بزرگوار کا تعلق تحریک جہاد کی شرکت روز روشن کی طرح ثابت ہوا تو ایسے باغی سرکار کی وفادار ریاست میں کیونکر گزر ہو سکتا تھا۔ مسئلہ قلیان کشی (حقہ) کا اختلاف تو ہمارے نزدیک ایک بہانہ ہے۔ جو نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

پھر وطن پہونچکر تلاش معاش میں ^{۱۹۰۳} سالہ کا پہونچا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ پورا ملک کمپنی بہادر کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے بارود خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک فتنہ دکھانے کی دیر تھی۔ اس خطرناک ماحول کو دیکھ کر گھر بیٹھے رہے

۱۲۴۳ھ کے ہنگامہ نے ملک و طول و عرض میں ایک آگ لگادی تھی، نواب فرخ آباد بھی دوسرے آزادی پسند محب وطن رئیسوں کی طرح اس کافر ظالم طاقت دفرنگی (سامراج) کے خلاف میدان جہاد میں کود پڑے۔ پورا شہر مسار کھیتاں برباد اور بڑے بڑے بہادر قتل کر دئے گئے۔ اس لیے قنوج سے بھاگ کر بلگرام میں پناہ لی۔ خود نواب صاحب بھی باغیوں کی زد میں آگئے تھے۔ مگر خدا نے حفاظت کی۔

”بھوپال آمد“

اب دور بارہ معاش کے لیے بھوپال پہونچے۔ لیکن پہلے کی طرح نہ صرف ناکامی بلکہ شہر بدر کر دینے کا حکم سابقہ الزام کی وجہ سے صادر ہوا مجبوراً ٹونک کا رخ کیا۔ اسی دوران مدارالمہام صاحب مرحوم نے اُن کی طرف سے صلح و صفائی کر کے ریاست کی طرف سے مدعو کیا۔ بھوپال کا یہ داخلہ ۱۲۴۶ھ میں اُن کے مستقبل کی ترقی کا سنگِ بنیاد بنا۔ اور تاریخ نگاری پر بمشاہرہ پچھتر روپیہ تقرر ہوا۔ مدارالمہام نے اُن کی لوحِ پیشانی سے مستقبل کی تابانی کے خط کو پڑھ لیا تھا۔ اور درحقیقت وہی نواب صاحب کی داخلہ کی رکاوٹوں کے دور کرنے کا سبب بنے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیوہ بیٹی (آصفیہ بیگم) کا نکاح ثانی نواب صاحب سے کر کے مردہ سنت کو زندہ کیا بلکہ خوش آئند مستقبل کی بنیاد رکھ دی۔ مدارالمہام کا یہ رشتہ ہی بام ترقی پڑھنے کا نواب صاحب کے لیے زینہ بن گیا۔

”سفر حجاز“

نواب صاحب مرحوم کو سفر حجاز کا بحد شوق دل میں موجزن تھا۔ اس کے لیے سکندر جہاں بیگم کی خدمت میں استدعا کی لیکن اُن کے سانحہ ارتحال ۱۲۸۵ھ میں پیش آ جانے کی صورت میں یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ جب شاہجہاں بیگم نے تخت نشین ہوئیں تو اُن کی درخواست منظوری ہوئی۔ بادبانی جہاز فتح سلطان سے روانہ ہو کر بندرگاہ

حدیدہ پر اترے۔ یہی سب سے پہلے قاضی شیخ حسین عیسیٰ، شیخ علی عبداللہ منشی شارح بخاری وغیرہ علماء کے فیض صحبت سے اور شیخ عبدالوہاب بخاری کی تحریک سے روشناس ہوئے۔ جب جدہ کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں جہاز ایک پہاڑ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ بہت سے لوگوں نے شیخ عبدالقادر کی دہائی دینا شروع کی دل پر چوٹ لگی۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا یا الہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ایسے شدید مصیبت کے وقت تو مشرک بھی خدا کے وحدہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لیکن مغال خیال میں آیا کہ سچ ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ يُشْرِكُونَ بہر حال زیارت حرمین شریف میں نے مشرف ہو کر اور وہابی تحریک کا ایک ہلکا سا نقش لے کر بھوپال ۱۲۹۶ھ میں مراجعت فرما ہوئے۔

”دور ارتقاء“

یہ مبارک سفر اُن کے لیے ترقیات کا دروازہ ثابت ہوا۔ چونکہ تاریخ نگاری شعبہ متعلق کر کے اُن کو تعلیمات کا ڈائریکٹر بنادیا گیا۔ مدارس سلیمانیہ کا اہتمام اُن کے سپرد ہوا۔ نواب صاحب کی عبقریت اور ان کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کے دوست و دشمن دونوں قائل ہیں۔ جب وہ ریاست کے ڈائریکٹر تعلیمات و منتظم مدارس سلیمانیہ ہوئے تو اُن کو والیہ ریاست نواب شاہجہاں بیگم سے قربت کا موقع حاصل ہوا۔ نواب صاحب معنوی کمالات کے ساتھ صوری و ظاہری محاسن سے بھی آراستہ و پیراستہ تھے۔ وہ ایک خوب و طرح دار نوجوان اور عالم و فاضل انسان تھے۔ اپنی غیر معمولی صلاحیت کا سکہ تو پہلے ہی والیہ کے دل پر بٹھا چکے تھے۔ اب محاسن ظاہری سے بھی اُن کے دل کو موہ لیا۔ اس سلسلہ میں جو حسن کرنے اور جس جس طرح ڈورے ڈالنے پڑے اُن کی ایک فضول داستان ہے جو درخور تحریر نہیں۔ بہر حال ان کی صوری و معنوی خوبیوں پر والیہ ریاست فریفتہ و شیفتہ ہو گئیں جس کے نتیجہ میں چند دنوں میں میرد بیری کے اہم عہدہ اور امیر الانشائی کے غیر معمولی منصب پر

۱۲۸۷ھ میں فائز ہوئے اور پھر گورنمنٹ کی تحریر منظوری پر ان کا عقد والیہ کے ساتھ ہوا۔ اور امیر الملک والا جاہ کا خطاب ملا (تاج الاقبال صفحہ ۲۷) پھر زیادہ عرصہ نہ گزر نے پایا تھا کہ نواب صاحب نے بیگم صاحبہ کے دل و دماغ پر ایسا قبضہ کیا کہ اندرونی طور پر نظام ریاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی۔

”تحریک جہاد کا منصوبہ“

اب ان کی ذہنی منصوبہ کے مطابق انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد برپا کرنے کی صورت میں پیدا ہوتی دکھائی دی۔ ۱۲۸۹ھ کو دربار عام میں گورنمنٹ برطانیہ نے ان کے اعزازات کو تسلیم کر لیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا ہے کہ نواب صاحب سفر کلکتہ میں پوری کوشش کی کہ وہ مختار ریاست تسلیم کئے جائیں اور اختیارات حکمرانی ان کے ہاتھ میں آئیں۔ اس نے مدعا کو حاصل کرنے کے لیے سرکار کے پردہ نشیں ہونے کو قرار دیا مگر کامیابی نہ ہوئی (تذکرہ سلطانی ص ۱۲۱) خود بقول نواب صاحب کے ایک مرتبہ والیہ ریاست نے حین حیات مختار ریاست بنانے کی تحریک حکومت انگلیش سے کی (دابقار المنس صفحہ ۱۱۲) اب بقول سرکار عالیہ روز بروز ان کا قدم عروج و ترقی کی طرف بڑھتا گیا۔ اپنے حسن تدبیر سے ابتدا پرانے کارکنان ریاست کی گرفت کو (جن کے پنجہ میں عنان حکومت تھی) ڈھیلا کرنا شروع کیا رفتہ رفتہ ایسا دباؤ ڈالا اور سکھ جمایا کہ سب کو نیچا دکھا دیا اہل کاران قدیم کو الٹا اشارہ اللہ باقی نہ رہنے دیا (الکے بھوپال صفحہ ۷۲)

”انقلابی اقدامات“

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نواب صاحب جس خفیہ تحریک جہاد کو جاری رکھنے کا منصوبہ بنا کر آگے بڑھ رہے تھے اس کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو نواب صاحب کے ہم خیال (ہم مشرب) اور اس راہ قربانی میں ہر طرح مخلص و وفادار

اور جاں نثار ہوں۔ اس لیے تحریک جہاد کے خیالی خاکہ کو عملی جامہ بھرنے کے لئے دواہم کی ضرورت تھی۔

- (۱) ایک طرف پرانے وقادارانِ ریاست کو کلیدی عہدوں سے باہر نکالنا۔
- (۲) اور دوسری طرف ان محرم راز افراد کو اُن جگہوں پر لا کر بٹھانا جو اس تحریک کے مخلص و وفادار اور ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔

اس راستہ میں سب سے بڑا پتھر برطانوی حکومت کا جاسوسی فولادی نظام تھا۔ جو ملک کے گوشہ گوشہ میں تار برقی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس سے نبرد آزما ہونے اور اس تحریک کو اُن دسترس سے بچانے کے لئے جس ہوشیاری و بیداری کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ مشہور ہے کہ سٹہء کہ بعد دیوبند کے ایک بزرگ نماز تہجد کے اندھیرے میں جب انگریزوں کے خلاف دعا مانگتے تو پہلے بالاخانہ سے گلی اور ہر طرف خوب دیکھ لیتے کہ کوئی سی آئی ڈی تو نہیں ہے۔ تب وہ ہاتھ اٹھاتے اور دعا کرتے۔ سٹہء میں انگریزوں کی سفاکی و درنگی و وحشتناک مظالم نے ایسے خوف و دہشت کا نقشہ ہندوستانیوں کے دلوں میں بیٹھا تھا کہ اُن کی مخالفت کا ادنیٰ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ارادۂ بغاوت کی توہلکی سی پرچھائیں بھی کسی کے صفحہ خیال میں نہ ابھر سکتی تھی۔ مگر اس سرزمین ہند کے آغوش میں پلنے والے ابھی ایسے دلاور بہادر اور جبری بلند حوصلہ فرزند موجود تھے جو انگریزی اقتدار کی جبر و قہر پانی ظلم و ستم رانی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور اعلانِ کلمتہ الحق سے ذرہ برابر نہ چونکتے تھے۔ یہ وہی دلی اللہ علمی خاندان کے بقیۃ السلف مجاہدین تھے۔ جنہوں نے معرکہ بالا کوٹ میں سرحد کی زمین کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنایا تھا۔ اور ابھی تازہ تازہ سٹہء کے خونیں دریا کو پیر کر کے نکلے اور بکمال سرخ رونی میدانِ جہاد کے لیے تیار تھے۔ اور جنہوں نے فرنگی سامراج کے ظلم و ستم کے آگے اپنی گردن کہیں نہ جھکائی تھی۔ اور برٹش گورنمنٹ کی فرعونیت کی گردن کو خم کرنے کا عزم محکم اپنے سینوں میں رکھتے تھے۔ یہ تھے ولی اللہ تحریک کے اخلاف، دیوبند کے اکابر حضرت الانام مولینا محمد قاسم ناتوئی

اور قطب عالم مولانا رشید احمد کنگوہی اور خود نواب صدیق الحسن بھی انھیں اسلاف کی یادگار تھے۔ اس لیے نواب صاحب نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے لئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو بھوپال تشریف آوری کی دعوت دی جیسا کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے ایک محفل ارشاد فرمایا کہ ریاست بھوپال میں نواب صدیق حسن صاحب خاں نے ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور چاہتا تھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو اس کا مہتمم اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو صدر مدرس بنادیں۔ مولانا نانوتویؒ کی تنخواہ تین سو روپیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی سو روپیہ ماہوار تجویز ہو کر ان سے درخواست کی گئی دونوں میں سے کسی کا ارادہ جانے کا نہ ہوا۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے یہ جواب لکھ دیا کہ میں اس وقت مطبع مجتبیٰ میں تصحیح کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ جس پر مجھے دس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ جو میری ضرورت سے زیادہ ہے۔ پانچ روپیہ میں میرا مع اہل و عیال کے خرچ پورا ہو جاتا ہے۔ باقی پانچ کی فکر رہتی ہے کہ اسے کہاں خرچ کروں، خدا ان طالب علموں کا بھلا کرے یہ میری اپنی فکر کفالت کر لیتے ہیں۔ ان پر خرچ کر کے سبکدوش ہو جاتا ہوں۔ آپ نے تین سو روپیہ تنخواہ لکھی ہے۔ اگر میں اس کو قبول کروں تو دو سو پچانوے کی فکر میرے سر پر پڑے گی جو میرے لیے ناقابل تحمل ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ جو بات لکھنے کی تھی وہ آپ نے لکھ دی اب میں کیا لکھوں۔ فرمایا کہ میں لکھتا ہوں کہ میں اس شرط پر آتا ہوں۔ کہ تین سو تنخواہ ماہانہ ہوگی اور کوئی پابندی مجھ پر عائد نہ ہوگی۔ جب چاہوں گا وطن آ جا یا کروں گا دونوں تحریریں جب پہونچی تو ان سے وہی سمجھا گیا جو لکھنے والے کا مقصود تھا۔ (محاسن حکیم الامت صفحہ ۳۳)

ایسے پر آشوب خطرناک دور میں برطانوی سامراج کے خلاف لب کشائی ایک کھٹن کام تھا۔ حکومت کے تختہ الٹنے کا ارادہ کا منصوبہ بنانا غیر معمولی اوالاعزمی و بلند خوصلگی کی نشانی تھی۔

نواب صاحب کی یہ خفیہ تحریک جہاد اُن کی جواں مردی، بلند ہمتی، اور غیر معمولی جرات و ہمت کی آئینہ دار تھی۔ چنانچہ ایک طرف اندرون ریاست انکی کارروائیاں نہایت مستعدی و سرگرمی سے انجام دی جا رہی تھیں اور دوسری طرف بیرونی سرگرمیاں خفیہ جاری تھیں۔ اور تیسری طرف تصنیف و تالیف کی گرم بازاری اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنی تحریک کو آگے بڑھانے میں شبانہ روز لگے ہوئے تھے۔ انکی پولیشکل کارروائی سے حکام کا دم بند تھا۔ اسی زمانہ میں بقول نواب علی صاحب خاں

والاجاہ کی پبلک زندگی کا آغاز ہوا یہی وہ زمانہ ہے جس نے اُن کی عملی مذہبی اخلاقی وہ عملی طاقتوں کو منظر عام پر لا کر نمایاں کیا اور اُن کے متضاد اور جامع کارناموں سے ایک عالم کو روشناس کیا۔ آگے چل کر نواب صاحب لکھتے ہیں ”سچ تو یہ ہے کہ ایک بڑے سے بڑے ذہن و فطین موصوف بہ صفت امانت اور ایک عالم باعمل اور علامہ عصر کا فضل و کمال اور ایک کامل فن ادیب کے بے نظیر انشاء پردازی اور ایک تقدس مآب ریاض عارف باللہ کی صداقت و حق پرستی اور ایک سپہ سالار اعظم کی جرات و کارروائی اس وقت تک کبھی منظر عام پر نہیں آ سکتی جب تک کہ اس کی طاقتوں کے سامنے میدان فرخ باد اور اس کے عزائم کے آگے فضائے بسیط اور اس کی جدوجہد علمی و عملی کے مقابل ایک جولا نگاہ عریض اور اس کے دست کرم کے لئے ایک عظیم الشان خزانہ موجود نہ ہو۔“

اسباب کے فقدان اور وسائل کی نایابی سے کوئی بڑے سے بڑا انسان کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ بقول علی حزیں ے

پائے بستند و رہ سعی نشا تم دادند دست و بازو بکشند و بکما تم دادند خوش قسمتی سے قدرت نے یہ تمام ذرائع و لاجاہ کے لیے مہیا کر دیئے۔ جس سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ملک و ملت کو عظیم الشان منفعت پہچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ (ماثر صدیقی صفحہ ۹۸-۹۹) ان کی حکمت عملی اور کمال سیاست دانی کا یہ شاہکار ہے کہ اسی دوران میں وہ ساہجپاں بیگم کے ساتھ سفر بمبئی و کلکتہ و دہلی

میں دربار شریک رہ کر برطانیہ کے اعلیٰ حکام کی نظروں میں خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ اور جنگ روم و روس میں امداد نصرت کی بنا پر خلیفہ معظم ترکی کی طرف سے تمغہ مجیدی دوم ۱۲۵۵ھ اُن کو دیا گیا۔ جیسا کہ تنزک سلطانی میں ہے، ”دقی دربار میں نواب صاحب ممدوح کے لیے سترہ فیٹر سلامی کے لیے مقرر کئے گئے۔ جب برطانوی حکومت کے دل پر اپنی وفاداری کا سکہ بٹھا دیا۔ اندرون ریاست اکھاڑ بچھاڑ کے عمل کو جاری کیا اور پارٹی بندی کے اصول پر اپنے گروہ کو ریاست کے اہم منصب پر فائز کرنا اور ان کو جملہ امور ملکی و انتظامی پر حاوی ہونا شروع کیا۔ محمد حسن، نہتم پیشی تحقیقات کے ذریعہ سے سخت گیر احکام جاری کر کر ریاست تہلکہ مچ گیا۔ سختی بندوبست سے عام رعایا پریشان اور خانماں، دیران ایک خلقت سرگرداں و مالاں ہو گئی (الکھ بھوپال) بھوپال کے قدیم شرفاء کے قدم اکھڑ گئے، پرانے ارباب عناصر کی مٹی خراب ہوتی نظر آنے لگی۔ جاسوسوں کا ایک وسیع جال بچھا دیا گیا۔ دفتر ایجنسی و ریزنڈنٹی زر خرید غلام بن کر رہ گیا۔ بقول سلطان جہاں بیگم انھوں نے کرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا جو ان کے ہم خیال اور ان کی کارروائیوں کے معاون تھے۔ اور اس مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جن کو ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ رعایا و ریاست سے ہمدردی تھی انگریزوں کے جبر و استبداد کے دور میں اُن کے خلاف کسی تحریک کا نام لب پر لانا ایک سنگین جرم تھا۔ (تنزک سلطانی ص ۲۳۶) ہم نے اس لئے ہم نے نواب صاحب کے مخالف لوگوں کی تحریروں کے ذریعہ صورت حال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس لیے کہ اس تحریک کا پس منظر سامنے آجائے۔ اور اُن زخموں کی کھسک کا احساس ہو سکے جو اب بھر چکے تھے۔ سلطان جہاں بیگم بھی جو بعد میں والیہ بھوپال ہوئیں اُن کے تیر ستم کا ایک زخم خوردہ تھیں۔ نواب صاحب نے شروع میں ہی اس امر کی پوری پوری کوشش کی کہ اُن کا نکاح اپنے بیٹے علی حسن خاں صاحب کے ساتھ ہو جائے لیکن قدسید بیگم اور دیگر قدیم ارکان ریاست کی مخالفت کی

وجہ سے یہ بیل پروان نہ چڑھ سکی۔ جب اس کے اندر اُن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو پھر نواب صاحب نے ماں اور بیٹی کے درمیان نفرت و عداوت کی ایسی خلیج حائل کر دی کہ وہ اُن کی ماں شاہجہاں بیگم کے مرتے دم تک باقی رہی کہ بیٹی نہ ماں سے مل سکی اور نہ اُن کو ماں کے پاس حاضری کی اجازت مل سکی۔

تذکر سلطانی میں سلطان جہاں بیگم نے اپنی ماں شاہجہاں بیگم سے بستر مرگ پر ملاقات کی کوشش کا جو دلاور و جگر خراش نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو پڑھ کر دل پگھل جاتا ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ نواب صاحب نے بیٹی کی طرف سے ماں پر وہ کون سا جادو کیا تھا یا کون سا منتر پھونکا تھا کہ وہ آخر وقت اپنی اکلوتی لڑکی سے ملنے کی روادار نہیں ہوئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جائے کہ جب ولیعہد سلطنت کے ساتھ بے دخلی کا معاملہ اس قدر سخت رہا تو پھر دوسرے قدمی و قادارانِ ریاست کا کیا حشر ہوگا۔ نواب صاحب کے تیشہ سیاست نے پرانے بھوپال کے باشندوں کو اس طرح صاف کر دیا تھا کہ تیرا ہاقدی خاندان خانماں و برباد ہو کر یا تو گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ یا دیہات و قصبات میں پناہ گزیں بن گئے تھے۔ ریاست کے ہر محکمہ ہر شعبہ میں تخفیف کا کلہاڑا اس تیزی سے چلا گیا تھا کہ جنگل کا جنگل صاف ہو گیا۔ بقول سحر بھوپالی ۷

بے جرم کی گردن تہہ خنجر ہے نظر میں۔ اب تک وہی ہنگامہ محشر ہے نظر میں
یہ انقلابی اقدامات غالباً اپنے منصوبہ کو عجلت پسندانہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے نواب صاحب کو کرنے پڑے ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ اسی عجلت پسندی اُن کے سارے منصوبہ پر پانی پھر گیا۔

”باغیانہ لٹریچر اور اس کی اشاعت“

تحریک جہاد کے لیے یہ کاروائیاں اندوون ریاست زمین ہموار کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ لیکن برطانوی حکومت جس کے رقبہ سلطنت میں اس وقت

سُوج غروب نہ ہوتا تھا۔ اس کو اکھاڑ پھینکنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ پورے ملک میں اُس کے لیے فضا کو سازگار بنایا جائے۔ خزانہ ریاست پر قابض ہونے کی بنا پر اُن کے لیے نشر و اشاعت کا وسیع میدان ہاتھ میں تھا۔ مطبع سکندری پہلے قائم تھا اب مطبع شاہجہانی اور مطبع صدیقی مزید قائم کر دیئے گئے تھے۔ دہلی و لکھنؤ کے ماہرین کتابت کو جمع کرا لیا گیا۔ نواب صاحب اپنی زود نویسی و کثرت نگاری میں قدما کی یادگار تھے۔ بقول انھوں نے نہایت ہوشیاری سے ہندوستان کے وسیع و عریض علاقوں میں مخفی طور پر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی: اپنی کتاب ہدایہ السائل مطبوعہ ۱۲۹۲ھ میں صفحہ ۹۰ تا ۱۰۳ پر ضرورت جہاد پر نہایت شد و مد سے ترغیب دی گئی۔

مجموعہ خطبہ میں انہوں نے حضرت شاہ اسماعیلؒ کا وہ خطبہ شامل کیا جس میں شاہ صاحبؒ نے انگریزوں کے خلاف عربی میں جہاد کی ترغیب دی ہے (الکے بھوپال) اور بقول سلطان جہاں بیگم انہوں نے وقتاً فوقتاً متعدد کتابیں لکھیں جو مختلف مضامین پر تھیں۔ انہیں کتابوں میں مجموعہ خطب، ہدایہ السائل، ترجمان و ہابیہ، اقتراب الساعة وغیرہ بھی تھیں۔ جن میں مذہبی پیرایہ میں خلاف سیاست ملک مضامین تھے۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا جو اُن کے ہم خیال اور اُن کی کاروائیوں کے معاون تھے۔ اور اسی مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جن کو ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ رعایا سے ہمدردی (تذکرہ سلطانی) نواب سلطان جہاں بیگم نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے زیادہ وہ اشارہ نہ کر سکتی تھیں انہوں نے نواب صاحبؒ کو پناہ صلاحیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب صدیق الحسن خاں صاحب ایک ذی علم و ذہین شخص تھے "نواب صاحب کے صاحبزادے شمس العلماء نواب علی حسن خاں نے "سیرت والا جاہ" میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس کے اندر نواب صاحب، حالات زمانہ کی حالت، تحریک جہاد کے داغ دھبوں کو دور کرنے کی پوری پوری

کوشش کی ہے۔ مگر وہ اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں۔

”نواب والا جاہ اپنی جامعیت کے شوق اور وسعت معلومات کے لحاظ سے مسئلہ جہاد کے متعلق علامہ سید حسن بن جلال یمنی کے رسالہ ”ہایان اور سید عبداللہ بن سید عبدالباری کے رسالہ ”سیف“ کا ترجمہ مع دیگر اقوال مقتدین یکجا کر دیا ہے۔ اور بعض مقامات پر ان کو حوالہ بھی دیا ہے۔ (مآثر صدیقی) نواب صاحب کے حریفوں کے جو اشادات جو ابھی نقل کئے گئے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کی نشان دہی کرتے ہیں کہ نواب صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو باغیانہ لٹریچر ملک بھر میں پھیلا یا تھا۔ اور پچھلے بزرگوں کی کتابوں کے بین السطور میں اپنے شرابا ز قلم سے جو شعلہ آفریں خیالات کو وسیع پیمانہ پر عام پر کیا تھا۔ اس کا عشر عشر بھی گورنمنٹ تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ آگے آرہا ہے کہ بہت سی کتابوں کو جو ملک کے گوشہ گوشہ میں تقسیم کی گئی تھیں ان کو تلف کر دیا گیا تھا۔ جہاد حق کے لیے جو مستقل رسائل مطبوع ہو کر عوام تک پہنچا دئے گئے۔ ان کا بہت سادہ حکومت برطانیہ کی دسترس سے باہر رہا۔ اگرچہ انگریزوں کی وحشیانہ دہشت گردی سے زیادہ تر لوگ سہمے اور ڈرے ہوتے تھے لیکن ہمارا ملک باطل کے خلاف کسی زمانہ میں جان پر کھیل جانے والوں مینچلوں سے خالی نہیں رہا۔ جو شہ کی شکست خوردگی پر جھنجھلائے ہوئے بیٹھے اور اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

نواب صاحب کے خلاف گورنمنٹ کی وارننگ

نواب صاحب کا یہ باغیانہ لٹریچر برٹش گورنمنٹ کے نوٹس میں آیا اور محکمہ خفیہ کی رپورٹ نواب صاحب کے خلاف حکام بالاتک پہنچی۔ چونکہ ان کتابوں کی اشاعت کا دور وہ زمانہ تھا۔ جبکہ حکومت برطانیہ اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ مہدی سوڈانی کے مقابلہ میں سرگرم پیکار تھی افریقہ کے میدانوں میں سوڈانی مجاہدوں نے برطانیہ کا ناک دم کر رکھا تھا اور ان کی فوجوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ اس لئے اس کو سب سے زیادہ اگر کہیں خطرہ تھا تو وہ مسلمان قوم سے تھا۔ بغاوت کی ذرا سی بو بھی

اُس کے لیے پریشان کن تھی۔ پھر اس کا بھی قوی امکان ہے کہ نواب صاحب کے مخالفوں نے گورنمنٹ کے کان بھرے ہوں۔ ایٹائی اقوام کی خانہ جنگی، اور بردار کشی سے ہی مغربی اقوام کے لیے اقتدار پرستی کی راہیں کھولیں۔ بہر حال سب سے پہلے کتاب مجموعہ خطبہ کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس کے اندر حضرت شیخ شہیدؒ کے انگریزوں کے خلاف خطبہ کا ترجمہ پیش کیا گیا جو پورے ملک میں مفت تقسیم کیا گیا تھا پھر دوسری کتابیں جن کے اندر مسئلہ جہاد پر نواب صاحب نے اپنے دلی جذبات کو ظاہر کیا تھا۔ اور جو باطل کے خلاف جہاد نہ کرے یا جہاد کی نیت نہ رکھے منافقین میں شمار کئے جانے کو بتایا تھا۔ غرض چھوٹے بڑے جو رسالے ہاتھ لگ سکے ان کو گورنمنٹ کے ملاحظہ میں گزارا۔ گورنمنٹ کے محکمہ خارجہ نے ان کتابوں کو سرپبل گریفسن رجنٹ گورنر جنرل کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج دیا۔ سرپبل گریفسن نے کرنل میری کے ذریعہ نواب صاحب کو اس قسم کی تالیف و تصنیف پر وارننگ دی اور احتیاط رکھنے کی ہدایت صادر کی۔ اب نواب صاحب نے ان مضامین کو مستقلاً رسائل کی شکل میں چھاپنے کے بجائے اسی دوسری تصانیف میں ان مباحث کو چھیڑا۔ جو شخص کسی نشہ و شوق میں سرشار ہوتا ہے اس کا نشہ اس قسم کی ترشی سے کیوں کرا تر سکتا ہے؟ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کے خصائل و عادات کا بڑا حصہ موروثی ہوتا ہے۔ اُس کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کا قالب نسلی و خاندانی روایات سے تشکیل پاتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کی تکمیل میں خاندانی، وراثتی خصوصیات کا زبردست دخل ہوتا ہے۔ ان کی کتاب (ہدایت المومنین) وہ پہلی کتاب ہے۔ جس پر سب سے پہلے گورنمنٹ نے نوٹس لیا تھا۔ پھر دوسری کتابیں اس کے ملاحظہ میں لائی گئیں۔ جس پر ان کو تنبیہ کی گئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے دل و دماغ پر انگریزی حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات جلوہ فرما تھے۔ جس ملت کی محبت جس وطن کی حمیت اور جس جذبہ حریت سے سرشار تھے اس قسم کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس لیے جنرل ڈیلی ایجنٹ گورنر جنرل کو درجن کے نام سے اندور کا ڈیلی کالج تھا) اور جو نواب زادوں اور راجکماروں کو برطانوی

وقاداری کے رنگ میں قائم کیا گیا) تحقیقات کا حکم دیا گیا۔ لیکن نواب صاحب کے کارندوں کے آگے اُن کی ایک نہ چلی اور وہ فرد جرم لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ ریزٹڈنسی کے اہلکار افسر نواب صاحب مٹھی میں تھے۔ مگر حکومت برطانیہ چونکہ مسلمانوں کو نمبر ایک کا مخالف و دشمن اپنی اندرونی پالیسی میں قرار دے چکی تھی اور ان کی طرف خوف زدہ تھی۔ اس لیے محکمہ خفیہ برابر نواب صاحب کے خلاف اندر ہی اندر متحرک رہا۔ یہاں تک ۱۸۸۳ء میں سرٹیبیل گریفن جب افغانستان کی تحریک آزادی کو چل کر اور کابل کے سارے معاملات کو بزعیم خود طے کر کے اندور ایجنٹ ہو کر آیا تو اس نے نواب صاحب کی تحریک کے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور نہایت سرگرمی سے تحقیقات کا جال بچھا دیا۔ ہر طرف بھوپال و بیرون بھوپال اُس کے کارپرداز خفیہ لٹریچر فراہم کرنے اور نواب صاحب کے حریفوں سے راز حاصل کرنے میں پھیل گئے۔ لیکن جس طرح مستعدی سے گورنمنٹ کے محکمہ نے اپنا کام شروع کیا تو نواب صاحب کا خفیہ عملہ بھی اُس کے تعاقب میں ہر جگہ لگ گیا۔ اور نہایت ہوشیاری سے اُس کے مدافعت میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ باغیانہ لٹریچر سے لبریز کتابوں کے جو نسخے ہندوستان میں تقسیم کئے گئے وہ نہایت سرعت سے تلف کر دئے گئے۔ وہ کاغذات جو گورنمنٹ برطانیہ کے وزارت ہند کے ملاحظہ کے لیے انگلستان بھیجے جاتے رہے وہ شملہ کے دفتر گورنمنٹی سے اڑا دیئے گئے۔ الکہ بھوپال (نواب صاحب کے کمال سیاست دانی، بیدار مغزی و ہوشیاری کا حیرت انگیز کارنامہ وہ ہے جو والد صاحب مرحوم (سید صابر علی) نے راقم السطور کو بچپن میں سنایا تھا کہ نواب صاحب کی جاسوسی نظام کا حیرت ناک کرشمہ یہ تھا کہ نواب صاحب کے خلاف جو مثل ان پر فرد بغاوت عائد کرنے مواد پر مشتمل تھی) پوری رازداری و احتیاط پسندی کے ساتھ بحفاظت تمام لندن بھیجی جا رہی تھی اور جہاز میں رکھی بھی جا چکی تھی۔ جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے ساحل ہند پر ہی نذر آتش کر دی گئی۔ اور گورنمنٹ کو چراغ پا ہونا اور کف افسوس ملنا پڑا۔ کہاں ایک چھوٹی سی ریاست کا معمولی حکمران اور کہاں سلطنت برطانیہ اپنے سارے جاہ و چشم اور طاقت و دولت کے ساتھ ان دونوں

کا مقابلہ چیونٹی اور ہاتھی کا معاملہ تھا۔ مگر جیسا مشہور ہے کہ جب خدا چاہتا ہے تو ہاتھی کو چیونٹی سے ختم کر دیتا ہے۔ معمولی چڑیاں ہاتھی کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ مگر ابھی ہندوستان کی بدقسمتی و بد بختی کے دن باقی تھے۔ اس لیے نواب صاحب کی ان تمام کوششوں کا تیر بھی نشانہ پر نہ بیٹھ سکا۔ بہر حال تحریک کے ان خطرناک مرحلوں میں انہوں نے جس ہوشمندی و دانشمندی کا ثبوت دیا اس سے نواب صاحب کی غیر معمولی ذہانت و لیری کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اندر ان کی وفادار اہلیہ نواب شاہجہاں بیگم کی امداد و پشت پناہی کا بڑا دخل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ان پر خطر و دشوار گزار مراحل سے گزر گئے۔ انہوں نے نواب صاحب کی امداد و تعاون میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اور خود اپنے لیے اُن کی وفاداری میں ہر خطرہ کو مول لیا۔ یہ واقعہ پھلی نسلوں کے زبان زد خاص و عام تھا کہ تاج محل بھوپال کا انگریزی فوجوں کا محاصرہ جب سرٹیل گریفن کی فہمائش اور انتباہ سے بھی نواب صاحب کے رویہ میں فرق نہیں آیا تو حسب اشارہ حکومت اس نے نرمی کی بجائے گرمی اختیار کی اور ایک سخت اقدام اٹھایا۔ سیہور چھاؤنی سے (جو انگریزی افواج کا ٹھکانا تھا) ایک رنجیت ہر قسم کی سے مسلح راتوں رات روانہ ہوئی رات ہی تاج محل کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور بیگم صاحبہ کو نواب صاحب کو انگریزوں کی حراست میں دینے کا مطالبہ کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے کمانڈر افواج کو باریاب کر کے اور صورت حال کو معلوم کر کے پردہ کے اندر سے اپنی جوتی پھینک کر فرمایا اس کا یہ جواب ہے۔ اور کہا اگر میں نے اپنی رعایا کو اشارہ کر دیا تو تم میں سے کسی کی ایک بوٹی بھی نہ ملے گی۔ بعد میں جو کچھ ہو گا میں دیکھ لوں گی۔ یہ میرے ناموس کا معاملہ ہے۔ اُن کے اس سخت گیر رویہ سے کمانڈر حورس ٹھکانے ہو گئے اور منہ کی کھانی پڑی۔ فی الحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ چنانچہ نواب صاحب کو۔۔۔ بیگم صاحبہ کی موجودگی میں اس کے نتائج بد سے آگاہ کیا گیا۔ اور اپنی کار دایاں سرگرمی سے عمل میں لائی گئیں۔ چنانچہ چند ہفتہ گزرنے پر سرٹیل گریفن نے اس کارروائی کا اس طرح انتقام لیا کہ ایک خصوصی دربار منعقد کیا اور ۱۴ ذیقعدہ

۱۳۰۲ھ کو نواب صاحب کی مغرولی اور نوابی کے خطاب وغیرہ کی نسلو بی حکومتی فیصلہ
۱۸۸۵ء برسر خاص و عام صادر کیا (نزدک سلطانی صفحہ ۲) اس فیصلہ سے پوری ریاست میں تہلکہ
مچ گیا۔ نواب صاحب کے لائے ہوئے آدمیوں، بڑے بڑے عہداروں اور افسروں
کو بیک جنبش قلم الگ کر دیا گیا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ جس کے متعلق
نواب صاحب کے ساتھ تقرب یا تعلق کا ثبوت ملا وہ ملازمت سے سبکدوش یا
خارج البلاک کر دئے گئے۔ غرض گھر گھر کھرام اور خاندان صف ماتم بچھ گئی۔ شہر بھوپال
میں ۱۳۰۲ھ میں ایک چھوٹی سی قیامت برپا ہو گئی۔ گریفن گردی کا رسوائے عالم
دور بھوپال میں ابھی تک زبانوں پر تھا اس وقت یہ عالم تھا بقول نواب علی حسن خاں
یا توجب اقبال یا در اور تقدیر موافق تھی کو کرنل کنیکڈ پولٹیکل ایجنٹ گورنر جنرل
نے اسلام کا تحفہ بھیجا تھا۔ اور میکڈ آئلا کمانڈر انچیف افواج ہند نے ان کی عقلمندی
و خیر خواہی کی شہادت دی تھی۔ اور حب برادقت آیا تو بھوپال محشر ستانِ آشوب
بنا ہوا تھا۔ نواب صاحب سے بڑھ کر کوئی غیر وفادار و بدخواہ ملک و ملت نہ تھا۔
ہر طرف سے دار و گیر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ”سچ یہ ہے کہ اس ستم آبادستی میں
اور سیاست کدہ ظلم و طغیان میں حق و صداقت کی پرستش دیانت و امانت ایسا بزم
عظیم ہے ناقابل معافی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ دستِ ستم دراز ہو چکا تھا۔ تیغ بے داد
بے نیام ہو چکی تھی ایک آلِ رسول، جگر گوشہ بتول و نَبَلُو گم بَشْتِی مِّنَ الْخَوْفِ
اللہ کی قربان گاہِ آزمائش میں فیصلہ سر دتن کا منظر کھڑا تھا اور وہ وقت قریب
آچکا تھا کہ یہ صدا نے سرمدی بلند ہوئے

عمریست کہ آں جلوہ منصور کہن شد، من از سر نو جلوہ دہم دار در دس را
کہ بارگاہِ مثبت ایزدی نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا تیغ بے داد خمیدہ ہو کر سر بسجود ہو گئی۔
طغیان نازین کہ جگر گوشہ خلیل = آمد بیز تیغ و شہیدش نمی کنند
اس ہنگامہ پر آشوب میں والا جاہ مرحوم کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ کوئی معاون و صلاح کار
صرف خدا نے حافظ حقیقی کی حفاظت و نصرت اور رحمۂ عالیہ کی سچی رفاقت پست پناہ

تھی۔ ماثر صدیقی صفحہ ۱۶۸ اور جیسا کہ اُن کے حریف نے بجا طور پر صحیح کہا۔ اور اقبال
رہبہ بر سرکار ہوا۔ صرف نواب کی معزولی کا حکم صادر ہوا اگر یقین نے دربار کیا اور حکم
معزولی سنایا (الکھ بھوپال صفحہ ۱۶۸)

نوابی سے معزولی و برطرفی

نواب صاحب پر گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے جو فرد جرم ترغیب جہاد یا دعوت
بغاوت، یہ ایسا سنگین جرم تھا جس کی سزا قتل و گردن زنی یا شہادت تھی۔ جیسا کہ نواب
علی حسن خاں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ”فرنگی سامراج کی تیغ انتفاا حرکت میں آگئی تھی
اور سر کے جدا ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ لیکن ہمیشہ ایزدی نے سیاسی مصالح کی
بنیاد پر اس سخت اقدام سے روک دیا۔“

(۱) سب سے پہلے تو یہ کہ نواب صاحب کی کماں مستعدی عملہ کی ہوشیار سے جسم
بغاوت کی مثل گورنمنٹ تک پہنچنے نہ دیا۔ راستہ میں آگ لگادی گئی تھی۔
(۲) دوسرے یہ کہ ہنگامہ شہر کے زخم اہل ہند کے دلوں پر ابھی تازہ تھے ملکہ کے
عفو عام کے ان زخموں پر مرہم رکھا گیا تھا۔ اب برطانوی حکومت اپنی سخت گیر پالیسی
کو جس نے شہر کے ہنگامہ کو جنم دیا تھا۔ اب خیر آباد کہہ کر نرم پالیسی پر گامزن ہونا
چاہتی تھیں تاکہ یہاں کے باشندوں کے دل میں اُس کے لیے گنجائش پیدا ہو سکے۔
(۳) ادھر ریاست بھوپال نے شہر میں دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں انگریزوں کی
بڑی حد تک حمایت کی تھی اور انگریزی افواج کے لیے سہولتیں فراہم کی تھیں اس لیے
اُس نے نواب صاحب کو بیگم صاحبہ کی خاطر بے دست و پا بنادینے کو کافی سمجھا اور تھوڑے
ہی عرصہ میں وزارت کا عہدہ یا ریاست کا نظام کرنل وارڈ کے سپرد کر کے تمام حالات
پر قابو پایا اور نواب صاحب کو خانہ نشین ہونے پر مجبور کر دیا۔

”تحریک کی ناکامی کے اسباب“

نواب صاحب کا یہ قومی و ملی کارنامہ اور زندگی کا حادثہ جہاں ہمارے اندر

دولہ انگیز ملی جذبات اور قومی احساسات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے وہیں اس کی ناکامی ایک سبق آموز واقعہ ہے۔

(۱) نواب صاحب کے ریاست کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جانے کی وجہ سے جہاں مذکورہ تحریک کے لیے اسباب و وسائل بہ آسانی پیدا ہو گئے وہیں درباری سازشوں سے کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جس سے مغربی سامراج نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔

(۲) پھر اتنی زبردست تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے جس قدر وفادار مردان کار کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ وہ مہیا نہ ہو سکے۔ ریاست کے قدیم وظیفہ خواروں اور وفاداروں کو جس تیزی سے قلع قمع کیا گیا اس نے بھی پوری ریاست میں ان کی مخالفت اور برہمی کا ماحول پیدا کر دیا۔ کیا تعجب ہے کہ گھر کے بھیدی نے اس لنکا کو ڈھایا ہو۔

(۳) اسی طرح ایک عظیم سلطنت (برطانیہ) کو اکھاڑنے کے جس ساز و سامان اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کا کام جس نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہو سکتا تھا وہ دشمن کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ شاہ کی ٹھوکر سے برطانوی سامراج بہت چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ وسیع پیمانے پر مخلص افراد اور نشر و اشاعت کے ذرائع میسر نہ آ سکے۔ بہر حال ریاست کے تیرہ و تار اور تنگ فضا میں جو شمع حریت و آزادی روشن کرنا چاہی تھی وہ مخالفتوں، دشمن کی ریشہ دوانیوں کی آندھیلوں میں زیادہ دیر تک نہ جل سکی۔ اس عظیم مقصد کے جن ممبرانِ آزما مراحل سے گزرنا اور امتحانات کی بھٹی میں تپ کر اور بجھ کر سونا بننا مقدر ہو سکتا تھا احوال زمانہ نے موقع نہ دیا۔ جن اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے مدتِ مرید درکار تھی اس کو اتنی مختصر مدت میں حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نواب صاحب کی اس تحریک نے ابتدائی مرحلہ میں ہی دم توڑ دیا۔ ملتِ اسلامیہ کے مرضِ مزمن (اختلافات باہمی) نے اس بیمار طبیبِ حاذق کی تشخیص و علاج سے پہلے ہی بسترِ علالت پر دراز کر دیا اور اس کے مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

نواب صاحب اپنے زمانہ کے متعلق کس قدر دل سوزی سے لکھتے ہیں۔

فارسی (اصل عبارت)

اردو عبارت کا ترجمہ

دنیا از جور و ستم برگشتہ و تعصب و عدل
محو گشتہ، ہوئے سیم و زر ہر یکے
بر کینہ و عداوت دیگر برداشتہ
مال دولت کی خواہش نے ایک دوسرے
کو عداوت و کینہ پر آمادہ رکھا ہے۔

واقامت شعائر اسلام سخت تر از صبر

شعائر اسلام کا قیام شعلوں کے

بر آگیز گزیدہ نہ در برکتے

پٹنے سے سخت ہے۔

فائدہ و نہ در عمل اخلاص

نہ علم میں برکت باقی رہی، نہ عمل میں کوئی

و نہ در عقیدہ صحبت و نہ در سلوک ابرے

اخلاص نہ عقیدہ صحت رہی

و نہ در سلوک ابقائے و نہ در عوام صلاحیتے

اور نہ طریقہ سلوک و معرفت میں اثر

نہ بادشاہوں میں انصاف

و نہ در خواص شعاع انسانیت۔

نہ عوام میں صلاحیت اور نہ خواص میں

انسانیت کی کرن باقی رہی

ظہر الفضا دنی البرد و لبحر

(لنقصا و جنود الاحرار) صفحہ ۱۲۰

غرض اس مختصر سی مدت میں جو عظیم شخصیت ترقیات کی منزلوں کی طرف

چڑھتی چلی گئی اور صبح نورانی نوید کامرانی و شادمانی لے کر طلوع ہوتی تھی اور ہر شام

محبت و مسرت کا پیغام لے کر آتی تھی۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کی شام اس طرح آئی اور

ان کے سر پر بلائے ناگہانی بن کر چھائی کہ شادان و شوکت کی ساری بلندیاں، پستیوں

میں تبدیلی ہو چکی تھیں اقتدار و اختیار کی وسیع جولان گاہ ایک کنج قفس میں محدود

ہو کر رہ گئی۔ اعزازات و خطابات کے سارے نقش و نگار صحیفہ حیات سے مٹ

چکے تھے۔ بلند عزائم اور عالیشان منصوبے سب خاک میں مل چکے تھے۔ ایک بلند

یا یہ مفکر و مدبر کے قلب و دماغ پر اس سانحہ کا کیا اثر ہو گا؟ اور وہ ذات جس کی

تمام عمر سن شعور سے آخر لمحہ حیات تک باطل طاقت کی بیخ کنی کے لیے وقف رہی ہو۔
اپنی مسلسل مساعی اور متواتر کوششوں کے محل کے ڈھ جانے سے اُس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔
اسی ناکامی کے داغ اس کے لوح دل پر کس قدر گہرا ہوگا۔ جس مقصد عظیم (انگریزی
اقتدار کے خاتمہ) کے لیے سارے اختیارات و اقتدارات حاصل کئے تھے۔ جب وہ اعلیٰ
مقصد ہی زیر زمین دفن ہو گیا تو اس کے جذبات قلبی کا کیا عالم ہوا ہوگا؟ چنانچہ ایک
جگہ لکھتے ہیں "میں خطاب نوابی کو عقاب رب الارباب سمجھتا ہوں۔ والا جا ہی کو ایک
سبب ہلاکت یوم الحساب"

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں "بیوقوف لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ دنیا میں
ان عوارض کی وجہ سے ایک طرح کی خفت مجھ کو لاحق ہوئی اگر خدا نخواستہ کام سے علاحدگی
اور انتراع خطاب جو ایک امراضی تھا تہہ و صف ذاتی اور نہ مابہ الفخر ان بندگانِ شکم
اور خدامِ دینار و درہم کے نزدیک ایک وصحت و ذلت ہے تو میرے لیے اس کے
جواب میں یہ فقرہ کسی عالم عاقل کی کفایت کرتا ہے۔ "ذلیل الدنیا خیر من ذلیل الآخرہ
(ماثر صدیقی) اس ہنگامہ شور و شر کے بعد نواب صاحب کی پوری توجہات کا رخ تصنیف
و تالیف کی طرف ہو گئی۔ اور وہ کامل یکسوئی کے ساتھ قرآن و حدیث کی خدمت اور
علم و فنون کی اشاعت میں ہمہ تن لگ گئے۔ بقیہ پانچ سال اسی مبارک مشغلہ میں
گذرے۔ ایک عبقری شخصیت کے لیے خاموش زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔ ایک
میدان (سیاست) کی شکست نے اس کے لیے دوسری جولان گاہِ عمل کی دعوت
دی۔ اپنے ہم خیال علماء کو بلا کر تصنیف و تالیف کا ہنگامہ کر دیا۔ ان کی آخری
زندگی ہمارے نزدیک سنہری زندگی ہے۔ جس نے اسلام کے پچھلے بزرگوں کی یادیں تازہ
کر دیں۔ ہزار ہا نایاب کتابیں ان متفقہ میں معرض اشاعت میں آئیں اور خود نواب
صاحب اور ان کے ارباب و کمال رفقا اور فضلاء کی تصانیف سے بھوپال ایک
مستند مرکزِ علم بن گیا۔ خدا نے اس شہر میں سے اہل بھوپال کے لیے خیر کی صورت
پیدا کی کہ سیاست کے بجائے ان کا رخ دیانت کی طرف ہو گیا۔ اور ملتِ اسلامیہ

کے لیے انہوں نے ایک عظیم ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور ریاست بھوپال کو عالم اسلام میں متعارف کرا دیا۔ جس کی تفصیل ان کی عملی خدمات کے عنوان میں کی گئی ہے۔

”وفات صدیق الحسن“

آخر وہ وقت آگیا جو ہر ذی روح کے لیے مقدر ہے۔ اس عرصہ میں الزام بنگاؤ کا ہنگامہ سرد، اور ان کی مخالفت جوش کھنڈا پڑ چکا تھا۔ بیمار رہ کر مرض استقار میں ۱۳۰۶ھ میں بوقت تہجد وفات پائی (ماثر صدیقی صفحہ ۲)

فهرست فرمانروایان بهوپال مع عهد حکومت

نمبر شمار	نام	عهد
۱	سردار دوست محمد خان بانی ریاست	۱۱۲۰ هـ تا ۱۱۵۰ هـ
۲	نواب یار محمد خان	۱۱۵۳ هـ تا ۱۱۶۷ هـ
۳	نواب حیات محمد خان	۱۱۹۲ هـ تا ۱۲۲۳ هـ
۴	نواب فیض بهادر شاه	۱۱۹۷ هـ تا ۱۱۹۱ هـ
۵	نواب غوث محمد خان	۱۲۲۳ هـ تا ۱۲۲۰ هـ
۶	وزیر محمد خان خود مختاری	۱۲۳۱ هـ تا ۱۲۳۱ هـ
۷	نواب نظر محمد خان	۱۲۳۱ هـ تا ۱۲۳۵ هـ
۸	نواب قدسیه بیگم	۱۲۳۵ هـ تا ۱۲۵۳ هـ
۹	جهانگیر محمد خان	۱۲۵۳ هـ تا ۱۲۶۰ هـ
۱۰	نواب سکندر جهان بیگم	۱۲۶۶ هـ تا ۱۲۸۵ هـ
۱۱	نواب شاه جهان بیگم	۱۲۸۵ هـ تا ۱۳۱۹ هـ
۱۲	نواب سلطان جهان بیگم	۱۳۱۹ هـ تا ۱۳۵۰ هـ
۱۳	نواب حمید الله خان	۱۳۵۰ هـ تا ۱۳۶۰ هـ

سراج الہند شاہ عبدالعزیز اور بھوپال

اس تحریک کے باقاعدہ امام شاہ عبدالعزیز نے ولی اللہی دعوت اور اسکے اصول و دفعت کو جو بڑے شاہ صاحب کی کتابوں میں دقیق و پیچیدہ انداز میں بکھرے ہوئے تھے عوام تک پہنچایا ابھی تک خواص اہل علم ہی اس دعوت سے آشنا ہوئے تھے لیکن سراج الہند نے عوامی روایات اور مسلمات کی شکل میں ان اصول کو عام کیا سراج الہند نابغۃ العصر شخصیت تھی جن کو تحریر و تقریر میں یکساں عبور تھا۔ ان کی تقریر ایسی لذت و چاشنی تھی کہ ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کا آدمی اس سے لطف لیتا اور اثر پذیر ہوتا وہی شیرینی ان کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے جس کی تفسیر فتح العزیز گواہ ہے کیوں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی دہلی کو مرکزیت حاصل تھی اس لیے شاہ صاحب کے یہ افکار و خیالات شمال سے جنوب تک پھیل گئے شاہ صاحب وہ پہلے انقلابی عالم ہیں جنہوں نے ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا (فتاویٰ عزیزی مجتہائی ص ۱۸۷-۱۹۰)

جبکہ برطانوی جنرل لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دہلی کے اندر درانداز داخل ہوئیں اس وقت ہندوستان کا بادشاہ شاہ عالم مادھولال سندھیا کی ماتحتی میں وقت گزار رہا تھا اس کے کچھ دن بعد یہ مغل شہنشاہ دو لاکھ سالانہ کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا جس کے اندر طے پایا کہ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ (شاندار ماضی ص ۶۴ جلد دوم)

اس لیے ہمارے نزدیک شاہ صاحب کا یہ فتویٰ اصل واقعہ حقیقۃ الامری کا اعلان تھا چنانچہ کمپنی بہادر نے انگریز ریزینڈنٹ مقرر کر کے دھیرے دھیرے سارے اختیارات شاہی چھین لیے اور حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم کا مقولہ

ضرب المثل ہو گیا۔

شاہ صاحب کا یہ فتویٰ درحقیقت فرنگی سامراج سے اعلان جنگ تھا ولی الہی پارٹی کو اس کے خلاف میدان جہاد میں کودنا پڑا شاہ صاحب رحلت فرما چکے تھے اس جماعت کے ارکان شیخ الاسلام مولانا عبدالحی امیر المومنین سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید اور شاہ محمد اسحق دہلوی تھے اس جہاد کا اصل نشانہ فرنگی سامراج تھا لیکن اب پورا ملک برطانوی شکنجے میں کس چکا تھا اس لیے اندرون ملک دعوت جہاد کا برپا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھی اس لیے اصول ہجرت پر عمل کر کے سرحد آزاد کے علاقہ کو (جو ہمیشہ سے آزادی پسندوں اور مجاہدوں کا گہوارہ رہا ہے) اختیار کیا سید صاحب کا اصل نشانہ دعوت جہاد کا کیا تھا اس کی حقیقت ان کے خطوط سے کھلتی ہے غلام حیدر خاں کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

”ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ پر ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی کسی کو ان سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں بلکہ ان کو ہر ایک اپنا آقا سمجھنے لگا ہے چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت ان سے مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے اس لیے چند کمزور بے حقیقت لوگوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔“

(سیرت سید احمد شہید ص ۳۵ جلد دوم)

والی چترال کے ایک خط میں ہے:

”تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی سلطنت و حکومت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکوں نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم بیداد شروع کر رکھی ہے کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا اور شعائر اسلام اٹھ گئے یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا، دل میں غیرت ایمانی اور

دل میں جہاد کا جوش و خروش ہے“ (سیرت ص ۳۵۷ جلد دوم)
 سید احمد شہیدؒ کے خطوط میں جو مہاجروں اور سکھ ذمہ داروں کے نام ہیں ان کے
 اندر بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے:

”خدا گواہ ہے ہمارا منتہا نہ دولت جمع کرنا ہے اور نہ اپنی حکومت
 قائم کرنا ہمارا منتہا یہ ہے کہ بعید الوطن بے گانے (غیر ملکی فرنگی) جو
 بادشاہین کر آئے ہیں اور وہ ملوک زمین وزماں ہو گئے ہیں ان کو وطن
 سے نکال دیں“ (شاندار ماضی ص ۲۱۷)

بہر حال سید احمد شہیدؒ نے اپنے قافلے کے ساتھ اس آزاد علاقے میں بقول مولانا
 سندھی ہندوستان کی پہلی حکومت موقوفہ (ڈویژنل گورنمنٹ) ۱۰ جنوری ۱۸۵۷ء میں
 قائم کر دی جس کے امیر سید احمد شہید اور ہردو بزرگ وزیر ہوئے لیکن ہندوستان
 کی بدقسمتی راہ میں حائل ہو گئی مہاراجہ رنجیت سنگھ جو شاہ زمان والی کابل کے
 نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے پنجاب کا گورنر تھا مرکز کی کمزوری سے فائدہ
 اٹھا کر خود مختار بن بیٹھا اور پھر انگریز بہادر کی ریشہ دوانیوں میں آکر اس علاقہ کے
 مسلمانوں کو چھیڑ چھاڑ اور پھر دست درازی شروع کر دی لہذا مجاہدین کی سرگرمیوں
 کا رخ جو فرنگی سامراج کی طرف مڑتا سکھوں کی طرف پھر گیا اور اپنوں کی غداری سے
 معرکہ بالا کوٹ پر ۲۷ دئی قعدہ ۱۲۶۱ھ میں اس تحریک کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔
 بہر حال سراج الہند کے متوسلین نے شاہ صاحبؒ کے انقلابی پروگرام کو عملی جامہ
 پہنایا۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ہندوستانی انقلابی عالم کی اصلاح و ارشادات کے
 اثرات ہندوستان سے باہر حجاز مقدس اور پھر اسلامی دار الخلافہ قسطنطنیہ تک
 شاہ غلام علی نقشبندی (جو سراج الہند کے اصحاب میں سے تھے) کے خلیفہ خالد کردی
 کے واسطے سے پہنچے انکو ترکی علماء نے شاہ صاحبؒ کو استقبول آنے کی دعوت دی
 (تحریک شاہ ولی اللہ ص ۸۵)

اس لیے شاہ صاحبؒ وہ پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے فرنگی سامراج کے خلاف اعلان جنگ کیا اور اس وقت ہمارے ملک کو انگریزوں کے پنجے سے رہائی کے لیے سوچنا جب کہ کسی کے شان و گمان میں نہ آسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کو بھی اپنے پدر بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی طرح برطانوی سامراج کی خفیہ سازشوں کے نتیجے میں ایسے جاں گسل اور لرزہ خیز مظالم سے گذرنا پڑا کہ جس کو سن کر اس بوڑھے مرد مجاہد کی عزیمت و حوصلے کے آگے سر عقیدت جھک جاتا ہے کھانے میں ان کو زہر دیا گیا پورے بدن پر چھپکلی کی مالش کرا کے جسم کو مبروص و داغدار کیا گیا دوبار ان کو وطن دہلی سے پاپیادہ شہر بدر ہونے پر مجبور کیا گیا ہزار ہا طوفان ان کے سر مبارک سے گذرے لیکن وہ ایمان و استقامت کی چٹان اپنی جگہ سے نہ ہلا اور نہ اپنے موقف سے ٹلا اس دور میں جب کہ شاہ صاحبؒ ان امتحانات سے گذر رہے تھے۔

دیوانی چھوٹے خاں نے بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی جس کو اپنے بلند نصب العین کی خاطر قبول نہ فرمایا لیکن ولی اللہی دعوت کی سلسلہ زریں کی جو کڑی بھوپال سے اس وقت قائم ہوئی پھر وہ ٹوٹ نہ سکی اور پھر مفتی الہی بخش صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کے دوسرے شاگردوں کی آمد سے بھوپال ولی اللہی دعوت کا گویا مرکز بن گیا۔

ولی اللہی دعوت کا دوسرا دور اور کھوپال

سانحہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء میں امیر شہید کی شہادت نے ولی اللہی دعوت کے متوالین کے دلوں کو خون اور جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ان مجاہدین راہ عزیمت نے ہمت نہ ہاری اور جس مقصد عالی کے لیے گھر بار چھوڑ کر غریب الدیار اور بے وطن ہونے تھے انھوں نے نئے عزم و حوصلے سے پھر نیا منصوبہ تیار کیا اور نقشہ جہاد بنایا اس وقت جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ دہلوی جس کے امام سراج الہند کے نواسے شاہ اسحق دہلوی تھے اور دوسری صادق پوری جماعت جس کے امیر مولانا ولایت علی پھر مولانا عنایت علی ہوئے صادق پوری جماعت امیر شہید کی شہادت کے منکر اور دوبارہ ان کے ظہور کی معتقد تھی اس جماعت نے امام ناصر حازمی کے واسطے سے امام شوکانی اور امام عبدالوہاب نجدی سے رابطہ قائم کیا اس لیے مسلک سلفیت (توحید کامل اور بدعات سے کامل احتراز) کو اختیار کیا۔

اس موقع پر اسلامی ہند کی درخشاں تاریخ کے قربانیوں سے روشن اور جاں فروشوں کے رنگین باب سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور ان کے خلیفہ مولانا ولایت علی کے عظیم کارنامے کا اجمالی تذکرہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تاکہ ناظرین کی نگاہوں میں اس کا ہلکا سا خاکہ آسکے اسلامی ہند کی تاریخ کے آسمان پر سید احمد شہید کی تحریک جہاد کہکشاں کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے گروں کا ہر ستارہ راہ حق کے مسافروں کے لیے ہدایت کا منارہ ہے حضرت سید شہید کو قدرت نے مسلمانان ہند کے لیے اپنے دور میں مجاہدہ و عمل کا ایک آفتاب بنا کر

پیدا کیا تھا شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے زبان و قلم سے جس دعوتی و انقلابی پروگرام کا خاکہ بنایا تھا اس کے اندر عملی رنگ بھرنے کی سعادت سید احمد شہید کے حصہ میں آئی سید صاحب اور علم الہی خاندان شروع ہی سے شاہ ولی اللہ سے وابستہ تھا شاہ ابوسعید مجددی شاہ صاحب کے چہینے شاگرد تھے جن کو مرض الموت میں شاہ صاحب نے یاد فرمایا۔ (مکتوب شاہ ولی اللہ)

حضرت سید شہید (ولادت ۱۲۰۱ھ) اپنے وطن رائے بریلی سے ابتدائی تعلیم کے بعد جب دہلی پہنچے تو سراج الہند نے تعلیم روحانی کے لیے شاہ عبدالقادر کے سپرد کیا ان کی پیشانی کو دیکھ کر اس حقیقت کو پڑھ لیا کہ قدرت ان سے ایک عظیم کام لے گی چنانچہ بعد تکمیل باطنی سراج الہند نے اپنی دستار مبارک ان کے سر پر باندھ کر خطہ دوآبہ (دیوپی) کی اصلاح و ارشاد کے لیے روانہ فرمایا سید والا گوہر کا جس خطہ میں نقش قدم پڑا وہاں دین و ملت کی سوکھی کھیتوں میں زندگی اور سرسبزی و شادابی کے آثار پیدا ہوئے ہزار ہا بندگان خدا راہِ راست سے بھٹک گئے تھے شریعت کے روشن راستہ پر لگ گئے جو عاملِ شریعت تھے ان کو حاملِ طریقت و معرفت بنا دیا غرض سید صاحب کا یہ تبلیغی و اصلاحی دورہ خدا کی رحمت کا ایک بادل تھا جہاں جہاں وہ برسا زندگی کی لہر دوڑ گئی پھر سفر حج میں شمالی ہند کے بعد بہار و بنگال کی سرزمین کو سید صاحب کی اصلاحی و تربیتی فیوض نے سیراب کر دیا۔ حج سے واپسی کے بعد وہ زمین تیار ہو گئی جس کے لیے محنت کی گئی تھی مجاہدہ و ریاضت کے بیج ڈال دینے کے بعد فصل تیار ہو کر کھڑی ہو گئی حضرت سید شہید کا قافلہ گوہر مقصود حاصل کرنے کے لیے سرحدِ آزاد پہنچا اور وہاں تحریک جہاد کا آغاز فرمایا مرکزی حکومت کی کمزوری نے عرصہ دراز سے سکھوں کو کامل تسلط بخش دیا تھا انھوں نے اہل اسلام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر زندگیوں کو اجیرن کر رکھا تھا اس قدر ترقی طور پر ان ہی سے مڈ بھیڑ ہوئی مجاہدین کی بے سروسامانی کے باوجود ان کی اخلاص مندی نے کامیابی کے

جھنڈے لہرا دئے اور اس علاقہ میں اسلامی نظام قائم ہو کر اسلام کی ابتدائی صدی کے جاں نثاروں یعنی صحابہ کرام کی یادوں کو تازہ کر دیا باطل رسم و روایت کا قلع قمع ہو کر حقیقی اسلام کا چہرہ اس خطہ میں جلوہ افروز ہوا لیکن اس انقلاب حال سے سرحد کے سرداروں اور خانوں کو اپنی چودھراہٹ مٹی میں ملتی ہوئی نظر آئی اس لیے سید صاحب کی فتوحات سے ڈر کر انھوں نے سکھ سرداروں سے ساز باز کر کے اندر ہی اندر بے وفائی و غداری کا کھیل کھیلا اور مجاہدین کو نقصان پہنچایا اور سید صاحب کے مقرر کردہ قاضیوں کو ایک ہی رات میں ذبح کر کے نظام اسلامی کو بھی ذبح کر دیا سید صاحب نے مرکز اجمت کو چھوڑ کر دوسرا مرکز تجویز کیا لیکن سانحہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء نے سالہا سال کی محنتوں سے لگاتے ہوئے چمن کو تاراج کر دیا سید شہید کی شہادت پر تحریک کا پہلا دور ختم ہوا سید صاحب نے اپنی شہادت سے پہلے اس تحریک کو ملک میں پھیلانے کے لیے خصوصی خلفار کو ہندوستان روانہ کیا تھا۔ مولانا سید اولاد حسن والد ماجد نواب صدیق حسن کو یوپی کے لیے مولانا سید علی رامپور کو جنوبی ہند میں اس کے لیے اور مولانا ولایت علی کو حیدر آباد دکن کے لیے نامزد فرمایا چنانچہ مولانا ولایت علی نے اس سانحہ کے بعد از سر نو کمان سنبھالی اور سید شہید کے چھوڑے ہوئے کام کو نئے سرے سے شروع فرمایا مولانا ولایت علی کی شخصیت تحریک جہاد کے سلسلہ میں سید شہید کی ایک زندہ کرامت تھی وہ خود رئیس زادے مولوی فتح علی رئیس پٹنہ کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خان صوبہ بہار کے آخری گورنر کے نواسے بے حد ذہین و ذکی عیش و عشرت کی فضا کے پروردہ ایک من چلے اور بانگے نوجوان تھے جنھوں نے سید صاحب سے طالب علمی کے زمانے میں اپنے منطقی استاد مولانا اشرف فرنگی محلی کی معیت میں ملاقات کی تھی اور سید صاحب کی تقریر میں ان کی دل کی دنیا کو ہی بدل دیا تھا سید صاحب

کی سفر حج سے واپسی پر ان کا استقبال کرنے اپنے بھائی عنایت علی کے ساتھ
پٹنہ سے منگیر تک پاپیادہ آئے تھے اور جب سید صاحب پٹنہ پہنچے تو مولانا اور ان کے
خاندان نے سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنی زندگی کا سودا راہِ حق کے لیے
کیا چنانچہ معرکہ جہاد میں سب سے پہلے ان کے چچا زاد بھائی باقر علی شہید ہوئے
ابتداء میں جب رئیسانہ شان سے سید صاحب کے یہاں پہنچے تو لوگوں نے خیال
ظاہر کیا کہ وہ قافلے کے لیے بار ہوں گے لیکن سید صاحب نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ
وہ راہِ صدق و صفا میں قدیم لوگوں سے بھی بازی لے جائیں گے چنانچہ چند دن کے
فیضِ صحبت نے ظاہری شکل کی تبدیلی کے ساتھ ان کے اندر ایسا باطنی انقلاب پیدا کیا
کہ وہ ناز پروردہ ، رئیس راہِ جہاد میں ایک محنتی اور جفاکش مزدور بن گیا جنگل سے
لکڑیاں کاٹ کر لاتے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے گارا بنا کر مکان بناتے شاہ
اسماعیل شہید سے سندِ حدیث لے کر ان کے مجاہدانہ رنگ میں ایسے رنگ گئے کہ
ان کے نائب ہو گئے توجیدِ خالص کی دعوت اور باطنی اصلاح و تربیت ان کی
زندگی کا روشن عنوان بن گئے وہ سید صاحب کے قافلے کے ساتھ آزاد سرحد
پہنچ کر فریضہ جہاد کی عملی تربیت بھی حاصل کر لی جب مولانا ارشاد و جہاد دونوں
میدانوں کے شہسوار بن گئے تو سید صاحب نے سب سے پہلے ان کو حیدر آباد
دکن کے لیے نامزد فرمایا عرض کیا کہ بندہ تو زندگی کا اندرانہ بارگاہِ حق میں پیش کرنے
کے لیے حاضر ہوا تھا آپ پھر وطن واپس کر رہے ہیں فرمایا مولانا ہم آپ کو تحم
کر کے اٹھاتے ہیں ان کے سر پر اپنا عمامہ رکھ کر ارشاد فرمایا کہ کلمہ حق کے اظہار
میں کسی کا خوف نہ کرنا اور خلقِ خدا کو حق کی طرف بلاتے رہنا کہ اسی فرض کی ادائیگی
میں خیر و برکت ہے مولانا ولایت علی جب حیدر آباد دکن پہنچے جو لکھنؤ کے اجڑ جانے
کے بعد عیش و عشرت کی پناہ گاہ بن گئی تھی تو ان کی صدائے حق میں عوام ہی کے
دلوں میں گھر نہیں کیا بلکہ امرار کے عشرت کدوں میں اس آواز نے ایک زلزلہ
برپا کر دیا نواب بہار زالدولہ جو نظامِ ناصرا الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا بڑے حضرت

کا مرید ہوا اور اس کی دنیا ہی بدل گئی مولوی زین العابدین اور محمد عثمان جو ان کے مقرب تھے اور جن کو دریافت احوال کے لیے بھیجا گیا تھا وہ ایسے مرید و گرویدہ ہوئے کہ سرحد پہنچ کر راہِ حق کی شہادت حاصل کی اس چار سال کی مدت میں مولانا کے ارشاد و ہدایت سے دکن میں روحانی انقلاب برپا ہوا جب سید صاحب کی خبر شہادت پہنچی تو مولانا چودہ حلقے دکن میں قائم کر کے اور دس ہزار انسانوں کو راہِ جہاد پر لگا کر حیدر آباد کا کام اپنے خلفاء کو سونپ کر روانہ ہوئے راستہ میں برہان پور، جبل پور وغیرہ میں تخم ہدایت بکھیرتے ہوئے اور چراغ ہدایت روشن کرتے ہوئے دو برس میں پٹنہ پہنچے اور کمر ہمت باندھ کر صادق پور کو دعوت جہاد کا مرکز پورے ملک کو چند حلقوں میں بانٹ کر خلفاء کے ذمہ دعوتی کام سونپا وہ پہلے انقلابی مولوی ہیں جنہوں نے مطبع قائم کرا کے اور حضرت شاہ اسحق دہلوی سے رابطہ قائم کر کے موضح القرآن ترجمہ شاہ عبدالقادر اور مولانا شہید وغیرہ کے سو رسائل چھاپ دئے اور دعوتی لٹریچر کو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دیا۔ مولانا محمد علی رام پوری نے مدراس میں کامیابی حاصل کی اور خان بہادر نواب تہنور جنگ کو حلقہ ارادت میں لے کر تحریک سے وابستہ کیا اور مرکز سے جوڑ پیدا کیا۔ بڑے حضرت مولانا ولایت علی مجاہدین کے قافلے پہ درپے سرحد روانہ کرتے ہوئے خود بھی استہانہ (مرکز جہاد) جا پہنچے اور دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر کے تحریک کا آغاز کیا لیکن برطانوی سامراج بھی آزاد سرحد کی اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے غافل و بے خبر نہ تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرجانے کے بعد سکھ قوم کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا چنانچہ اس نے آزاد سرحد کے قبائلی سرداروں کو اپنے روپہلی اور سنہری جال میں گرفتار کر کے مولانا کے خلاف لاکھڑا کیا اور کچھ معرکہ آرائیوں کے بعد مجاہدین کو زک پہنچا کر مولانا کو اپنے وطن صادق پور واپس ہونے پر مجبور کیا مولانا نے وطن پہنچ کر تھوڑے دنوں بعد چولا بدلا اور بظاہر جاگیر کی درستی، محلات و باغات کی مرمت و آراستگی میں بھلا دادینے کے لیے لگ گئے

لیکن اندر ہی اندر جہاد کے لیے تیاریاں جاری رکھیں اور رازداری کے ساتھ مرکزی نظام قائم کر کے اور اپنا دامن جھاڑ کے چل کھڑے ہوئے لکھنؤ و دہلی ہوتے ہوئے اور مغل بادشاہوں سے ملتے ہوئے مرکز جہاد استہانہ پر پہنچ گئے اور پھر وطن کی طرف پیچھے مڑ کر نہ دیکھا سرحد پہنچ کر سابقہ تجربات کی بنیاد پر مولانا نے سرحد کے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دینے سے پہلے اصلاحی و تربیتی کام شروع کیا اس حقیقت کے پیش نظر کہ جب تک یہاں کے مسلمانوں کو دعوتی رنگ میں نہ رنگا جائے برطانوی سامراج سے ٹکر لینا مضربے چھوٹے حضرت مولانا عنایت علی جو ایک گرم جوش مجاہد تھے اس رلے سے متفق نہ ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا سلسلہ جاری کرنا چاہتے تھے لیکن مولانا کے اخلاص نے اس جھگڑے کو آگے نہ بڑھنے دیا آخر سید شہید کا سچا جانشین اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دیتا ہوا ۵ نومبر ۱۸۵۳ء کو مولائے حقیقی سے جا ملا اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی خلیفہ ہوئے جنہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کا بگل بجا دیا اور جس قبیلے یا سردار سے انگریزوں کے خلاف میدان میں اترنے کی امید ہوتی ان سے ہاتھ ملایا لیکن سرحد کے سردار چڑھتے سورج کے پجاری تھے جس کا پلہ بھاری نظر آتا اس کے پلڑے میں اپنی طاقت ڈال دیتے اور نفع حاصل کرتے اس نفاق پر ور ماحول میں ایمانی فضاؤں کا قائم رکھنا اور معرکہ جہاد کو فتح یابی کی منزل تک پہنچانا ایک کٹھن معاملہ تھا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے حضرت نے برطانوی سامراج کو تنگنی کا ناچ سچا یا سرولیم نہڑنے اس طرح اس کا اعتراف کیا ہے۔

”اس دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف اکسایا جس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء ہم علیحد علیحدہ مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار تھی چھپٹن سے ساٹھ تک مہموں کی گنتی بیشل تک

پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی فوج اور پولس اس کے علاوہ تھی۔“

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۸-۳۹)

آخر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان پر کامل تسلط کے بعد برطانوی سامراج نے مجاہدین کے مراکز کو مکمل تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ بنایا اور یکے بعد دیگرے سرحد کے غداروں کی مدد سے ”پنجتار“ ”منگل تھانہ“ اور آخر میں ”استھانہ“ کو تہس نہس کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن مجاہدین نے اپنی شکست نہ مانی مولانا عنایت علی نے معرکہ جہاد قائم رکھتے ہوئے اور فرنگی سامراج سے لڑتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال فرمایا۔

اس تحریک کے کٹر دشمن ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی زبان قلم سے جو بے ساختہ تحسین آمیز کلمات ابل پڑے ہیں وہ اس تحریک کی صداقت کی روشن سند ہے۔

جن لوگوں نے تحریک کی دعوت پر لبیک کہا انھوں نے اپنی ساری زندگی اور قوتیں اس مقصد کے لیے وقف کر دیں وہ اپنے آپ کو بالکل بھول چکے تھے انھیں کوئی چیز یاد تھی تو وہ تحریک اور اس کی دعوت تھی ان کی زندگیاں بیدار تھیں وہ انگریز حکومت کو کافر حکومت قرار دیتے اور اسے تباہ کرنے میں سرگرم عمل رہتے وہ بانی وہ ہے جو کسی سے نہ ڈرے اور نہ اصول کے خلاف کسی کی رعایت کرے اس کی زندگی کا راستہ صاف ہے کسی قسم کی تہدید یا تشدد (سختی و دھمکی) اس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتی یہ لوگ اپنے عقیدوں کے مطابق بڑے پاک طینت تھے انھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لیے نہیں۔

تحریک کاروں کے متعلق ہنٹر کی زبان قلم سے جو تحسینی کلمات بے اختیارانہ صادر ہوئے وہ قابل دید ہیں وہ لکھتا ہے:

”مقامی مبلغین بعض اوقات خطرناک آتش فشاں ثابت ہوئے ہیں مگر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں ان میں سے اکثر خدا ترس نوجوانوں کی زندگی شروع کرتے ہیں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والے سب سے زیادہ بے غرض اور بے لوٹ ہوتے ہیں اور وہ نہایت دلیری سے عوام الناس میں تبلیغ کرتے ہیں ان کا سیاسی و مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی امید و بیم کے عین مطابق ہے اور ان میں ہزاروں اشخاص ایسے ہیں جو فی الواقع بڑے ہی متقی ہیں اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتے ہیں یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہوتے ہیں اور ان ہی کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بے حد عزت و تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔“

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

ریاست بھوپال کا ولی الہی تحریک کے اس دوسرے دور سے بھی خصوصی تعلق رہا ہے اس لیے کہ ریاست کو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام پر پہنچانے والی عظیم شخصیت منشی جمال الدین مدار الہام کا اسی جماعت سے تعلق تھا انھوں نے سانحہ بالا کوٹ کے بعد شیخ المحدثین شاہ عبدالقیوم محدث بھوپال ذیرہ شاہ عبدالعزیز کو دعوت دے کر بھوپال کو ان کے قیام سے عزت بخشی اور بھوپال ولی الہی سلسلہ کی سنہری کڑی بن گیا حضرت شاہ اسحاق دہلوی کی ہجرت کے بعد ان کے قائم مقام مولانا مملوک علی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہوئے استاد الاساتذہ مولانا مملوک علی جس طرح منشی جمال الدین مدار الہام کے استاد بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے جی استاد تھے بلکہ یہی مولانا مملوک علی سرسید احمد خاں بانی مدرستہ العلوم علی گڑھ اور شمس العلماء مولانا ذکار اللہ کے بھی

استاد تھے اس تحریک کا تیسرا دور ۱۹۵۷ء کی جہاد آزادی کا دور ہے جس کے اندر سید الطائفہ حاجی امداد اللہ امیر جہاد اور مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی جنرل و کرنل کی حیثیت سے اس معرکہ میں مردانہ وار شریک ہوئے تھانہ بھون سے تحصیل شاملی تک میدان جہاد بنا لیکن ان بزرگوں کی دہلی تک پہنچنے سے پہلے ہی پانسہ پلٹ گیا اس تیسرے دور ۱۹۵۷ء میں بھی بھوپال ملک سے پیچھے نہیں رہا جس کی تفصیل دوسرے باب میں آ رہی ہے۔

جہاد ۱۹۵۷ء کے بعد ولی اللہی جماعت نے میدان جنگ بدل دیا اور اسلامی درسگاہوں کے قلعوں میں بیٹھ کر فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کا ایک طویل المیاد منصوبہ بنایا اس لیے کہ برطانوی سامراج نے ملک کے ہر گوشہ میں اپنے فولادی پنجے گاڑ دیے تھے امام نانوتوی کے بعد ان کے سچے جانشین مولانا محمود الحسن آحسری امام تھے۔

دعوتِ جہاد کی ناکامی کے وجوہ و اسباب

ولی اللہی جماعت نے آغاز کار اصلاحی و انقلابی دونوں طریقوں سے اپنے دائرہ کار کو آگے بڑھایا اگرچہ اس کی روح دعوتِ اسلامی کی طرح اصلاحی ہے لیکن مخالف طاقتوں کی وجہ سے اس کو انقلابی جماعت (مجاہدین) بن کر میدان میں آنا پڑا اور اپنی ملت کے تحفظ کی خاطر بے سروسامانی کے باوجود سامراج سے ٹکرا لینا پڑا اس لیے ایک سوال دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ولی اللہی جماعت جس نے اپنی دعوت میں معاش و معاد، دین و دنیا، مادیت و روحانیت دونوں کو سمویا تھا اس کی انقلابی تحریک شکست سے کیوں دوچار ہوئی جبکہ خالص مادی معاشی بنیادوں پر اٹھائی ہوئی اشتراکی تحریک نہ صرف روس میں کامیاب ہوئی بلکہ آدھی دنیا پر اس نے اپنے اثرات ڈال رکھے۔

(۱) اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اس دعوت کو شاہ عبدالعزیز کے بعد ان جیسا جامع علم و عمل مقبول خاص و عام قائد میسر نہ آ سکا ان کے جانشین کچھ علم و فضل کی راہ میں بڑھے ہوئے تھے تو عملی میدان میں پیچھے تھے اور جو عملی میدان کے شہسوار تھے وہ علم و فضل میں اس درجہ بلند پایہ نہ تھے سراج الہند جیسی جامعیت و کمالیت اور نابغیت ہر فرق و طبقہ میں ہر دلعزیزی اور خداداد مقبولیت پھر کسی کو حاصل نہ ہو سکی امیر سید احمد شہید نے دعوتِ جہاد کو ایک مرحلہ پر پہنچا کر جامِ شہادت نوش فرمایا اور شاہ محمد اسحق تعلیمی و تربیتی نظام کے ذریعہ اپنے شاگردوں کی ایک عظیم جماعت پیدا کر کے راہِ ہجرت پر گامزن ہوئے لیکن جن دو بازوؤں (علماء و مجاہدین)

کے مل جانے سے دعوت کا میانی کی منزل تک پہنچ سکتی یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی۔

(۲) دوسری وجہ اس دعوت کی منزل مقصود تک نہ پہنچنے کی تاریخ اسلام کا پرانا قضیہ نامرضیہ ایرانی و تورانی (شیعہ و سنی) کی کشمکش ہے جس نے ہر مرحلہ پر ملی اجتماعیت کو نقصان پہنچا اور فرنگی سامراج کی متحدہ طاقت کا مسلمانان ہند متفق ہو کر مقابلہ نہ کر سکے جس طرح بغداد میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے میں مسلمانوں کے دو صفوں میں بٹ جانا اس کا سبب بننا یہی حال دہلی کا ہوا جس طرح شیعہ وزیر اعظم ابن علقمی نے درپردہ غنیم (ہلاکو) سے ساز باز کر لی اور محقق طوسی کے اشارے پر ہلاکو کو بغداد کے تاراج کرنے کی جرأت ہوئی یہی حالت یہاں بھی پیدا ہوئی امیر الامار نجیب الدولہ (جو دعوت ولی اللہی کا مخلص کارکن اور شاہ صاحب کا مرید تھا) اور نواب آصف جاہ بانی حکومت دکن اور حافظ الملک رحمت خاں ایک طرف تھے اور سید حسین علی اور ان کے سادات بارہ جو آخری دور میں بادشاہ گربن گئے تھے وہ بادشاہ کو دوسری سمت میں لے جانا چاہتے تھے برطانوی سامراج نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مریض کی اندرونی کمزوریوں کو جانچ لیا اور پھر اس سے فائدہ اٹھایا چنانچہ نجف علی شیعہ کو توال کے ایما پر مرزا مظہر جان جاناں جیسے پاک باطن صوفی بزرگ کا سانحہ شہادت پیش آیا اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی جلاوطنی عمل میں آئی اس کے بعد لکھنؤ کے نواب شجاع الدولہ کو حافظ الملک بانی سلطنت روہیل کھنڈ اور نواب نجیب الدولہ سے ٹکرا کر مغل حکومت کے دو بازوؤں کو توڑ دیا گیا ایسے مخالفانہ ماحول اور معاندانہ فضا میں شاہ صاحب اور ان کی جماعت کو اپنی مدافعت کے لیے مجبور ہونا پڑا شیعہ سنی علماء میں مناظر فی لٹریچر کا تبادلہ ہوتا رہا دانا یا ان فرنگ کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر کے اپنی طاقت کو مضبوط بنایا اور اپنی ڈپلومیسی کے جال میں اب آدھے ملک کو کس لیا کیوں کہ ولی اللہی دعوت جہاد کا اصل

نشانہ برطانوی سامراج تھا اس لیے مجاہدین کو سکھوں سے بھڑایا غرض سقوط بغداد کی کہانی سقوط دہلی کی شکل میں دوبارہ دہرائی گئی ان حوصلہ فرسا حالات میں بھی مجاہدین حریت کے تحریکات کے قائم رہنے کو ولی اللہی دعوت کی کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔

(۳) ہمارے نزدیک مشرقی اقوام کی مغربی سامراج کے مقابلہ میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال حکومت یا بادشاہت کرتے کرتے ایشیائی قومیں عیش پرستیوں اور غفلت شعالیوں میں پڑ کر اپنی جوان قوتوں کو ضائع کر چکی اور بڑھا پے کا شکار ہو چکی تھیں صدیوں کی شہنشاہیت کی مطلق العنانی نے خواص و عوام کے عملی قومی کو مضمحل کر دیا تھا وہ ایجاد سامانی اور سائنسی انکشافات کی تازہ قوتوں سے قطعاً نابلد و بے بہرہ اور ان کے استعمال سے قاصر تھے تہذیب و تمدن کے زوال پذیر اقدار سے چپٹی ہوئی اور زوال آمادہ آثار کو سینے سے لگائی ہوئی تھیں وہ منگولین قبیلے جو مشرق باسلام ہونے کے بعد ترک منحل کھلائے شجاعت و بہادری کا مذاق اور فنون لطیفہ سے دلچسپی کا ذوق تو ان کی فطرت میں پیوست تھا لیکن اندلس کے عربوں کی سائنسی ذوق سے یکسر محروم تھے اسپین کے اندر عرب علماء ابن رشد، ابن باہ، ابن طفیل، ابن الہشیم، زہراوی کے ہاتھوں جس سائنس کا آغاز ہوا تھا یورپ کے محققین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ”کوپرنیکس“، گلیلیو، بن قلم، نیوٹن، نیل اور ڈارون جیسے زبردست فلسفہ اور سائنس کے امام پیدا ہوئے یونان روما کی مردہ تہذیب نے مغرب کی سرزمین میں نیا جنم لیا یورپ کے ان تمام طالبان علم نے عربوں کے سرزمین علم و ہنر اندلس کے مشہور عالم درس گاہوں قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیا اور سسلی کے سیلر نوں پہنچ کر سائنسی علوم سے نئی زندگی و توانائی حاصل کی اور سترھویں صدی نہ آنے پائی تھی کہ یورپ ایک مردجواں اور سیاست ڈپلومیسی کا طاقتور پہلوان بن کر ایشیائی قوموں کے میدان میں خم ٹھونک کر آگیا اور جدید سائنسی مہلک ایجادات کے ذریعہ

میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا جس کے آگے مشرقی قوموں اور مشہور عالم بہادر ترکوں کے شمشیر زن بازو شل ہو گئے ان نئی توپوں، مشین گنوں اور مہلک ہتھیاروں نے پرانی روایتی بہادری کے افسانوں کو قصہ پارینہ کر دیا مغرب نے پورے مشرق پر دھاوا بول دیا اور ایک ایک کر کے تمام ملکوں پر اپنے جھنڈے لہرا دئے ایشیا کے سربراہوں، بادشاہوں، سرداروں کو آپس کی لڑائی ہی سے فرصت نہ تھی کہ ان بیرونی طاقتوں کا منتفق ہو کر مقابلہ کرتے مغربی سامراج نے ان ملکوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرے ایک صدی ہی میں مشرق کی سر زمین کا مالک و مختار بن بیٹھا اور ایشیا کے صدیوں کے محفوظ خزانوں اور مال و دولت کے ذخیروں کو خانہ بیغا کی طرح لوٹ کر مشرقی ممالک کو مفلس و قلاش اور کنگال بنادیا ہندوستان جو سونے کی چڑیا سمجھی جاتی تھی وہ ان ظالم صیادوں کے ہاتھوں پڑ کر بے بال و پر ہو کر رہ گئی۔ ایشیا کا خوں چوڑ کر اس کو ضعیف و نحیف اور کمزور بنادیا اور یورپ ایک مردنومند نظر بن گیا یہاں کی دولت نے یورپ کے کارخانوں کو فروغ دیا اور انگلستان میں اسکی بدولت صنعتی انقلاب آگیا۔

ظاہر ہے کہ ان پر خطر و پر آشوب حالات میں ولی اللہی دعوت کے علم بردار جماعت اپنے ملی وجود کی حفاظت اور دشمن کی ریشہ دوانیوں سے مدافعت پر ہی توجہ کر سکتی تھی چنانچہ وہ اپنے قومی، ملی فریضہ کو قائم رکھتے ہوئے نہضتِ ثانیہ کی طرف بڑھنے کے قابل ہوئے۔

(۴) ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ولی اللہی دعوت کا آغاز جس وقت ہوا تھا اس وقت ہندوستان جدید نشر و اشاعت (مطبوع یا چھاپہ خانہ سے) محروم تھا مارکس اور اینگلس کی کامیابی میں جہاں ان کی ذاتی حیثیت کو دخل ہے وہاں پریس کی طاقت جو ان کے ہاتھ آگئی تھی اس کا بھی زیر دست عمل دخل ہے جس نے لاکھوں انسانوں کو ان کے خیالات و نظریات کو باسانی پہنچا کر متاثر کیا شاہ صاحب کی تحریک اس دوسری طاقت (پریس) سے محروم رہی اس لیے ان کی دعوت

علمی حلقوں تک محدود رہی عوام کے لیے نشر و اشاعت کے جو ذرائع تھے وہ (۱) یا تو وعظ و نصیحت کے حلقے تھے یا دینی تعلیمی ادارے (۲) اس لیے ولی اللہی دعوت نے ایک طرف دشمن کے حملوں سے حفاظت و مدافعت کا فرض انجام دیا اور دوسری طرف تعمیر ملک و ملت بلکہ تعمیر انسانیت اصلی نصب العین کو اپنے سامنے رکھا اور ارشاد و ہدایت کے لیے عوام میں تربیت نفس، تزکیہ اخلاق اور اصلاح معاشرت کے لیے ادارے، خانقاہیں قائم کیں اور دوسری طرف خواص کے طبقہ میں اسلامی علوم و فنون کو باقی رکھنے اور ان کو نئے ماحول میں رہنمائی کا فرض انجام دینے میں تعلیمی درس گاہوں کا جال بچھا دیا ریاست بھوپال کو یہ خصوصی فخر حاصل ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے قابل اعتماد شاگردوں کے علمی فیوض و برکات کامرکز بن گئی۔

ولی الہی دعوت اور بھوپال

حضرت شاہ ولی اللہ کے سنہری سلسلے کی ایک اہم کڑی ریاست بھوپال روز اول سے ہی رہی ہے بھوپال سے حضرت شاہ صاحب کا قیام ریاست سے پہلے ایک قدیمی رشتہ تو یہ ہے کہ حضرت حکیم الہند کے جد امجد وجیہ الدین کی شہادت گاہ اور ان کا مزار دوراہہ (بھوپال) میں ہے دوسرا خود حضرت شاہ صاحب سے ایک روحانی رشتہ (جس سے اکثر لوگ نابلد و ناواقف ہیں) یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے براہ راست شاگرد مولانا مولوی ضیاء الدین بھوپالی ہیں جو حضرت شاہ ابواللیث نقشبندی (خلف و خلیفہ شاہ ابوسعید مجددی رائے بریلوی) کے خلیفہ بھی ہیں جن کا مزار بھوپال میں ضیاء الدین ٹیکری پر واقع ہے جو اب ایک محلہ بن کر احمد آباد کہلاتا ہے۔

مولانا مولوی شاہ ضیاء الدین بھوپالی

مولانا مولوی شاہ ضیاء الدین قاضیان دوراہہ کے ممتاز عالم و فاضل بزرگ تھے ان کا نسب سلسلہ میرٹھ کے فاروقی اور ننھیالی سلسلہ صدیقی خاندان سے ملتا ہے قاضی سراج الدین طاط پوش ان کے مورث اعلیٰ تھے جن کے آبار و اجداد کو عالمگیر کی طرف سے اس علاقہ میں منصب قضا کا اعزاز دیا گیا تھا ان کے والد قاضی نجم الدین اور ان کے نانا بھوپال کے نامور مفتی خاندان کے مورث اعلیٰ

مفتی خیر اللہ صدیقی تھے مولوی صاحب نے جن والدہ ماجدہ کی آغوش میں پرورش پائی وہ ایک نہایت پرہیزگار خاتون تھیں مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو بے وضو کبھی دودھ نہیں پلایا مولوی صاحب تقریباً ۱۱۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے حقیقی ماموں شاہ عبد الغفور سے علوم ظاہری بھی تحصیل کیے جو ایک جید عالم اور باکمال درویش تھے شعر و ادب کا ذوق ان کے فیض تربیت سے مولوی صاحب میں منتقل ہوا مزید تکمیل کے لیے مرکز العلوم دہلی پہنچے اور وہاں حضرت شاہ صاحب ان کے صاحبزادگان عظام قاری عبد المجید المعروف بصوبہ ہند اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے علوم معقول و منقول کا درس لیا شاہ ابواللیث نقشبندی سے تکمیل باطنی کی اور پھر مراجعت فرمائے وطن (بھوپال) ہو کر حضرت شاہ رؤف احمد مجددی سے روحانی تکمیل کی اور ریاست کے خواص و عوام میں یکساں مقبول ہوئے نواب غوث محمد خاں (جو ان کے معتقد تھے) اپنے صاحبزادوں نواب معزز محمد خاں، فوجدار محمد خاں کی تعلیم و تربیت سپرد کی سات گاؤں جاگیر میں دئے گئے مولوی صاحب گاؤں گاؤں پہنچ کر اشاعت اسلام اور رفاہ عام کے کام انجام دئے اور ولی الہی دعوت کے فیوض و برکات کو پورے خطہ مالوہ میں عام کرتے قدرت کی طرف سے ان کو عمر دراز ملی نواب قدسیہ بیگم (جو ولیہ صفت اور درویش صفت عورت تھیں) نے جامع مسجد بھوپال کا سنگ بنیاد ان مادر زاد ولی سے رکھوایا ان کی زندگی عالمانہ درویشانہ اور متوکلانہ رہی ہر سائل ہر ضرورت مند کی حاجت روائی فرماتے وہ ایک متبع شریعت شیخ طریقت اور عالم فاضل بزرگ تھے نقیصہ و حقائق میں ان کا پایہ بہت بلند تھا ایک مثنوی عناصر ضیاء کے نام سے مولانا روم کی مثنوی کے رنگ میں لکھی تھی جس پر شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کی تقریظات تھیں ۶ محرم ۱۲۵۱ھ ایک سو بیس کی عمر میں شاہ ولی اللہ رحمہ کے اس شاگرد رشید نے داعی اجل کو لبیک کہا اور وہ ٹیکری جو ان کی چلہ کشی کا مرکز تھی وہیں ان کا مزار بنا نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے شوہر احمد علی خاں

(عرف سلطان دولا) کی عقیدت مندی کی بنا پر احمد آباد کے نام سے اس خطہ کو آباد کر دیا۔

مفتی الہی بخش کاندھلوی بھوپال میں

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی ذات جامع صفات ہمارے ملک میں سند اکمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شاہ صاحب کا عمومی فیض شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے ذریعہ پھیلا۔ سراج الہند شاہ عبد العزیز کا بھوپال سے خصوصی تعلق اس طرح سے ہے کہ جب دارالسلطنت دہلی بنجف علی شیعہ کو تو ال کے ہاتھوں آپ کو طرح طرح کے مظالم کا شکار ہونا پڑا۔ تو اس وقت نواب حیات محمد خاں (نصیرہ سردار دست محمد خاں) کے دیوان چھوٹے خاں نے حضرت شاہ صاحب کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور بارہ ہزار کی جاگیر کی پیش کش کی جس پر شاہ صاحب نے معذوری ظاہر فرمائی ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب جس انقلابی و اصلاحی دعوت کے امام و قائد تھے وہ دارالسلطنت دہلی کو چھوڑ کر کیوں کر انجام پاسکتا تھا؟ اس لیے شاہ صاحب نے اپنے خصوصی شاگردوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا تھا ولی الہی دعوت کے مرکزوں میں سے ایک مرکز نجیب آباد بھی تھا۔ نواب نجیب الدولہ جو شاہ ولی اللہ کا مرید تھا۔ اس کے اور نواب حافظ الملک رحمت خاں۔ المتوفی ۱۱۸۸ھ کے ذریعہ شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ۱۱۸۸ھ میں بلایا تھا۔ انھیں نجیب الدولہ دعوت ولی الہی کو پھیلانے کے لیے ایک مدرسہ نجیب آباد میں قائم کیا تھا۔ جن کی علم دوستی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے جو شاہ صاحب نے فرمایا ”نزد نجیب الدولہ دولہ نہ صد عالم بود۔ ادنی پنج روپیہ و اعلیٰ پنج صد۔ روپیہ می یافت۔“

(ملفوظات شاہ عبد العزیز ص ۸۱)

یعنی نجیب الدولہ دولہ کے یہاں نو سو عالم تھے جن کی تنخواہ ادنیٰ پانچ روپیہ سے

پانچ سو روپیہ تک تھی۔ اسی مدرسہ میں مفتی الہی بخش صاحب کو سراج الہند نے بھیجا تھا۔ جہاں ان کے فتاویٰ اور فیصلے چلتے تھے۔ نواب نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۱۸۳ھ نواب ضابطہ خاں (جوان کا لڑکا تھا) کے دور میں حضرت مفتی صاحب کا سگہ ان دیار میں چلتا رہا۔ لیکن جب ۱۱۸۶ھ میں نواب کو شکست ہوئی۔ اور دعوت علم کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا تو ۱۱۸۵ھ میں مفتی صاحب دیوان چھوٹے خان کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے حضرت مفتی صاحب کا نسب امام رازی کے واسطے سے صدیق اکبر تک پہنچتا ہے ان کا خاندان ایک عرصہ سے علم و فضل کا خاندان تھا۔ ان کے جد امجد قطب الدین اور ناناشیخ محمد عالم فاضل لوگوں میں سے تھے ان کے والد شیخ اسلام کے دو صاحب زادے مفتی الہی بخش اور مولانا محمود بخش ہوئے۔ مؤخر الذکر کے صاحب زادے مولانا مظفر حسین المتوفی ۱۲۸۳ھ جو تقویٰ و طہارت اور اتباع سنت میں یکتائے روزگار تھے۔ مفتی صاحب کی ولادت ۱۱۲۳ھ کاندھلہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد تکمیل کے لیے حضرت سراج الہند کی صحبت بابرکت میں دہلی پہنچے ایک مدت تک شاہ صاحب سے ظاہری و باطنی تکمیل فرمائی پھر شاہ صاحب کے ایماں اولاً نجیب آباد پھر بھوپال کو اپنی دینی و علمی خدمات کا مرکز بنایا اور ایک عرصہ تک ان اجرے دیار کو اپنے علمی و عملی کمالات سے معمور فرمایا۔

شیم الطیب فی ذکر فضائل کی تصنیف ۱۲۲۹ھ میں شہر بھوپال میں ہوئی۔ یہ ان ہی کی یادگار ہے دیوان چھوٹے خاں کے انتقال ۱۲۰۹ھ کے بعد ریاست غازی پور اور پھر فرنگی سامراج کی۔ سیاسی ڈپلومسی کی شکار ہو چکی تھی اس لیے حضرت مفتی صاحب اپنے وطن چلے گئے۔ اور اپنی علمی تصانیف سے ایک عالم کو فیضیاب کرتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کا ولی اللہی دعوت جہاد کے ساتھ تعلق کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ۱۲۲۲ھ میں حضرت امیر سید احمد شہید نے شاہ عبدالعزیز

صاحب کے ایما پر دو آبہ آ (شمالی یوپی) کا دورہ فرمایا تو حضرت مفتی صاحب نے شیخ طریقت ہونے کے باوجود ایک جواں سال و باکمال اور مجاہد حضرت سید شہید سے تجدید بیعت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب نے ۱۲۴۵ھ میں کاندھلہ میں وفات پائی۔ ان کا پورا گھرانہ سراج الہند کے مخلصین پر مشتمل رہا۔ عربی فارسی میں تقریباً چالیس کتابیں یادگار چھوڑیں جس کے اندر خاتمہ مشنوی معنوی کی زیادہ شہرت ہوئی اور خاتم مشنوی کے لقب سے وہ مشہور ہوئے۔

شاہ رؤف احمد مجددی

حضرت سراج الہند کے براہ راست شاگردوں میں سے جن بزرگوں نے بھوپال کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا ان میں شاہ رؤف احمد مجددی بھی ہیں جو خاندانہ مجددیہ کے چشم چراغ، عالم شریعت، شیخ طریقت، علوم ظاہری معارف باطنی اور شعر و ادب کے ماہر تادھے وہ حضرت مجدد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے شاہ محمد یحییٰ کی اولاد میں ہیں ان کے والد ماجد شاہ شعور احمد پہلے ہی انتقال کر چکے تھے اس لیے اپنے جد امجد شیخ محمد مستقیم کی آغوش عاطفت میں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سن ولادت ۱۲۱۱ھ ہے بچپن سے حضرت شاہ ابوسعید مجددی ولادت ۱۲۹۶ھ وفات ۱۲۴۹ھ یہ ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ رفیق درس اور شریک تعلیم و تربیت رہے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں معقولات اور پھر مرکز العلوم دہلی میں جملہ علوم و فنون کی تکمیل فرمائی۔ حضرت سراج الہند سے سند حدیث حاصل کی اور شاہ غلام علی نقشبندی سے تکمیل باطنی کر کے خلافت حاصل کی اس سے پہلے رامپور میں حضرت شاہ درگاہی خلیفہ شیخ جمال اللہ سے تعلیم لی تھی پھر حضرت شاہ غلام علی نقشبندی اپنے مرشد کے حکم سے شہر بھوپال ۱۲۳۳ھ تشریف لا کر اپنا مرکز اصلاح و ہدایت بنایا۔ ولی اللہی دعوت کے اصول پر ارکان ریاست سے بے تعلق رہ کر عوام سے ربط و ضبط پیدا کیا خواص علماء

اور طالبان معرفت کی رجوعات حضرت کی طرف بے حد ہوئی میاں فوجدار محمد خاں اور میاں معز محمد خاں کے ہاتھ پر بیعت ہوئے جنھوں نے خانقاہ مجددیہ تعمیر کرائی۔ جہاں مقامی و بیرونی تشنگان معرفت حاضر ہو کر اپنی اصلاح کرتے۔ چنانچہ شاہ ابوسعید مجددی کی ہجرت ۱۲۹۶ھ کے بعد مقبولیت کے دروازے اور کھل گئے۔ ہندو سندھ بلخ و بخارا تک کے لوگ آکر حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ یہ خطہ جو اقتدار کے شور و شر اور فنون کا آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ حضرت صاحب کی توجہات سے تھوڑے ہی عرصہ میں ایمان و عرفان کی بجلی گاہ بن گیا۔ حضرت صاحب کی شان استغفار و بے نیازی نے عوام کے ساتھ ارکان ریاست کے دلوں کو فتح کر لیا۔ آخر میں جاذبہ الہی نے ان کو اپنی طرف کھینچا زیارت حرمین شریفین کا مبارک عزم لے کر عازم سفر ہوئے اور یہی سفر سفر آخرت ثابت ہوا۔ جب ان کا جہاز یمن کی بندرگاہ لیث کے قریب پہنچا تو ۱۲۹۹ھ میں جہاز ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں ان کا مزار بنا حضرت صاحب کے صاحبزادے شاہ خطیب احمد جو اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے۔ بعد فراغت حج خانقاہ مجددیہ بھوپال رونق افروز ہو کر ارشاد و ہدایت میں لگ گئے اور اس سرچشمہ ہدایت سے روحانی فیض کا دریا جاری رہا۔ آخر میں اس فرشتہ صورت و بزرگ سیرت درویش نے ۱۳۶۶ھ میں پیغام اجل کو لبیک کہا اور اپنے خلف و خلیفہ حضرت شاہ ابوالاحمد مجددی کو یادگار چھوڑا۔ حضرت شاہ ابوالاحمد جو عالم و فاضل اور معرفت و روحانیت میں کامل بزرگ ہستی تھی جنھوں نے نہ صرف خانقاہ کو معمور و آباد رکھا۔ بلکہ اس کی رونق میں چار چاند لگائے۔ وہ حضرت صاحب ایک جدی بزرگ اور صاحب با اثر شخصیت تھیں۔ نواب صدیق الحسن خاں ہمیشہ ان کی چشمک رہتی تھی مگر ہمیشہ حضرت صاحب ہی کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ حضرت صاحب اپنے بزرگوں کی شان استغفار کے ساتھ اپنے فیوض کو عام فرماتے ہوئے ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا۔

اسی خاندان کی آخری یادگار شاہ محمد یعقوب مجددی ہوئے جن کی ذات

گرامی سے خانقاہ کو مزید رونق حاصل ہوئی۔ اور اصلاح و ہدایت کا چشمہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ وہ شانِ جمالی کی حامل بزرگ ہستی ایک عرصہ تک ہمارے سر پر سایہ فگن رہ کر اور اپنے فیوض و برکات کو پھیلاتے ہوئے ۱۹۷۱ء اپنے ہزاروں معتقدوں کو داغ مفارقت دے کر عالمِ آخرت کو سدھارے اس طرح سر زمین بھوپال مجددی فیوض و برکات کے ساتھ دلی الہی دعوت و ارشاد سے دو صدی تک مستفید ہوتی رہی۔

منشی جمال الدین - مدارالمہام بھوپال

جیسا کہ لکھا جا چکا ریاست بھوپال آغاز کار ہی سے دلی الہی دعوت سے جڑ چکی تھی۔ حضرت مفتی الہی بخش بھوپال سے جب دلی الہی دعوت کے ایک مرکز بنجیب آباد کو خیر باد کہا اور بھوپال کو اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی تو گویا وہ مرکز وہاں سے اٹھ کر بھوپال آ گیا۔ لیکن پنڈارہ گردی، مرہٹہ گردی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاہدات کے ذریعہ ریاستوں کی جکڑ بندی نے صورتِ حال کو بدل دیا۔ رسولِ عالم کمپنی کی سامراجی پالیسی نے ریاست کو پابندیوں کی زنجیروں میں باندھ دیا۔ امیر الدولہ بانی ریاست ٹونک جیسے بلند حوصلہ و شیر دل مجاہد کو ایک محدود کٹھرے میں بند کر دیا جس کی وجہ سے امیر سید شہید کو ان کی رفاقت سے الگ ہونا پڑا۔ غالباً ان ہی وجوہ سے مفتی الہی بخش نے بھی بھوپال کو الوداع کہا پھر ریاست جب نوابوں کے دور کے بعد بیگم اتی عہد کی دہلیز تک پہنچی تو وہ اپنے رقبہ کے اعتبار سے مختصر اور تنگ اور نظم و نسق کے اعتبار سے کمزور ہو چکی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم پہلی رئیسہ ہیں جنہوں نے ریاست کو قواعد و ضوابط کی ایک کڑی میں پرویا لیکن اسی کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حکومتی امور میں نظم و انتظام اور ملکی انتظامات میں قاعدوں اور ضابطوں کی نفاذ پذیری ریاست کی سرسبزی اور خوشحالی اور

اندرونی ریاست دینی و تعلیمی ترقیات کا سہرا حضرت مدارالمہام کے سر ہے۔
 منشی جمال الدین صاحب مدارالمہام شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے
 صحبت یافتہ اور مولانا مملوک علی اور سراج الہند کے دوسرے شاگردوں سے
 فیض یاب ہوئے تھے۔ مدارالمہام نے دہلی کے قریب موضع کوتانہ میں ۱۲۶۱ھ میں
 ایک خوش حال گھرانہ میں آنکھیں کھولیں لیکن والد ماجد کے انتقال کی وجہ سے
 اپنے والد کے شناسا کے بھائی کے یہاں دہلی میں آکر مقیم ہو گئے دہلی کے زوال پذیر
 معاشرہ کے گرداب میں پھنس کر لہو و لعب میں لگ گئے لیکن شاہ صاحب کے
 وعظ میں پابندی سے شریک ہوتے رہے جب ان کے والد کے دوست کا سہارا
 نہ رہا تو غربت و پریشانی حالی کا شکار ہوئے۔ ایک ایک ساتھی نے منہ موڑ لیا اور
 ان کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت شاہ عبدالعزیز نے دست گیری و رہنمائی فرمائی اور
 اس گندہ ماحول سے نکال کر پاکیزہ تعلیمی فضا میں پہنچا دیا جس سے ان کی زندگی کی
 کایا پلٹ ہو گئی اور ان کے جوہر فطرت سے جو ان کی طبیعت میں پنہاں تھا۔ نیکی
 و تقویٰ شعاری کی راہ پر لگا دیا۔ لیکن دہلی میں رہ کر کیا کرتے اس صورت حال
 نے دعوت سفر دی۔ اولاً اندرون پہنچ کر ریزنڈنسی کی طوعاً و کرہاً ملازمت کی جو
 اس نے آئی ان کے پاس مولانا سلام اللہ شاگرد شاہ رفیع الدین کے نام سے
 سفارشی خط تھا جو بھوپال میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے اس کو لے کر بھوپال پہنچے۔
 اولاً بیگم قدسیہ کے یہاں پھر سکندر جہاں بیگم کی خدمت میں درخواست۔ مولوی
 سلام اللہ صاحب کے اس سفارشی جملہ کے ساتھ تھی کہ یہ (مدارالمہام) ایسی تلوار
 ہیں جن کی بھوپال سے لندن تک کوئی کاٹ نہ کر سکے گا۔ تیر نشانہ پر بیٹھا۔
 ریاست میں معمولی ملازمت سے لے کر اعلیٰ عہدہ مدارالمہامی تک ۱۲۶۵ھ میں
 پہنچ گئے ان کی نیکی و پرہیزگاری، ربیبہ کے ساتھ وفاداری، غیر معمولی دلیری
 و دلاوری، سخاوت و فیاضی اور اعلیٰ درجہ کی صلاحیت انتظامی نے ایک
 پسماندہ و غیر منتظم ریاست کو ترقی یافتہ حکومت میں تبدیل کر دیا۔

ولی اللہی دعوت کے پہلے مدبر و منتظم

ہمارے نزدیک مدارالمہام وہ پہلے مدبر و منتظم عالم تھے جنہوں نے ریاست بھوپال کو ولی اللہی دعوت ارشاد کا باقاعدہ مرکز بنایا ولی اللہی دعوت کا پہلا اصول حکمت قرآنی کا عوام سے تعارف و روشناسی ہے۔ حجتہ الاسلام شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ فتح الرحمن کے نام سے کیا اور ان کے سچے جانشینوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے اردو ترجمے فرمائے اور عام مسلمانوں میں فہم قرآنی کا دروازہ کھولا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے فتح العزیز لکھی اور ہفتہ میں دو دن قرآنی تفسیر کا سلسلہ عوام کے لیے جاری فرمایا۔ شاہ صاحبؒ کی تفسیر کی مقبولیت نے دعوت ولی اللہی کو پورے ملک میں غیر شعوری طور پر پھیلا دیا چنانچہ مدارالمہام صاحب نے بھی سب سے پہلے ترجمہ قرآن کا سلسلہ عوام میں شروع فرمایا اور خواص خصوصاً ارکان ریاست میں بہ نفس نفیس قرآنی تعلیم جاری کی۔

جس طرح شیخ الاسلام مولانا عبدالحیؒ والد ماجد شاہ عبدالقیومؒ محدث بھوپال پر لغات القرآن لکھ کر قرآن کے مشکل الفاظ کو یاد کرنے کے لیے آسان بنا دیا تھا اسی طرح مدارالمہام صاحب نے بھی اس جیسی لغات قرآنی "الکوکب الدرّی" کے نام سے تصنیف فرمائی۔ خدا کی وہ کتاب جو انسانی زندگی کا ایک دستور العمل ہے اس کو تلاوت کتاب کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا اور ایک بند کتاب سمجھی جاتی تھی۔ الکوکب الدرّی کو ایک کنجی بنا کر عوام کے ہاتھ میں دیدی۔ اور ریاست میں قرآن فہمی کا مذاق پیدا کیا۔

مدارالمہام صاحبؒ کا عظیم کارنامہ

بھوپال بلکہ کل ہندوستان کے لیے مدارالمہامؒ کا یہ قابل فخر تاریخی کارنامہ یادگار زمانہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ

فتح الرحمن اور شاہ عبدالقادرؒ کی موضح القرآن اردو ترجمہ تفسیری نوٹ کے ساتھ طبع کرایا۔

چونکہ روسا بھوپال سرحد پٹان تھے اور جو خاندان ان کے ساتھ آئے تھے ان کی اکثریت بھی پٹانوں اور افغانوں پر مشتمل تھی اس لیے قرآن حکیم کا پشتو زبان میں ترجمہ کرایا اس سے بڑھ کر ان کا ایک خصوصی کارنامہ یہ ہے کہ جب وہ حج کے لیے گئے دیار مقدس پہنچے جہاں ترکی خلافت کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا تو ترکوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور صدیوں سے خادم حرمین شریفین ہونے کے باوجود ان کو حکمت قرآنی سے نا آشنا پایا تو ایک بہت بڑے ترکی عالم احمد عثمانیؒ سے نواب سکندر جہاں بیگم کو توجہ دلا کر قرآن کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا اور دوبارہ دار الخلافہ قسطنطنیہ تک دعوت ولی اللہی کو پہنچانے کے لیے شاہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ فتح الرحمن کو مولانا ضمیر الدین حیدر آبادی سے ترکی زبان میں منتقل کرایا اور ان تراجم کو پورے عالم اسلام میں ہدیۃ بھیجا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کی معرکتہ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو پہلی مرتبہ طبع کرا کر تمام عالم اسلام میں تحفۃ پیش کرنے کا شرف اسی بزرگوار شخصیت مدارالمہام کو حاصل ہے۔ ایسے ہی مخدوم علی مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمن کی طباعت کا فخر بھی ان کو حاصل ہے۔ اس لیے ہم نے مدارالمہام صاحبؒ کا تعارف ولی اللہی دعوت سے ایک عظیم رکن کی حیثیت سے کرایا ہے البتہ جب مدارالمہام صاحبؒ یمن اور حجاز پہنچے اور یمن کے علمی خاندان کے فرد قاضی زین العابدین کو اور بعد میں شیخ حسین عربؒ محدث بھوپال کو لے کر آئے تو اس دعوت کے ساتھ نجدی دعوت امام محمد ابن عبد الوہابؒ اور امام شوکانیؒ سے قریب ہو کر سلفی مسلک پر عمل پیرا ہوئے۔ یہ امر مخفی نہ رہے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب ”تقویۃ الایمان“ اور شیخ عبد الوہاب نجدی کی ”کتاب التوحید“ میں بنیادی امور کے اندر موافقت اور مشارکت پائی جاتی ہے لیکن شاہ شہیدؒ کا نقطہ نظر ان سے مختلف ہے وہ اپنے جدا جدا شاہ ولی اللہؒ کے

پیر و کار ہیں حادثہ بالاکوٹ ۱۲۳۰ھ کے بعد ولی اللہی جماعت دو طبقوں میں بٹ گئی (۱) مجاہدین سرحد میں مولانا ولایت علی صادق پوری نے جن کے معتقدین کی اکثریت بہار اور بنگال میں تھی از سر نو بیعت جہاد لے کر دعوت کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ جماعت صادق پوری کہلاتی ہے۔ امیر شہید کی شہادت کے بعد یہ جماعت ان کے دوبارہ ظہور کا عقیدہ رکھتی تھی۔ مولانا ندیر حسین اور نواب صدیق الحسن خاں بھی اسی پارٹی سے تھے۔ دوسری دہلوی جماعت شاہ محمد اسحاق کو اپنا امام مانتی تھی۔ بہر حال مدارالمہام کا اعتماد دونوں جماعتوں پر یکساں تھا۔

ولی اللہی دعوت کے سلسلہ میں مدارالمہام کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ولی اللہی اصول پر بھوپال میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم فرمایا اس سے پہلے یہاں کے علماء و فضلاء مسجدوں اور اپنے گھروں میں تعلیم دیتے تھے جس طرح دہلی میں شاہ صاحب کے والد بزرگوار نے مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا جس کی مقبولیت کی بنا پر محمد شاہ بادشاہ نے ایک مستقل عمارت دارالبقا کے نام سے جامع مسجد کے جنوب میں بنوائی تھی جس کے اندر شاہ صاحب کے خاندان کے لوگ شاہ اسحاق صاحب درس دیتے رہے پھر حضرت مولانا مملوک علی کے شاگردوں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ہاتھوں دوبارہ دیوبند میں اسی مدرسہ کا اجیار ہوا۔ اس سے پہلے بھوپال میں مدرسہ جمالیہ مدارالمہام نے قائم کیا تھا جو بعد میں نواب صدیق الحسن خاں کے مدرسہ صدیقیہ میں ضم ہو گیا جس کی آخری یادگار بڑے باغ کے شمال کی جانب کا دروازہ اپنے بانیوں کی مٹیہ خوانی کے لیے اب بھی کھڑا ہوا ہے۔ اس مدرسہ کے اندر دو سو بیرونی طلبہ درس پاتے تھے جن کے وظائف اس دور میں پانچ ہزار پانچ سو روپیہ تھے اور ماہ رمضان میں افطار و سحری وغیرہ کا باقاعدہ انتظام تھا۔

(ماثر صدیقی ص ۱۱۱)

اس دعوتی و علمی تبلیغی خدمت کے ساتھ مدارالمہام صاحب نے باہر کے عالم

کامل فضلاء کو دعوت دے کر بھوپال بلایا۔ یمن کے علماء حدیث کو خود لے کر آئے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے آخری شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی صاحب منتهی الکلام اور حضرت شاہ صاحبؒ کے نواسے اور شاہ اسحاقؒ کے داماد حضرت مولانا شاہ عبدالقیومؒ محدث بھوپال وغیرہ کی آمد سے ریاست ان کی بدولت مشرف ہوئی۔ حضرت مدارالمہام صاحب دینی خدمات کو انجام دیتے ہوئے اور راعی اور رعایا میں یکساں مقبولیت حاصل کر کے ۱۲۹۹ھ میں انتقال فرما کر پوری ریاست کو سوگوار بنا کر چلے گئے۔

ملک المناظرین مولانا حیدر علی فیض آبادی

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے آخری شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی سکندر جہاں بیگم کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے اور ان کی خواہش پر تفسیر فتح العزیز کی تکمیل کا آغاز بھوپال میں کیا۔ چارپانچ پاروں کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ حیدر آباد کی دعوت پر یہاں سے تشریف لے گئے مولانا حیدر علی کے پردادا شیخ عبدالقادر دہلوی جو ایک شیخ و فاضل تھے دہلی چھوڑ کر فیض آباد پہنچے ان کے صاحبزادے شیخ ذاکر اور ان کے پوتے شیخ محمد حسن یہ سب کے سب راہ معرفت کے پیش رو اور ان کا ملین طریقت میں تھے۔ مولانا حیدر علیؒ شیخ محمد حسن کے صاحبزادے ہیں ابتدائی تعلیم وطن میں شیعہ علماء سے حاصل کر کے مرکز العلوم دہلی پہنچے اور سراج الہند سے سند حاصل کی۔ شاہ رفیع الدین شاہ دہلوی اور مولانا رشید الدین سے خصوصی استفادہ کیا۔ شیخ رشید الدین دہلوی کا رنگ تحریر سراج الہند کا نمونہ اور تردید شیعیت میں اپنے استاذ کی نظیر تھے۔ وہی رنگ مولانا حیدر علیؒ کے حصے میں آیا۔ مولانا حیدر علیؒ نے دہلی کے بعد رامپور و لکھنؤ کے متعدد علماء سے بھی کسب فیض کیا اور نوجوانی ہی میں اپنی تصنیف و تالیف کی بنا پر شہرت حاصل کر لی ولی اللہی حکمت کے شارح شاہ عبدالعزیزؒ نے بڑے

شاہ صاحب کے قرآنی حکمت کے اصول جو فتح الرحمن، الفوز الکبیر، خیر کثیر وغیرہ کتابوں میں خصوصی اصطلاحات کے پردہ میں چھپا دئے تھے جو عوام تو عوام خواص کی دست رس سے باہر تھے۔ سراج الہند نے فتح العزیز میں اول و آخر پاروں کی قرآنی تفسیر میں ان کو کھول دیا۔

دلی الہی دعوت کا جب آغاز ہوا اس وقت مغلیہ سلطنت کا چراغ باد مخالفت کے جھونکوں سے ٹٹھا رہا تھا جس کے اندر اندرونی شیعہ و سنی کی آویزش کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے بڑے شاہ صاحب نے ایک طرف ازالۃ الخفاء اور سراج الہند نے تحفہ اثنا عشریہ تصنیف کر کے مخالفوں کو لا جواب کر دیا تھا لیکن فتنہ کا یہ شعلہ رہ رہ کر بھڑکتا تھا اس لیے شیخ رشید الدین صاحب اور ان کے خصوصی شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس سلسلہ میں ایک بڑا کتب خانہ ملت کے کاشانہ کو باد سموم سے بچانے کے لیے تیار کیا اور دوسری طرف فتح العزیز کی تکمیل کی۔ مولانا حیدر علی نے اپنی تصنیف کا رخ پھیر دیا۔ سکندر جہاں بیگم فتح العزیز کے اسلوب بیان، طریقہ تحقیق اور حسن استدلال کی دل سے عاشق تھیں اس لیے ان کی دلی تمنا تھی کہ اگر تفسیر اس رنگ میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی ان کی نظر مولانا حیدر علی پر پڑی اور مولانا کو ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں پانچ سو روپیہ کا وظیفہ مقرر کر کے بھوپال بلایا۔ علماء کی ایک جماعت کو ان کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ مولانا موصوف نے بھوپال کی سرزمین پر اس عظیم الشان کام کا آغاز فرمایا اور بالمحسنات تک چار ضخیم جلدیں کر دیں۔ ابھی یہ عظیم کارنامہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچا تھا کہ حیدر آباد کی طلبی پر بھوپال کو الوداع کہنا پڑا لیکن اس عظیم کام کو جس کا بھوپال میں آغاز کیا تھا حیدر آباد و رامپور و بنارس میں انجام تک پہنچا کر دم لیا۔ افسوس کہ وہ تفسیر شائع نہ ہو سکی۔ نواب محمد علی خاں والی ٹونک کے کتب خانہ بنارس سے ٹونک منتقل ہو گئی۔ بھوپال کے چار تفسیری پارے ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں دئے گئے بہر حال مولانا حیدر علی حیدر آباد سے رامپور پہنچے اور

۱۲۹۹ء میں وہیں رحلت فرمائی مولانا کی تصانیف بے شمار ہیں جن میں زیادہ تر شیعیت کی تردید میں ہیں ان میں "التنبیہ لاہل النحوص لاعتراضہم علی حدیث النحوض" جس نے منہجی الکلام کے نام سے شہرت حاصل کی۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقیوم صاحب محدث بھوپال

ریاست بھوپال کی مذہبی و دینی ترقی میں ولی اللہی سلسلہ کے علماء و فضلاء کا آغاز ریاست سے ہاتھ رہا لیکن خود اس خاندان عالی کی کسی شخصیت کی تشریف آوری کا شرف اس حصہ کو نہ حاصل ہو سکا تھا ریاست کی خوش بختی و خوش نصیبی سے شاہ عبدالقیوم صاحب کی تشریف آوری سے یہ شرف بھی حاصل ہو گیا شاہ عبدالقیوم حضرت سراج الہند کے نواسے اور حضرت شاہ اسحق کے داماد اور شیخ الاسلام مولانا عبدالحی کے نور نظر تھے ان کے جد امجد مولانا شاہ نور اللہ حجتہ الاسلام شاہ ولی اللہی کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے جو حکمت ولی اللہی کے زبردست عالم اور خود سراج الہند کے استاد بھی تھے درسیات میں ان سے بڑھ کر کوئی ماہر اور حنفی فقہ میں ان سے بلند پایہ کوئی فقیہ نہ تھا۔

(ابجد العلوم ص ۹۱ ج ۱)

مولانا شاہ عبدالقیوم ۱۲۳۱ء میں پیدا ہوئے سراج الہند نے غلام نقی تاربخی نام رکھا بچپن میں اپنے والد سے ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی پھر سب سے زیادہ فیض ظاہری و باطنی اپنے خسر شاہ محمد اسحق اور ان کے بھائی شاہ یعقوب سے حاصل کیا اور خرقہ خلافت پایا بچپن میں سید احمد شہید سے تبرکاً بیعت کی تھی اور ان کی صحبت مبارک ابتداء سے انتہا تک رہی سید احمد شہید کے دورہ اصلاح اور سفر حج سے لے کر معرکہ بالاکوٹ تک رفاقت رہی اور ہمیشہ ان پر نگاہ شفقت فرماتے رہے سانحہ بالاکوٹ کے بعد پہلے ٹونک پھر حرمین شریفین چلے گئے واپسی پر سکندر جہاں بیگم نے مدارالمہام کے مشورہ پر قیام بھوپال کی دعوت دی اور کچھ

دونوں تک منصب افتار کو زینت دی پھر آزادانہ درس حدیث کے خاندانی سلسلہ کو
 شہر بھوپال میں جاری فرمایا چنانچہ تشنگان حدیث سند عالی حاصل کرنے کے لیے ہند
 بیرون ہند آکر اس چشمہ صافی کو سیرا ہوتے تھے۔ حسب روایات خاندانی درس قرآن مسجد
 حقیقت خاں اور مسجد امراؤ دولہا میں ہفتہ میں دو بار دیتے تھے ہزار ہا مخلوق خدا
 ان کے ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوتی حضرت اسحق کی ہجرت
 کے بعد ان کی ذات مزج خواص و عوام بن گئی جس نے بھوپال کو مرکز حدیث بنادیا
 ریاستی ملازمت عہدہ افتار سے سبکدوشی کا لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار عید کی نماز کا
 نظارہ کرنے کے لیے انگریز رزینڈنٹ نے بیگم صاحبہ سے خواہش کا اظہار کیا
 چنانچہ اس کے لیے سرکاری انتظام عمل میں آیا شاہ عبدالقیوم صاحب نماز عید
 کے لیے عید گاہ پہنچے جب وقت مقررہ آپہنچا تو حضرت نے صف بندی کا اعلان
 کیا اس عرصہ میں بیگم صاحبہ کی طرف سے پیغام پہنچا کہ ابھی رزینڈنٹ بہادر
 نہیں پہنچے ہیں اس لیے کچھ دیر توقف کیا جائے مولانا نے فوراً کھڑے ہو کر ارشاد
 فرمایا کہ جس کو سکندر جہاں بیگم کی نماز پڑھنا ہو وہ انتظار کرے اور جس کو خدا کی
 نماز پڑھنا ہو وہ شریک نماز ہو جائے اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دی سرکاری
 حلقوں میں سناٹا چھا گیا لیکن ان کو کون روک سکتا تھا نماز ہو گئی لیکن مولانا کو
 عہدہ افتار سے سبکدوش کر دیا گیا مگر سابقہ احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہ آنے
 دیا گیا ظاہر ہے کہ مولانا کے اس مجاہدانہ طرز عمل نے انگریز بہادر کے دل میں
 اس بات کو بٹھا دیا گیا ہو گا کہ رسی کے جل جانے کے بعد ابھی تک بل باقی ہے۔
 ہو سکتا ہے کہ عید گاہ پہنچنے میں تاخیر کسی آزمائش کی وجہ سے کی گئی ہو بہر حال
 رزینڈنٹ کی خفیہ ہدایت پر مولانا کو اس عہدہ سے الگ کر دیا گیا لیکن جس طرح
 امام مالک کو حکومت کی طرف سے ہتھکڑیاں ان کے لیے مزید عزت کا باعث بنیں
 اسی طرح مولانا کے اس عمل سے عوام کے دلوں میں مزید عظمت کا نقش قائم ہو گیا۔
 ملازمتی زنجیر ٹوٹ جانے کے بعد مولانا کا دریا ئے فیض اور جوش میں آگیا اور شبانہ

روز علم حدیث کا فیضان اور زیادہ ہو گیا پھر ۱۲۹۹ھ میں نواب محمد علی والی ٹونک کی دعوت پر بنارس پہنچے جہاں وہ نظر بند تھے اور ان کو سند حدیث عطا فرما کر لکھنؤ سے ہوتے ہوئے وطن مالوف بڑھانہ پہنچے وہیں گھوڑے سے گر کر انتقال فرمایا اور ان کا مولد ہی مدفن بنا۔

مولانا محمد یوسف صدر مجلس علمائے بھوپال

مولانا محمد یوسف شاہ عبد القیوم کے صاحبزادے ہیں اپنے پدر بزرگوار اور قاضی محمد ایوب صاحب سے تحصیل علم فرمائی ابھی درجہ تکمیل تک نہ پہنچنے پائے تھے کہ والد ماجد کا سایہ رحمت سر سے اٹھ گیا اس لیے مرکز العلوم دہلی پہنچ کر محبوب علی دہلوی مولانا مملوک علی مفتی صدر الدین دہلوی سے معقول و منقول کی اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا سفر حرمین شریفین میں شاہ محمد یعقوب برادر شاہ محمد اسحاق دہلوی سے خلافت حاصل کر کے ریاست کو ظاہری و باطنی فیوض پھیلانے میں سرگرم ہو گئے۔

مجلس علمائے بھوپال کے وہ پہلے صدر ہیں حنفی و سلفی مذہب کے تمام علماء ان کی طرف رجوع کرتے تھے آخر ۱۳۰۷ھ میں وفات پا کر خطہ صالحین بھوپال میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد اسماعیل

حضرت شاہ عبد القیوم کے دوسرے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم کے عٹے مولانا محمد اسماعیل ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے عم محترم مولانا محمد یوسف سے تکمیل علوم فرمائی اور ان کے داماد ہوئے اور اپنے خاندانی طریقہ کے مطابق تعلیمی سلسلہ کو ریاست میں جاری فرمایا لیکن ابھی فصل جوانی کی بہار بھی پوری طرح نہ دیکھنے پائے تھے کہ دیار حبیب مکہ معظمہ میں ۱۳۳۰ھ میں داعی اجل کو

بیک کہا اور ایک صاحب زراہ حاجی احمد صاحب کو یادگار چھوڑا جو اب تک ۱۴۰۴ء
 قید حیات ہیں غرض مولانا شاہ عبدالقیوم کا خاندان بھوپال میں ابھی تک
 موجود ہے آپ کے معنوی فرزندوں یعنی شاگردوں کا وسیع سلسلہ ہے آپ کے
 عزیز قریب قاضی مفتی محمد ایوب پھلتی ہوئے جن کا تذکرہ آ رہا ہے۔

مولانا ظہر علی منظر صادق پوری

دعوت ولی الہی کی عملی تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ سراج الہند نے
 ولی الہی اصول پر ایک جماعت یا پارٹی کی تشکیل دی اور امیر سید احمد شہید کو
 دعوت جہاد کا امیر بنا کر اولاً تو دو آبہ (شمالی یوپی) پھر بہار بنگال کے دعوتی
 و اصلاحی دورے کے لیے بھیجا سفر حج سے واپسی کے بعد سید امیر شہید نے
 جہاد کا مرکز آزاد سرحد (استھانہ اور اسمت) کو بنایا معرکہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء
 میں امیر شہید کی شہادت پر اس تحریک کا پہلا دور ختم ہوا لیکن دعوت جہاد
 کا سلسلہ امیر شہید کے ارباب عزیمت مریدوں نے نہ صرف قائم و برقرار رکھا
 بلکہ کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اس کو پھیلا دیا۔

مولانا ولایت علی عظیم آباد کے محلہ صادق پور کے مجاہدین کے سرخیل اور
 سربراہ ہیں جو سید احمد شہید کے مخلص مریدین میں سے تھے رئیسانہ ماحول میں
 پرورش پائی تھی لیکن سید شہید کی امارت کے بعد فقیری اختیار کی انہوں نے
 یاغستان (آزاد سرحد) کو مرکز بنا کر جہاد کے سلسلے کو ان کے بھائی مولانا عتیق علی
 شاہ احمد حسین اور ان کے بعد مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی اس دعوت کے ارکان
 تھے فرنگی سامراج کی دہشت ناک کامیابی ۱۹۴۷ء کے بعد ان سرحدی مجاہدین
 اور ان کے مخلص معاونین پر رسوائے عالم مقدمات بغاوت قائم کر کے ہزاروں
 کو دار پر لٹکایا اور ہزاروں کو کالے پانی بھیج کر دوا می قید و بند میں مبتلا کیا ان
 بزرگوں کے جاں گسل امتحانات اور صبر و استقامت کی ایک طویل داستان ہے

جو تاریخ آزادی ہند کا جھومر ہے لیکن ان عظیم قربانیوں اور راہ حق میں جاں نثاریوں کو ہماری تاریخ آزادی کے صفحات میں نہیں بھی جگہ نہ مل سکی بہر حال اس روشن اور رنگین داستان کا عنوان علماء صادق پور ہے جن کی مجاہدانہ کارروائیوں سے حکومت برطانیہ اس قدر مغلوب الغضب اور غصہ سے بے قابو ہوئی کہ پورا محلہ صادق پور برباد و مسمار کر دیا بلکہ مہدی سوڈانی کے مزار کی طرح ان کے خاندان کی قبروں کو بھی کھدوا کر پھینک دیا ریاست بھوپال اس خاندان کے ایک فرد مولانا اظہر علی مظہر کی قیام گاہ بنی ایک عرصہ تک انھوں نے اس خطہ کو اپنے فیوض و برکات سے منور فرمایا۔

مولانا فرحت علی جنھیں فرحت حسین بھی کہا جاتا تھا مولانا ولایت علی رح کے سب سے چھوٹے بھائی تھے اور چھوٹے حضرت کہلاتے تھے بڑے حضرت (مولانا ولایت علی) حب کبھی مرکز صادق پور سے باہر جاتے تو ان کو اپنا قائم مقام بناتے پھر وہ سرحد آزاد چلے گئے توجاعت کی قیادت مستقلاً ان کے سپرد کر دی گئی۔ بڑے زاہد و عابد اور خطیب تھے۔ فنون حرب میں بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ اعلیٰ گھوڑ سوار، عمدہ کپتان جی، اڑتی چڑیا کو بھی مار گراتے، زبردست پیراک۔ الغرض ظاہری و باطنی اوصاف کے جلیل و جمیل پیکر تھے۔ سات برس تک جماعت کی قیادت کی اڑتالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مولانا عبد الرحیم اسیرانڈمان بھی انھیں کے صاحبزادے تھے۔

مولانا کے دوسرے صاحبزادے مولانا اظہر علی ۱۲۱۶ء میں اپنے وطن عظیم آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد بنارس و لکھنؤ میں مزید تعلیم حاصل کی سند حدیث کے لیے حضرت شاہ محمد اسحق کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے صحاح ستہ کا درس لے کر اجازت حاصل کی اور شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو کر خلافت پائی بعد فراغت تحریک جہاد میں حصہ لیا پھر بھوپال تشریف لا کر سلک ملازمت میں منسلک ہو کر منصبی خدمات سے ساتھ اصلاح و ارشاد کے ذریعہ بھٹکے ہوئے لوگوں

کو سیدھے راستے پر لگا رہے رسوم و بدعات کی بجگنی فرمائی قدسیہ بیگم کے زمانے میں ان کی آمد ہوئی نواب جہانگیر محمد خاں نے ان کی قدر شناسی فرمائی اور ان کو اپنے عہد حکومت میں غیرت گنج محل پور کڑھی کا عامل مقرر کیا ان کے حسن انتظام سے راغی و رعایا دونوں خوش رہے پیر سید معصوم قادی کی ہمشیرہ نجف خاتون سے نکاح ہوا پھر ۱۲۵۷ء کے بعد ریاست کی ملازمت سے سبکدوش کر دئے گئے کیونکہ وہ حضرت سید شہیدؒ کے خلیفہ و حجاز تھے اس لیے طریقہ محمدیہ پر بیعت لیتے تھے ریاست کو روائی پٹھاری میں حلقہ ارادت وسیع ہوا پھر جناب غلام قادر (برادر منشی حسین خان) رئیس ساگر کے ہمراہ حج فرمایا اور مریدین کے اصرار پر بھوپال واپس ہو کر اصلاح و ہدایت میں لگ گئے نواب شاہجہاں بیگم نے ان کا منصب مقرر فرمایا آخر وہ مرد مجاہد جس کو معرکہ بالاکوٹ میں شہدار کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا اور باغ سید سلطان میں چھولہ روڑ میں دفن ہوئے

مولوی یعقوب علی خاں بانس بریلی

مولوی یعقوب علی خاں بانس بریلی کے رئیسوں میں سے تھے اپنے مقامی ارباب علم و فضل سے تحصیل علمی کر کے شاہ محمد اسحق محدث دہلوی سے سند حدیث حاصل کی پھر اپنے وطن واپس ہو کر تعلیمی سلسلہ کو جاری کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ان کی تعلیمی انتظامی صلاحیت کی شہرت کو سن کر ۱۲۳۷ء میں بھوپال مدعو کیا اور محکمہ عدالت کا مشہر مقرر فرمایا اس وقت جملہ عدالتی فیصلے شرع شریف کے احکام کے مطابق ہوتے تھے مولوی صاحب کی نیکی و پرہیزگاری اور تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی سودی ڈگری پر دستخط نہیں کیے مشہور ادیب و شاعر امجد علی اشہری کو ایسے مقدمات سپرد کیے جاتے تھے ۱۲۳۷ء میں صدر المہام ریاست ہوئے آخر میں ۱۲۵۵ء میں کرنل وارڈ کے زمانے میں ان کو صدر الصدور بنانا چاہا لیکن مستعفی ہو کر چلے گئے مولوی صاحب اپنے استاد شاہ اسحق کے تقویٰ و طہارت میں نمونہ تھے وطن پہنچ کر وہی تعلیمی مشاغل اختیار فرمائے اور وہیں انتقال فرمایا۔

تحریک شیخ الہند اور بھوپال

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن محدث دارالعلوم دیوبند کی تحریک جہاد دلی الہی تحریک کی آخری کڑی ہے جس کو حضرت شیخ نے برطانوی سامراج کے کامل تسلط اور غلبہ اور پورے ملک پر اقتدار حاصل ہو جانے کی وجہ سے ایسی رازداری سے جاری فرمایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شیخ نے اپنے بزرگوں کی طرح اپنے آپ کو گوشہ گنما می میں رکھا اس لئے کہ شیخ ارباب سیاست سے نہ تھے بلکہ وہ اہل دیانت ہیں سے تھے۔ ارباب سیاست کا طرہ امتیاز کام برائے نام ہے لیکن سچے دیندار حضرات اپنے دامن عمل کو شہرت و نام و آوری کے داغ دھبے سے پاک و صاف رکھتے ہیں ان کا ہر عمل خدا کے واسطے اور ہر کام رضائے الہی کے لئے ہوتا ہے چوں کہ ریاست بھوپال شروع ہی سے دلی الہی دعو کا مرکز بن چکی تھی۔ اس لئے شیخ الہند کی اس دعوت جہاد کا بھی بھوپال سے خاص تعلق رہا۔ منشی جمال الدین مدار المہام کے استاد مولانا ملوک علی تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی صد مدرسین مدرسہ دیوبند کو ریاست میں گراں قدر مشاہیرے پر بلائیں مگر مولانا نے انکار کیا اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۱۲۹۲ء میں مدار المہام کے اصرار پر بھوپال آئے لیکن چند ماہ رہ کر حج کو چلے گئے و تاریخ دارالعلوم ص ۲۲)

البتہ حضرت سید احمد دہلوی جو مولانا یعقوبؒ کے بعد دارالعلوم کے صدر ہوئے وہ عہد شاہ جہانی میں بھوپال آئے نواب صدیق حسن خان کی تحریک جہاد کی ناکامی اور خود نواب صاحب معزولی سے سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اس لئے وہ درس و تدریس کا ہنگامہ برپا کئے رہے۔ پھر دور سلطانی ۱۹۱۹ء میں امام نانوتوی کے شاگرد رشید نواب قاضی محی الدین خاں ریاست کے قاضی بن کر تشریف لائے جو حضرت شیخ الہند کے معتمد و ندیم اور اس تحریک کے پونے رازدار تھے قاضی صاحب ہی کے واسطے سے والیہ بھوپال سلطان جہاں بیگم قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی کی مرید ہوتی تھیں۔ (تذکرۃ الرشید)

پھر ان کے چلے جانے کے بعد مولانا گنگوہی کے چہیتے شاگرد قاضی محمد حسن مراد آبادی سرکار عالیہ کی خواہش پر بھوپال تشریف لائے اور ہتتم مدرسہ وقفیہ وغیرہ ہوئے پھر قاضی یحییٰ صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ریاست ہوئے حضرت الاستاد قاضی محمد حسن صاحب مرحوم کے بعد قاضی سید سلیمان ندوی قاضی القضاہ بھوپال ہو کر آئے اور ختم ریاست تک وہی قاضی رہے یہ ہر دو بزرگ بھی تحریک شیخ الہند کے اہم ارکان تھے (ریشمی رپورٹ)

جب شیخ الہند نے اس تحریک کے معتمد خصوصی مولانا عبید اللہ سندھی کو دہلی بھیج کر نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کرایا تو اس کے مصارف کے لئے دو بار بھوپال سے دو سو روپے ماہانہ امداد مقرر ہوئی۔ شیخ تحریک شیخ الہند صلی اللہ علیہ وسلم پھر شیخ الہند کی اس تحریک سے بھوپال کا رشتہ اس وقت اور مضبوط اور مستحکم ہو گیا جب کہ بھوپال کی بین الاقوامی شخصیت مولانا برکت اللہ بھوپالی نے تحریک سے اشتراک فرمایا جس کی تفصیل باب دوم سوانح میں آرہی ہے۔

تحریک شیخ الہند کا موقف

اس سے پہلے کہ تحریک شیخ الہند کا تعارف اور بھوپال سے اس کے تعلق کو

معرض بیان میں لایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک پر برطانوی سامراج کی قہرمانی سے قصداً جو پردہ ڈال دیا گیا تھا عوام تو کیا خواص کے سامنے تک اس کی تفصیلات نہ لائی گئی تھیں ان کا پردہ اٹھا دیا جائے۔ اور اس سے پہلے کہ اس تحریک کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے اس کے موقف کو واضح کرنا نہایت ضروری ہے جیسا کہ آئندہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس تحریک کا آغاز ۱۸۷۶ء ۱۲۹۹ھ امام نانوتویؒ کی زندگی ہی میں پردہ راز میں کر دیا گیا تھا اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی برطانوی سامراج کی بربریت و سفاکی و پرتشدد خونریزی سے پورا ملک سہما ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ دیوبند کے ایک بزرگ تہجد کے وقت برطانوی حکومت پر بددعا کے لئے اس وقت ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ جب تک گھر کی کھڑکی سے چاروں طرف دیکھ نہ لیتے اور یہ یقین نہ کر لیتے تھے کہ اس اندھیرے میں کوئی موجود تو نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند اپنے عہد افلحاح ہی سے ہندو بیرون ہند طلباء کا گہوارہ بن گیا تھا۔ آزاد سرحد یا غستان، افغانستان بلخ و بخارا تک کے تشنگان علوم و فنون اس چشمہ علم سے سیراب ہونے کے لئے جوق درجوق آنے لگے تھے۔ شیخ کی چشم انتخاب ان طلباء کو اپنی رازداری کے لئے چھانٹ لیتی تھی جن کے اندر سیاسی فہم و فراست اور اس وقت کی سیاست سے مناسبت معلوم ہوتی پھر ان کے اندر روح جہاد بھونکتے اور اپنے مقام پر بعد فراغت دینی درسگاہ قائم کرنے کی دعوت دیتے اور برابر رابطہ قائم رکھتے اور وقتاً فوقتاً ہدایات جاری فرماتے۔ آزاد سرحد کا علاقہ شیخ کی توجہات کا خصوصی مرکز تھا اس لئے کہ بقول حضرت مدنی اس علاقہ کے اندر ابھی تک جوش جہاد کا ولولہ زندہ تھا۔ اس حضرت شیخ نے اس دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ یہ طویل المیعاد منصوبہ بیسویں صدی کے پہلی دہائی تک وسعت پذیر ہوتا رہا حضرت شیخ افغانستان و ایران و ترکی خلافت سے رابطہ قائم کر کے ایک مسلح انقلاب سے اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ شیخ کی ان سیاسی سرگرمیوں کی

نوعیت اسی طرح کی تھی جو مشہور قومی نیتا سبھاش چندر بوس نے ۱۹۰۷ء میں جاپان و جرمنی کی امداد سے ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے اختیار کی تھی۔ چونکہ برطانوی سامراج کی جابرانہ قوت اور فولادی نظام کی بنا پر اندرونی بغاوت کا منصوبہ ملک میں سخت خونریزی و تباہی کا باعث ہوتا جس کے ہولناک نتائج سے ملک گذر چکا تھا اس لئے بیرونی آزادی پسند طاقتوں کے امداد کے بغیر کوئی منصوبہ تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے جس طرح نیتا جی نے ۱۹۰۷ء کی عالمگیر جنگ کے دوران ہندوستان کی سرحد اٹھال کو اپنا مرکز بنا کر آزادی کا منصوبہ تیار کیا تھا اسی طرح جنگ عظیم کے موقع پر حضرت شیخ نے اس جیسا پروگرام بنایا مگر ملک کی بد قسمتی سے دونوں جنگوں میں برطانوی سامراج فتح یاب ہو کر ابھرا اس لئے ہندوستان کو اپنی قسمت کے فیصلے کے لئے مزید امتحانی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ بہر حال شیخ کی یہ تحریک جہاد ولی اللہی تحریک کی آخری کڑی تھی۔ جس کی ضروری تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

ریشمی سازش کی حقیقت

شیخ الہند کی تحریک آزادی کو فرنگی سامراج نے ریشمی سازش کا نام دیا ہے جس نے ہندستان اور ایشیا کے آزاد ملکوں اور ان کی مال و دولت پر منظم سازشوں کے ذریعہ غیر ہندوؤں کو مہذب بنانے کے پردے میں غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور جس تہذیب کو مغرب نے مشرق میں درآمد کیا ہے اس نے انسانیت کی روحانی و اخلاقی اقدار کو ملیا میٹ کر کے پوری دنیا کو بدمعنی اور بے ایمانی کا گہوارہ جنگ و جدل و غل فصل کا ٹھکانا بنا دیا ہے۔ اس مادی تہذیب نے سچائی راست پازری، ایشیائے ہند کی انسانی ہمدردی اور اعتماد باہمی کی ابدی روحانی قدروں کو جڑ سے اکھڑ پھینکا ہے۔

خود غرضی و مفاد پرستی جو اس مادی تمدن کی جڑ بنیاد ہے اس نے انسان کو اس کی عظمت و بلندی کی چوٹیوں سے ڈھکیل کر حیوانیت کی پستیوں میں لاکھڑا کیا ہے۔ فرنگی تہذیب جن مکاریوں عیاریوں اور سازشوں کے ہاتھوں آگے بڑھی وہ تاریخ کا زبردست المیہ ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ جو حکومت خود سازشوں کے بل بوتے پر ہمارے سروں پر مسلط ہوئی ہے وہ ایک پاکباز جماعت کے پیشواۓ روحانی کی تحریک جہاد کو ڈھٹائی سے سازش کا گھناونا نام دے رہی ہے۔

تفو بر تو ایسے چرخ گردان تفو

بہر حال استاد الاستاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ جس کی طرف اس ننگ و جود کو نسبت کرتے ہوئے شرم ہوتی ہے، وہ قطب زمانہ متحرک عالم محدث وقت اور شریعت و طریقت کے پیشوا تھے جن کی پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول میں بسر ہوئی وہ بسم اللہ کے گنبد سے زندگی کے آخری دور کو چھوڑ کر کبھی باہر نہیں آئے۔ وہ قدماء یعنی پرانے زمانے کے علماء ربانی کی آخری نشانی تھی جنہوں نے جلوت و خلوت تنہائی و محفل آرائی میں مخلوق خدا کی تعلیم و تربیت کے سوا اقتدار و شہرت نام و نمود سے کوئی سروکار نہیں رکھا نہ انہوں نے تاریخ یورپ کو ہاتھ لگایا نہ انقلاب فرانس و انگلستان کا مطالعہ کیا نہ سرسید کی طرح لندن کی سیر کی اور فرنگی قوم کو قریب سے دیکھا نہ اپنے دوسرے معصروں مولانا حالی و شبلی کی طرح مغربی علوم و فنون سے شناسائی حاصل کی نہ ارباب سیاست سے تعلق رکھا اور نہ اس مقدس ہستی کا انگریزوں کی پُرفریب پالیسی اور مکارانہ ڈپلومیسی سے کوئی واسطہ رہا اس لئے بقول مولانا نجم میاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس صوفی صافی صلح کل درویش سچے عاشق خدا نے خازن سیاست میں کیوں قدم رکھا جہاں ہر ہر قدم پر اس دشت کا ہر کانٹا اپنی پیاس بجھانے کے لئے

ایک آبلہ پاکی راہ تک رہا تھا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

ایک آبلہ پا وادی پر خوار میں آئے

جس وقت حضرت شیخ نے اس کانٹوں بھرے میدان میں قدم رکھا وہ وحشت و بربریت کا دور تھا جب کہ برطانوی سامراج کے قائم کردہ دارورسن کے تختے دہلی، میرٹھ اور تھانہ بھون کی سڑکوں بازاروں میں لٹکے ہوئے تھے معرکہ ۱۸۵۷ء کی واروگیر دیکر دھکڑ کا ہنگامہ ابھی تازہ تازہ تھا دارالسلطنت دہلی کا خونی دروازہ ہزار ہا معصوم و بے گناہ شہیدوں کا خون پکار پکار کر انگریزوں کی سفاکی و سنگ دلی کی شہادت دے رہا تھا۔ جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں ہزار ہا خاندانوں کی خانماں بربادی اور برطانوی سامراج کی لرزہ خیز ظلم و ستم رانی کے واقعات پر پورا ملک چپ سادھے ہوئے بیٹھا ہوا تھا نامی گرامی ہندوستان کے بہادر سپہوتوں کو موت کے آغوش میں سلا دیا گیا تھا ان حالات کو دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو گئے تھے۔ ملک کی فضا میں ہر حق کا عالم تھا اس وقت برطانوی سامراج سے معرکہ آرائی کا تصور کسی کے حاشیہ خیال تک میں نہ آسکتا تھا لیکن پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خاموش مرد حق اس نازک و خطرناک دور میں انقلاب کے میدان میں کود پڑا۔ اور جہاں ہندوستان کے میدان سیاست کے شہ سواروں کے قدم بھی نہ پہنچ سکے تھے شیخ الہند نے پہلے ہی ان میدانوں کو پامال کیا کامیابی و ناکامی تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے لیکن دل ناتوان کے مقابلے سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ سوالات ارباب سیاست کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتے رہتے ہیں۔

علماء کا سیاست سے کیا واسطہ

ان سوالات سے بڑھ کر ایل اور اہم اور ضروری سوال مزید پیدا ہوتا ہے

کہ علماء جو روحانی پیشوا، اور انسانی اخلاق کے معلم و مربی ہیں ان کو سیاست کے گندہ نالے یا گھناؤنے ماحول میں اترنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ موجودہ دور میں مذہب کو ایک مسئلہ اور پرائیویٹ معاملہ قرار دیدیا گیا ہے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس امر پر روشنی ڈالی جائے کہ مذہب و اخلاق کا سیاست کیا تعلق ہے ان دونوں کا ایک دوسرے سے ربط بھی ہے یا زندگی کے الگ الگ دھارے ہیں جو اپنے اپنے میدانوں میں بہہ رہے ہیں۔

سب سے پہلے اس مسئلہ حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حیات انسانی جو حیات اجتماعی کا دوسرا نام ہے اس کا قافلہ نظم و تنظیم کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا کیوں کہ انسان بقول فلاسفہ مدنی الطبع ہے اس لئے اجتماعی زندگی حقوق و فرائض کی ادائیگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

حقوق و فرائض کا پہچاننا علمی سیاست اور ان حقوق و فرائض کو عملی زندگی میں بروئے کار لانے کا نام عملی سیاست ہے اب ہم افلاطون و ارسطو کے بعد سیاست کے بابائے آدم ابو نصر فارابی دجن کو معلم ثانی کا لقب دیا گیا ہے، کی کتاب آراء المدنیۃ الفاضلہ کا ایک اقتباس اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ حیات انسانی کے لئے نظم و تنظیم ضروری ہے جس کو سیاست کہا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) سیاست فاضلہ (۲) سیاست فاسقہ۔

سیاست فاضلہ اس سیاست کا نام ہے جو قوم و ملک کو نظم و ضبط کی لڑی میں پرو کر الفت و محبت پریم اور پیار کے ساتھ حکومت کو دعوت دے البتہ شہر پسند عناصر کے لئے سزا کا تازیانہ ضروری ہے۔ سیاست فاضلہ انسانوں میں اتحاد، باہمی حقوق شناسی، باہمی تعلقات کی سازگاری کے ذریعہ تشکیل پاتی اور لوگوں میں الفت و رواداری اور باہمی خوش گواری پیدا کرتی ہے اس کے مد مقابل سیاست فاسقہ دنیا پاک سیاست انسانوں

کے نفاق و افتراق ایک دوسرے میں پھوٹ اور شقاق پیدا کر کے باشندگان ملک کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اور کبھی ایک گروہ اور کبھی دوسرے گروہ کو آگے بڑھا کر خود آگے بڑھتی ہے یہی وہ سامراج ہے جس کا پورا مغرب میں ادگا بڑھا اور پھلا پھولا پھر اس کے کڑوے پھلوں نے تمام انسانوں کو تلخ کام بنا دیا۔

اہل مشرق جو ہمیشہ سے مذہب یا دھرم کے شدیدارہے ہیں وہ بڑے زمانے تک اس زہریلی سیاست سے دامن کش رہے مگر مغرب دیوروپ نے اس کو خوب خوب فروغ دیا اور اٹلی کے رسوائے عالم مصنف میلہا ویلی نے سیاست فاسقہ کے جواز کو مثبت انداز میں پیش کیا اس نے اپنی کتاب میں اقتدار پسندانہ سیاست کے لئے اخلاقی قدروں کا انکار کیا سیاست کے لئے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دیکر انسانی ابدی قدروں کو انسانی ٹھہرایا۔ چنانچہ ان قدروں کو اقتدار پسندی نے پاؤں سے لچل دیا گیا برطانوی سامراج جس کی بدترین مثال ہے جس نے اولاً تو یہاں کے باشندوں کو ناخواند و جاہل بنانے کی اسلیم تیار کی پھر جب اس کے مضر اثرات ۱۹۵۷ء کی بغاوت میں محسوس کئے گئے تو اپنی تعلیمی پالیسی بدلی اور ایسی تعلیم جاری کی جس کے اندر فرقہ پرستی باز ہر شامل تھا شروع میں برادران وطن دہندوؤں کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں کو پیچھے ڈھکیلنے کی پالیسی اپنائی پھر جب کچھ عرصہ میں مسلمان تعلیمی میدان میں پس ماندہ بنادیئے گئے اور برادران وطن آگے بڑھ گئے تو اب سامراج نے مسلمانوں کے سروں پر اپنا دست شفقت پھیرنا شروع کیا اور ان کو ہندوؤں سے بھڑانے کی پالیسی تیار کی تاکہ لڑاؤ اور حکومت کرو، کی شیطانی پالیسی سے برطانوی سامراج کا قلعہ قائم رہے۔ غرض انگریزوں نے دشمن بن کر مسلمانوں کو نقصان پہونچایا ہی تھا دوست بن کر بھی ان کو گھرے گڈھے میں اٹا دیا فرنگی سامراج مسلمانوں نے ہر موقع پر

دشمن نمبر ایک قرار دیکر کبھی معاف نہیں کیا بہر حال برطانوی سامراج کی یہ پالیسی
 جو سیاست کے نام سے ہندوستان میں نافذ کی گئی تھی، براہ راست
 مذہب و اخلاق سے ٹکراتی تھی اگر اس پالیسی کو تسلیم کر لیا جائے اور عملی زندگی
 میں اس کو جاری کرنے کی اجازت دیدی جائے تو دنیا فتنہ و فساد کا گھراور ہر
 ملک خون و خرابہ کا ٹھکانہ بن کر رہ جائے گا جیسا کہ اس وقت ہے اس لئے کوئی
 بھی مذہبی روحانی ہمدرد خلق شخصیت اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی
 ولی اللہی دعوت کے امام ہونے کے لحاظ سے حضرت شیخ الہند نے برطانوی
 سامراج سے ٹکر لینے کا وہی راستہ اختیار کیا جو ان کے اکابر کا تھا اور ان کو
 مجبوراً خاڑا سیاست میں کودنا پڑا۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح
 ہو گئی کہ حضرت شیخ یا ان کے اکابر کی انگریز یا یورپ سے کوئی ذاتی دشمنی
 نہیں تھی بلکہ جو کچھ بھی نفرت و عداوت تھی وہ ان کی مادہ پرست تہذیب
 اور ان کے مادی نظریہ حیات اور استعماری پالیسی سے تھی جس کے اندر کمزور
 افراد پرست درازی زور اور طاقت سے تسلط و غلبہ اور ان کے مال و ملک
 پر ناجائز قبضہ اور غریب اقوام کی محنت سے ناجائز نفع اندوزی جیسی مذموم
 کارروائیاں تھیں ان بزرگوں کو یورپ کے عوام یا دنیا کے کسی ملک کے
 باشندوں سے کوئی پر خاموش نہ تھی وہ تو پوری انسانیت سے محبت کرتے تھے
 اور خدا کی ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے۔ نباء بریں ہمارے لئے ضروری
 ہو گیا ہے کہ تحریک شیخ الہند کا تعارف اس کے صحیح پیش نظر اور پس منظر
 میں کرایا جائے اور اس قصہ پارنیہ سے داغ نمائے سینہ کو تازہ کیا جائے۔

تحریک شیخ الہند کا تعارف

اس سے پہلے کہ تحریک کا تعارف کرایا جائے سب سے پہلے تو ہم کو یہ بات تسلیم
 نہیں کہ حضرت شیخ پورپ کی تارتخ یا فرنگی سامراج کے ان سیاہ کارناموں

اور انگریزوں کے کالے کر تو توں سے نا آشنا تھے جو اس نے ہندوستان اور ایشیائی قوموں کے ساتھ کئے تھے کیونکہ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی انگریزی دور میں سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے اور ان کے آغوش شفقت میں پرورش پانے کی وجہ سے انگریزوں کی تاریخ سے کیونکر ناواقف ہو سکتے تھے مولانا ذوالفقار علی کے متعلق فرانسیسی گارسان دتاسی لکھتا ہے کہ وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں انسپکٹر آف مدراس تھے۔ مسٹر بٹلر کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین و طباع ہونے کے علاوہ عربی و فارسی و مغربی علوم سے واقف تھے ۱۹۰۳ء ۱۳۲۲ھ میں انھوں نے وفات پائی (خطبات ص ۱۷۱)

دوسری بات یہ ہے کہ تاریخ یورپ سے پوری پوری واقفیت نہ ہونے کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ امر ظاہر ہے کہ خلافت عثمانیہ کا ہر مسلمان کار و حسانی و جذباتی رشتہ تھا ہر خطیب ہر جمعہ کے خطبے میں جہاں بھی مسلمانوں کی بستی ہوتی خلیفۃ الاسلام کے لئے ضرور دعا کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ترکی خلافت کے خلاف یورپ کی حکومتوں کے مسلسل حملے جاری تھے۔ تاریخ خاندان عثمانیہ میں ہے ۱۰ پندرھویں اور سولہویں صدی مغربی حکومتوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے ترکی کے لئے مفید ثابت ہوئیں ترک ان کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسی میں ان کی قوت کا راز تھا لیکن سترھویں صدی میں یورپی حکومتیں باہمی رقابت کے باوجود ترکی حکومت کے کمزور ہونے میں سب ایک ہو گئیں اور اس نقطہ پر سب متفق ہو گئے کہ اس مرد بیمار کا جنازہ یورپ سے نکال دیا جائے کیوں کہ یورپ ترکی حکومت کو ایشیائی سلطنت قرار دیتا ہے اور کسی ایشیائی ملک کا تسلط یورپ کے لئے ناقابل برداشت تھا سترھویں صدی کے آخر ۱۶۸۲ء میں پورا ہنگری ترکیہ کے ہاتھ سے نکل گیا پھر پنڈولہ اور ٹرانسولہ سے ترکی اقتدار ختم ہوا۔ ترکی بحری بیڑے کو وینس کے مقابلے میں

شکست ہوئی، "د تاریخ خاندان عثمانیہ ص ۲۲ جلد ۱)

غرض ترکِ خلافت کے حصہ بخرہ کرنے کی اسکیم ہی تیار نہیں ہوتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بلقانی ریاستوں کو ہضم کر لیا گیا جس کی تفصیل شیخ مدنی نے نقش حیات جلد ۱ میں فرمائی ہے۔ یہ تمام احوال شیخ الہند کی آنکھوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ تیسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کے لرزہ انگیز حالات نوں چکاں واقعات بھی شیخ کی آنکھوں کے سامنے تھے اگرچہ وکٹوریہ کے اعلان معافی نے ان آتشیں جذبات جو ہر ہندوستانی کے دل میں شعلہ زن تھے اوپر سے ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن ہر حساس ہندوستانی کے دل کی اندرونی تہوں میں خاموش چنگاریاں سلگ رہی تھیں

ان سب وجوہ سے بڑھ کر اس خطرناک دشتِ یامیدانِ جہاد میں قدم رکھنے کی اصل وجہ وہی ہے جو مولانا اسعد مدنی نے تحریر کی ہے کہ حضرت شیخ الہند حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید تھے جو صرف حلقہ درس میں شریک نہیں رہے بلکہ ایک فرزندِ رشید کی طرح عنفوانِ شباب ہی سے آپ کے جذبات و رجحانات کی تربیت بھی حجۃ الاسلام کے سایہ عاطفت میں ہوئی ابھی عمر عزیز کے مرحلے طے ہوئے تھے ابھی حضرت نانوتوی نے دیوبند کو اپنا مستقر نہیں بنایا تھا اور ان کا قیام میرٹھ تھا کہ شیخ الہند کا خطاب پانے والا نوہمال حجۃ الاسلام کے دامن سے وابستہ ہو گیا اس وابستگی نے گرویدگی کی صورت اختیار کر لی یہی گرویدگی تھی کہ حضرت حجۃ الاسلام کے ساتھ خضر میں بلکہ سفر میں بھی ساتھ رہتے اور جانفشانی خدمتِ جذبہ راحت رسانی کے اضطراب کو تسکین بخشتے۔ یہ حجۃ الاسلام وہی مولانا قاسم تھے جو چند سال پہلے ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں یورپ کے خواجہ فروش و غابازوں سے نبرد آزما ہوئے جواب اپنے مکر و فریب اور عہد شکنیوں سے جابر حکمران اور ستم گر فرماں روا بن گئے تھے۔ اس نبرد آزمائی کا نتیجہ شکست ہوا مگر اس

شکست نے صرف اسلحہ کو کند کر دیا تھا۔ وہ جذبات کو افسردہ نہیں کر سکی بلکہ زیر خاکستر چنگاریوں کی طرح اس کی تپش تیز ہو گئی تھی اور طوفان انقلاب کے لئے ان کی حرارت اور بڑھ گئی تھی۔ تلمیذ رشید مولانا محمود الحسن کا سینہ حضرت استاد کے فیوض و افادات کا گنجینہ تھا ان جذبات کا پر تو اس پر پڑا تو وہ آتش شیشہ بن گیا جو ہر اس اُبلینہ کو سوزش و تپش کا تحفہ دینے لگا جس میں عزت نفس خود داری خود اعتمادی اور استقلال و حریت کی جھلک نظر آتی ہے غیرت ملی اور حمایت وطن کی حرارت اس کے خون میں وقار قومی کی طلب اس کے گوشہ جگر میں پیدا ہوئی گویا اس کی صدایہ ہو گئی تھی۔ ے

من قاش فروشی دل صد پارہ خوشم

یہ قاش فروشی کب سے شروع ہوئی اور اس نے نصب العین کی شمع سے دلوں کے چراغداروں کو منور کرنے کی ابتداء کس زمانے سے کی اس کا سن اور سال بتانا مشکل ہے۔ جب حجۃ الاسلام کے آفتاب سے شعاعیں لینا شروع کیں تب ہی سے ان کرنوں کا تقسیم کا سلسلہ شروع کر دیا یہ کرنیں کہاں کہاں پہونچی اور کن کن حلقوں نے ان کرنوں کو سمیٹا اور کون کون سے حلقے ان کی تپش سے آتش دان کئے ان کی نشاندہی مشکل ہے صرف ایک حلقہ نمایاں ہوا یہ یا غستان کا حلقہ تھا یا غستان یا آزاد قبائل میں کام کب سے ہو رہا تھا ہمارے پاس اس کا صحیح جواب نہیں ہے البتہ مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں جب وہاں پہونچے تو بقول ان کے پچاس سالہ کوششوں کا منتشر ثمرہ ان کے سامنے تھا جن کو منظم کرنے کے لئے مولانا سندھی کو وہاں بھیجا گیا تھا۔

(پیش لفظ تحریک شیخ الہند ص ۷۱)

تحریک شیخ الہند کا آغاز

اس تحریک جہاد کا سراپہ مرنے لے لئے اس کا آغاز لب سے ہوا ہسم کو

جمیعتہ الانصار کی روداد سے روشنی ملتی ہے اس کا پہلا اجلاس مراد آباد میں شوال ۱۳۲۱ھ اپریل ۱۹۱۱ء میں ہوا جس کے صدر مولانا احمد حسن امروہی شاگرد رشید امام نانوتوی تھے حضرت نے خطبہ صدارت کا آغاز اس طرح فرمایا جو بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمیعتہ الانصار اولڈ بولواتر ایسوسی ایشن کی نقل ہے لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے جمیعتہ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس سال پہلے شروع ہو گئی تھی دہلی والہ علماء کا کردار

۱۸

اس لئے اس تحریک کے آغاز کا سلسلہ انیسویں صدی سے جاملتا ہے اس کی تائید مولانا ابوالکلام کے ایک مکتوب سے ہوتی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے —
 ۱۹۱۳ء عالم گیر جنگ کے ایام تھے ولی اللہی قافلے کے امیر حضرت مولانا محمود الحسن نے اتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیج دیا ان کو وہاں مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا ان میں جرمنی اور جاپانی سیاست دان چند ایسے بھی تھے جو آج برسرِ اقتدار ہیں ڈر سالہ الرجم جولائی ۱۹۱۵ء

جمیعتہ الانصار کے ناظم مولانا عبید اللہ سندھی موتہ کی روداد میں فرماتے ہیں رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کی ۲۷ ویں شب عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی جب کہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمیعتہ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی تھی والقاسم ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ

مولانا سندھی کون تھے | تحریک شیخ الہند کے اہم و ممتاز رکن مولانا سندھی ہیں مولانا

سندھی کون تھے ہم مولوی کی زبانی نہیں ایک مسٹر کی زبان سے ان کا تعارف کراتے ہیں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں مولانا عبید اللہ سندھی بہت بڑے

انقلابی عالم تھے جو ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب کی بجلیاں
 کڑکتی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے ان کی سوانح حیات اس انقلاب کی تاریخ کا ایک
 اہم جز ہے جس کے لئے گزشتہ نصف صدی میں وطن پروروں نے اپنی جان
 کی بازی لگائی تھی اس زمانے میں حکیم صاحب (اجمل خاں) کی زندگی ایک مہربانہ
 راز تھی وہ مولانا کے عزائم کے عملی معاون تھے جب تک یہ انقلابی عزائم پردے
 میں مستور تھے بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب وقار الملک مذہبی تعلیم کے اس
 جدید تخیل کے عملی تائید کرتے رہے حکیم صاحب کی سیاسی زندگی ۱۹۱۳ء سے
 نہیں شروع ہوئی بلکہ وہ نظارتہ المعارف مولانا سندھی کے ساتھ اس سے پیشتر
 آغاز کرچکے تھے مولانا سندھی غیر ملکوں کی تائید حاصل کر کے ایک عالمی محاذ
 قائم کرنا چاہتے تھے مولانا سندھی کی شخصیت اتحادیوں کے نزدیک اس قدر
 خوفناک تھی کہ اتحادیوں نے ان کے سر کی قیمت ایک لاکھ مقرر کر دی تھی۔
 (حیات اجمل ص ۱۳۰-۱۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمیعتہ الانصار کی بنیاد مدرسہ عربی دیوبند
 کے فضلاء نے اپنے مربی امام نانوتوی اور ارکان شوریٰ کی خدمت میں درخواست
 پیش کر کے ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں داغ بیل ڈالی تھی اور عطیہ یا چندہ
 کا نام ثمرۃ التربیت رکھا گیا حضرت شیخ الہند نے اپنے محبوب استاد کے ہاتھوں
 قائم کی ہوئی اس کی جماعت کو خفیہ راز داری کے ساتھ آگے بڑھایا کہ برطانوی
 سامراج کے کانوں میں اس کی بھنک تک نہ پہنچ سکی۔ ہندوستان سے
 افغانستان اور دوسری طرف برما اور جاپان تک اس کی شاخیں پھیلا دیں

شیخ الہند کی برما اور چین کیلئے خفیہ سفارتیں

حضرت شیخ نے اپنے اس مقصد عالی کو حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک
 میں اپنے خفیہ مشن بھیجنے کا ایک رازدارانہ سلسلہ شروع کیا حضرت شیخ

کی شمالی سرحدی کارروائیوں کی رویتِ ادا کا حصہ کچھ نہ کچھ منظر عام پر آچکا ہے لیکن مشرقی ایشیا۔ برما چین، کی مخفی سرگرمیوں پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے جس کو ہم یہاں اٹھانا چاہتے ہیں جس طرح شیخ نے یاغستان و افغانستان اب تک اپنی تحریک جہاد کو اپنے مخلصوں کے ذریعہ سے پھیلایا اسی طرح چین و برما تک بھی اپنے کارکنوں کو پہونچایا چنانچہ مولانا مقبول الرحمن سرحدی اور شوکت علی بنگالی بی۔ اے کی رہنمائی میں ایک مشن چین بھیجا گیا مولانا مقبول الرحمن جو شیخ کے معتمد و محرم راز شاگرد تھے وہ انگریزی و چینی زبانوں سے واقف کار تھے یہ مشن چھ افراد پر مشتمل تھا جن میں ہندو مسلم دونوں تھے اس مشن نے سیرت کمیٹی کے نام سے اپنے کام کا آغاز کیا اور ایک ماہنامہ ”الصبین“ کے نام سے ۱۹۰۵ء میں اردو چینی زبان میں جاری کیا تھا اس مشن کو چین میں جب اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی تو مرکزی کمیٹی نے اس مشن کو برما پہونچا دیا۔ برما میں مولانا مقبول الرحمن سرحدی نے ”الانسان“ کے نام سے ایک عربی کتاب تصنیف کی جس کا ترجمہ شوکت علی بنگالی نے برمی و انگریزی میں کیا اس کتاب کے اندر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے مظالم اور لوٹ کھوٹ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ یہ مشن ۱۹۱۵ء تک اپنا کام کرتا رہا مولانا مقبول الرحمن اپنے اخراجات طب یونانی اور شوکت علی ایلوپیتھک علاج کے ذریعہ پورا کرتے رہے ان کے برما منتقل کئے جانے پر تین افراد چین میں رہے اور ایک رکن مزید ہدایات کے لئے ہندوستان آیا برما میں مشن کے دیگر افراد کپڑا بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے۔ برما میں بھی اس مشن کو کامیابی ہوئی۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی تحریک مذکور قائد

شیخ الہند کے دوسرے مشن کے قائد مولانا برکت اللہ بھوپالی

اس طرح ہو گئے کہ حضرت شیخ مولانا نے اس اقتصادی مضمون سے جو اردو معالیٰ میں چھپا تھا بے حد متاثر ہوئے اور ان کو اپنے کام کا آدمی سمجھ کر رابطہ قائم فرمایا پھر اپنے اس مشن کی قیادت قبول کرنے کی دعوت دی جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا اس مشن کے پانچ ارکان تھے اور مولانا جاپان یونیورسٹی میں پروفیسر تھے بقیہ ارکان جاپان پہنچ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے

مولانا برکت اللہ بھوپالی ص ۹۶-۹۵

شیخ الہند نے اس تحریک کے سلسلے میں جو رابطہ حکومت افغانستان و ترکیہ سے ہندوستان کی آزادی کے لئے قائم کیا ان کی تفصیلات باب دوم میں آرہی ہیں تاریخ حریت کے اس قصہ پارینہ یا جنگ آزادی کی اس پرانی کے مخفی واقعات کو دجن کی یادیں بھی بھولی بسری یادیں بن چکی ہیں، اس لئے ہم نے طول دیا ہے کہ جو لوگ علمائے حق کے کارناموں سے ناواقف ہیں ان کے سامنے اصل تاریخ پیش کر دی جائے تاکہ اس کے آئینہ میں ہمارے بزرگوں کے پچھلے دور میں آزادی کی راہ جو جانفروشانہ خدمات ہیں ان کی جھلکیاں سامنے آجائیں اور ان اکابر کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا اندازہ لگایا جائے جن کے دلوں میں دنیا کے عظیم سامراج سے ٹکر لینے کا حوصلہ موجود تھا جس سامراج کے حدود سلطنت میں کبھی سورج نہ غروب ہوتا تھا اور جو سامراج ملکہ بکر بن کر دنیا کے بڑے بڑے سمندروں پر اپنی سر بلندی کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے وزیر اعظم رگلیڈسٹوں نے اپنی فتح و کامرانی نشہ غرور میں برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ ہم اس وقت اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر آسمان ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم اس کو سنگنیوں کی ٹوک پر روک لیں گے

علماء سیاست میں کب آئے

سامراجی مورخوں اور ان کے طفیلیوں سے شکوہ و گدگد فضول ہے

کہ انھوں نے اسلامیان ہند کی صحیح تاریخ آزادی ہند کو قصداً قلم انداز کیا ہے
اصل شکایت مسلمان تاریخ نگاروں سے ہے کہ انھوں نے اپنی ملت کے بزرگوں
کی حریت و آزادی کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔
ہمارے ملک کے مسلم مورخوں نے بتایا ہے کہ مولوی صاحبان اپنی بسم اللہ کے
گنبد میں بیٹھے ہوئے یاد الہی میں تھے کہ تحریک خلافت نے ان سوتلوں کو جگایا
(سیرت محمد علی ص ۵۱)۔

لیکن یہ امر حقیقت سے کتنا دور ہے اس کا جواب ایک مسٹر کی زبانی پھر
سنئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں کہ حکیم اجمل خان کے متعلق خیال ہے کہ وہ
۱۹۱۴ء میں میدان سیاست میں آئے اور یہ کہ سب سے پہلے علی برادران
نے ان حجرہ نشین مولویوں کو پبلک زندگی میں آنے کی دعوت دی سیاسی زندگی
میں ان کا پہلا قدم علی برادران کی تحریک کا نتیجہ ہے اس سے بڑھ کر کوئی
تاریخی غلطی نہیں ہو سکتی واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری شیخ الہند کے باقاعدہ
مرید تھے اور ان کے بھائی لقمان الملک حکیم نابینا انصاری اور حکیم اجمل
خال اس تحریک کے پہلے سے رکن تھے۔ (حیات اجمل ص ۱۹۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت کی تحریک نے خواص و عام کو یکساں
طور پر جھنجھوڑا اور کانگریس کے اشتراک نے ہندو مسلم عوام کو برطانوی
سامراج کے مقابلے کے میدان میں شانہ بشانہ لا کر کھڑا کر دیا لیکن اس کے
ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے پہلے جو لچ سیاست تھی محض خوشامد
پرستانہ تھی جو علماء کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اس لئے علمائے اہرام
اس سیاست سے دیر دور رہے جیسا کہ علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹ
مولانا طفیل احمد منگھوڑی نے لکھا ہے ۔ ہندوستان کی سیاست محض
چاپلوسی خوشامد پرستی اور اظہار وفاداری میں محدود ہو چکی تھی
گویا مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاسی سندان وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو

حکومت مسئلہ کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ علماء مذہب جو طبعاً خوشامد پرستی اور چا پلوسی سے متنفر ہیں اور جو بڑے بڑے بادشاہوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمہ حق کے عادی رہے اس سیاست سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے درویشن مستقبل ص ۵۲۳)

بہر حال ولی اللہی جماعت نے ۱۹۵۷ء کے گیارہ سال بعد ہی جمیعتہ الانصار کے نام سے تحریک کا آغاز کر دیا تھا چوں کہ ۱۹۵۷ء میں برطانوی سامراج کی قہرمانی نے دہلی و میرٹھ اور اس کے نواح میں ۱۳ ہزار علمائے حق کو اور دو تین لاکھ عام مسلمانوں کو پوری بے دردی سے شہید کیا اور حریت پسند مسلمانوں کے ساتھ درندگی و بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے اس خطرناک ماحول میں از سر نو بغاوت کا پروگرام بنانا دانشمندی کے خلاف تھا البتہ آزادی خواہ بکھرے ہوئے افراد کو ایک لڑی میں پرونے کا کام دھیرے دھیرے شروع کر کے ولی اللہی جماعت ان لوگوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوئی۔

کمپنی کی تعلیمی پالیسی

حکومت برطانیہ نے ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی ۱۹۵۷ء کے بعد اپنی پالیسی کو تبدیل کر دیا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ ہندوستان کے پرانے نظام تسلیم کو ختم کر کے باشندگان ملک کو ناخواند و جاہل بنا دیا جائے جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے فکر و تدبیر کے ان سورتوں کو خشک کر دیا جائے جہاں سے حقوق شناسی کے چشمے پھوٹتے ہیں یا تو مسلم بادشاہوں کے زمانہ کا یہ حال تھا کہ بقول مقریری شہنشاہ محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ (تعلیم ہند ص ۳)

پروفیسر میکس مولر نے مسٹر ہارڈی کو لکھا ہے کہ انگریزوں کی عملداری سے قبل عہد عالمگیری میں صرف بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ ہوتا تھا درویشن مستقبل (۱۲۷)

کپتان الگ زنڈرا ہملٹن اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ شہر ٹھٹھا (سندھ) میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے (تعلیم ہند ص ۳) مشہور فرنگی مورخ سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا کہ قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار بلکہ ذہن و فراست کے اعتبار سے بھی بڑی وقعت رکھتے تھے ان کا نظام تعلیمی اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا درپورٹ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس (۱۹۳۳ء)

بنگال سول سروس کا ایک افسر لکھتا ہے عام تعلیم اور دینی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان بدرجہا فائق ہیں اور ہندو نسبتاً مسلمانوں کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں بقول جسٹس محمود ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر صرف یہ چاہتے تھے کہ تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں۔ اس لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہیں سمجھتے تھے (تاریخ تعلیم میجر باسو جوالہ روشن مستقبل ص ۱۲۸) چنانچہ اس پالیسی کا نتیجہ نصف صدی میں یہ نکلا جس کا آنر بیل ایم افسٹن اور ایف ڈاؤن نے اپنی یادداشت ۱۸۲۳ء میں اظہار کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیتے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیئے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو گئے ہیں اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار

کے فراموش ہونے کا اندیشہ ہے اس الزام کو ہمیں دور کرنا چاہئے درویش
مستقبل ص ۱۲۳

برطانوی سامراج کی نئی تعلیمی پالیسی

برطانوی سامراج نے اپنے اوپر کے اس الزام کو دور کرنے کے لئے
ایسا حربہ استعمال کیا کہ سارے ہندوستانی عموماً اور سب مسلمان خصوصاً
اس وار سے ایسے گھاتل ہوئے کہ اس زخم کو بھرنے میں عرصہ لگا۔ برطانوی
سامراج نے دفتری زبان فارسی ۱۸۳۴ء میں بیک جنبش قلم ختم کر کے
انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنادیا جس کے نتیجے میں ملک کے سارے
عالم و فاضل اور پرانی تعلیم کے ماہر کامل ایک رات ہی میں سارے کے
سارے جاہل بن کر رہ گئے۔ جس کا اعتراف سر ولیم ہنٹر نے بھی کیا ہے وہ
لکھتا ہے ہم نے اپنی عملداری کی ابتدائی دور میں پچھتر سال یعنی ۱۸۲۳ء
تک اپنے نظامی عہدہ دار تیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے سابقہ نصاب تعلیم
کو جاری رکھا اس دوران ہم نے اپنا سرشتہ تعلیم قائم کر دیا تھا اور
جوں ہی اس سے ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا
کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ملازمت کے دروازے
بند ہو گئے پھر اس نسل کو تیار کرنے کے لئے ہندوؤں سے کام لیا گیا چنانچہ
یہی ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری
ملازمت پانے کی اہمیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی سرکاری اطلاعات
کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے ان کی بے کسی کی طرف
کوئی توجہ نہیں کرتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی کسر شان
سمجھتے ہیں چنانچہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں کوئی دفتر ایسا ہو گا جس میں بخر
چیرا سی دفتری یا چھٹی رساں کے مسلمان کو نوکری مل سکے مسلمانوں

کے افلاس کا علاج ص ۱۵۸)

اب ہم آخر میں مس مٹو کے ایک بیان برطانوی سامراج کی پیدا کردہ گھناؤنی پالیسی پر ختم کرتے ہیں۔ برطانوی سامراج جب اپنے مقصد مسلمانوں کو نیچے گمراہیت اور برادران وطن کو آگے بڑھانے کی پالیسی میں کامیاب ہو گیا تو اب اس نے اپنا چولا بدلا اور مسلمانوں کا ہمدرد بن کر اپنی تعلیمی پالیسی کو تبدیل کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے تمام صوبوں میں احکام جاری کر دیتے تاریخ التعليم سید محمود بحوالہ روشن مستقبل ص ۳۳۱)

لیکن برطانوی سامراج نے کون سی تعلیم کے جاری کرنے منصوبہ بنایا وہ لارڈ مکالے کی ان الفاظ سے آشکارا ہوتا ہے جو اس نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہے تھے کہ ہمیں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو وہ ایسی جماعت ہو جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق رائے اور سوچہ بوجھ کے اعتبار سے انگلستانی ہو تاریخ التعليم بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۳۷)

سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج نے اپنی تعلیمی تحریک حکومت کے تعاون سے جاری کی جس نے آگے چل کر مسلمانان ہند کو نئے اور پرانے تعلیم یافتہ طبقوں میں بانٹ دیا۔ اس مقام پر عام طور پر پھیلائی ہوئی ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ سر سید سارے علماء یا تمام مولویوں کے خلاف تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سید نے پیشہ ور علماء کی مخالفت

میں ان کی جمود پسندی اور انگریزی تعلیم کے حرام کہنے کی وجہ سے ضرور مخالفت کی ہے لیکن کیا وہ علمائے حق کے بھی خلاف تھے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کو قرآن کی روشنی میں کیوں کر حرام کہا جاسکتا ہے جبکہ قرآن نے زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو خداوند قدوس کی نشانیوں میں سے بتایا ہے۔ (سورہ روم)

چنانچہ ولی اللہی دعوت کے پہلے امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے سب سے پہلے انگریزی زبان کی تعلیم کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔
(فتاویٰ عزیزیہ)

حقیقت حال یہ ہے کہ سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ایک ہی استاد حضرت مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ سرسید مولانا مملوک علی کے متعلق لکھتے ہیں "علوم معقول منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ان کو ایسا استحصا ہے کہ اگر فرض کرواں تمام کتب سے گنجینہ علم خالی ہو جائے تو ان کے لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے ان سب فضل و کمال پر خلق حلم احاطہ تحریر سے فروع تر ہے،" (آثار الصنادید ص ۴ جلد ۴) یہ تینوں حضرات ایک ہی مکتبہ فکر سے ابتداء آتعلق رکھتے ہیں لیکن بعد میں اپنی اپنی پالیسیوں کے اعتبار سے دونوں کے راستہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ مولانا نانوتوی کے وفات پر سرسید نے جو تعزیتی مضمون لکھا ہے اس سے ان کے احترام، اکرام اور باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے یہ مضمون بہت طویل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا محمد قاسمؒ ایک فرشتہ صفت عالم تھے ان کے اندر سادگی و تقویٰ شعاری محمد اسحاق دہلویؒ کے نمونہ پر تھے اسلام کے بھی خواہ اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد ایسے اشخاص صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور مدرسہ دیوبند سے مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کا انھوں نے انتظام کیا ان کی وفات پر جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے دہلی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۲۲/اپریل ۱۹۸۰ء

بہر حال امام نانوتویؒ اور قطبؒ لنگوہیؒ نے ولی اللہی فکر و حکمت کے لحاظ سے برطانوی حکومت کے لئے ایسی پالیسی بنائی اور سرسید مرحوم نے مصلحت زمانہ کے آگے سپر ڈال دی اور حکومت سے سمجھوتہ کرنے میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی سمجھی یہ حقیقت واقعی ہے کہ برطانوی حکومت کے جاہلانہ تسلط کے بعد حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے مغربی تعلیم کو نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ مغربی تعلیم مسلمانان ہند کو کس ماحول میں دلائی جانا چاہئے تاکہ مغربی تہذیب و معاشرہ کے مضر اثرات سے ملت اسلامیہ کے نوہمال محفوظ رہیں۔ اس کے مقابلہ میں سرسید مرحوم اس امر کے پر زور دلیل تھے کہ مغربی تعلیم مغربی تہذیب کے سایہ ہی میں صحیح طور پر نشو و نما پاسکتی ہے وہ مغربی تہذیب کی برتری کے زبان و دل سے قاتل تھے چنانچہ ان دونوں مصلحوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ کتاب تصفیۃ العقائد میں اب بھی موجود ہے۔

بہر حال جب ۱۸۷۳ء میں برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی مسلمانوں کی بابت بدلی اور اس تعلیم کو سامراجی مقاصد کے لئے جاری کرنا طے کیا گیا۔ تو سرسید احمد خاں نے یکم جون ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم علی لڈھ کی بنیاد رکھی اور اپنے مجوزہ خیالی نقشہ کو عملی رنگ سے بھر دیا حکومت کے تعاون سے ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی تب امام نانوتویؒ اور ان کے مخلص رفقاء نے دنیاوی تعلیم کے علی گڑھ میں فروغ پانے کی بنا پر اپنے لئے دینی تعلیم کے میدان کو منتخب کیا گیا ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا اور اسی سال مدرسہ مظاہر العلوم قائم ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اخلاص و للہیت سے نصب کیا ہوا یہ پودا سایہ دار تناور درخت بن گیا اور اس کی شاخیں ملک کے اطراف پھیلتی گئیں ایسے ہی سرسید کی تعلیم جدید کی تحریک بھی پورے ملک میں برومند و براور ہوئی لیکن بقول ڈاکٹر اقبالؒ

جدید تعلیم کی شیریں ہمارے دلوں میں جلوہ گر تو ضرور ہوئی مگر الحاد و لامذہبیت کا فریاد بھی اپنے ساتھ تیشہ لے کر آیا اور اس فریاد یا الحاد کے تیشہ نے دلوں کی سرزمین سے معرفت و روحانیت کے پاکیزہ درخت کو کاٹ پھینکا اور اس کی جگہ بددینی یا تشکیک کا بیج بو دیا جس سے نشو و نما پا کر پھل پھول لانے میں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا خدا نخواستہ ہمارے ان اکابر و بزرگوں نے ملک کے اندر مذہبی مدارس کا جال نہ پھیلایا ہوتا تو ہماری قوم مہذب و ترقی یافتہ ضرور ہو جاتی مگر مسلمان نہ رہتی۔ بقول اقبال "صرف متاع کارواں ہی نہیں چلا جاتا بلکہ اہل کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی رخصت ہو جاتا۔ جس کو ان العصر نے اکبر الہ آبادی، یوں فرمایا۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے

تو پھر اس کو کیا کرونگا جنت کوئی نچ ہے

اسلامیان ہند کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کے لئے علی گڑھ تحریک کا غلغلہ سرکاری طور پر پوری دنیا میں کیا گیا لیکن برطانوی سامراج کی ڈپلومیسی نے علمائے حق کے شاندار کارناموں کو دبا دیا اور جہاں کہیں ذکر کیا ہے تو وحشت ناک عنوان مذہبی دیوانوں۔ جنونیوں کے لقب سے ان کو یاد کیا ہے۔

ہر تحریک ہر دعوت ایک جڑ بنیاد رکھتی ہے اور ہر درخت کی آبپاری سے الگ الگ پھول پھل نکلتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں تحریکوں کے نتائج بھی الگ الگ نکلے۔

سر سید آغا زکار میں تو صحیح قوی و ملی خطوط پر کام کرتے رہے لیکن جب کالج کی باگ ڈور انگریز پرنسپل مسٹر بیک مسٹر راجپولڈ وغیرہ کے ہاتھ آئی تو پھر برطانوی سیاست نے اپنا وہی پرانا کھیل ڈوانڈرول کھیلایا مولانا طفیل احمد منگلوی جو سر سید کے دیکھنے والوں اور کالج

کے ابتدائی طالب علموں میں تھے انھوں نے لکھا ہے ”بوڑھے سرسید اپنی ضعیفی و پیری میں ان یورپین مشیروں کے آلہ کار بن گئے اور پھر مسلمانوں کے لئے انکی پوری پالیسیاں حکومت کے چشم و ابرو کے نشانے پر انجام پانے لگیں درویشن مستقبل ص۔

حالانکہ یہ وہی سرسید تھے جنھوں نے اپنی نوجوانی کے دور میں اسباب بغاوت ہند لکھ کر پورے ملک میں نہلکہ مچا دیا تھا برطانوی سامراج کے ہندوستانیوں پر الزامات کی پرزور دلائل سے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ اور ۱۹۵۷ء میں بغاوت کو حق بجانب ثابت کرنے کی پرزور وکالت کی تھی اور اہل ملک کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ انھوں نے سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا ترکی بہ تر کی جواب دیکر پوری ملت اسلامیہ کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ لیکن وہ بوڑھے ہو کر ساحر برطانیہ کے جادو کے ایسے شکار کہ اس کی پالیسی پر آمنا و صدقنا کہنے لگے چنانچہ جب ملی قافلہ آگے بڑھا تو ملت کے دو بازو نئے تعلیم یافتہ اور قدیم انخیاں لوگ سامراجی پالیسی کے نتیجے میں بہ مقابل بن کر آمنے سامنے آئے اور برطانوی سامراج نے اس خلیج کو وسیع کر کے انتہا تک پہنچا دیا چوں کہ برطانوی سامراج نے اپنی مستقل پالیسی کے ماتحت ملت اسلامیہ کو دشمن نمبر ایک قرار دے رکھا تھا جیسا کہ ایک موقع پر انگریز لارڈ رابرٹس نے کہا تھا کہ ان بد معاش مسلمانوں کو بنا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔

(شاندار ماضی)

جیسا کہ گورنر ایلٹن نے ڈپوک آف ویلنگٹن کو ۱۸۴۳ء میں لکھا تھا میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کریں (ان ہی پی انڈیا)

تقسیم بنگال کا قضیہ

برطانوی سامراج نے برادران وطن (ہندوؤں) کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اس لئے آگے بڑھایا تھا کہ وہ ان کے دست بازو بن جائیں گے اور سامراج کے آلہ کار ہو کر ان کے آلہ کار ہو جائیں گے۔ لیکن جدید تعلیم نے ان کے اندر حقوق شناسی کے جذبے کو بیدار کیا۔ اور چونکہ سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی ملک میں انگریزوں نے قائم کی تھی اس لئے بنگال کے بالوؤں نے اعلیٰ ترین عہدوں کے لئے مطالبات کا جوش و خروش پیدا ہوا چنانچہ برادران وطن نے برطانوی سامراج کے خلاف بنگال سب سے پہلے میدان میں آیا برطانوی سامراج کے نمائندے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں ہندو مسلم تنازعہ پیدا کرنے کے لئے تقسیم بنگال کا اچھر استعمال کیا۔ تقسیم کا یہ پہلا وار تھا۔ جو ہندوستان پر اور ملکی سالمیت پر انگریزوں نے کیا تھا۔ اس کی مصلحت بقول قاضی عبدالغفار یہ تھی کہ ایک طرف تو غیر مسلم بنگالیوں کی قوت و اکثریت کو توڑا جائے جنھوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا اور مورچہ قائم کر لیا تھا اور دوسری طرف وفادار اور برطانوی سرکار کے عقیدت مند مسلمانوں کو اس طریقہ سے خوش کیا جائے ایک پورے صوبے میں ان کو اکثریت حاصل ہو جائے۔ انگریزی اندازِ تدبیر پر نظر رکھی جائے تو اس تقسیم ہند کے اعتراض تقسیم بنگال سے مختلف معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن بیدار عوام بنگالیوں نے انگریزی منصوبہ کو شکست دیدی (آثار ابوالکلام ص ۵۳)

بنگالیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کی تین صورتیں تجویز کی تھیں (۱) ولایتی مال کا بائی کاٹ (۲) سودیشی مال کی ترویج (۳) انگریز کے خلاف دہشت پسندی۔

آخری بات تشدد کو چھوڑ کر گاندھی جی نے بعد ان کا دونوں بالوں کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ بہر حال پانچ سال تک اس تقسیم کے خلاف تحریک زور و شور سے جاری رہی ہنگال کی بم بازی نے حکومت کے ناک میں دم کر دیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۱ء میں اس فیصلہ کو حکومت کو منسوخ کر دینا پڑا۔ جس نے برطانوی سامراج کے خلاف برادران وطن میں ایک ولولہ پیدا کیا۔ ایک طرف ہندوؤں میں حکومت کے خلاف ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔ دوسری طرف مسجد کانپور کے ہنگامہ برپا ہوا جس کی وجہ سے وفاداران برطانیہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور جس علیگڑھ کو گورنمینٹ نے مسلمانوں کے لئے اس ڈپلومیسی نافذ کرنے کا اڈہ بنایا تھا اسی کے پر جوش فرزند مولانا محمد علی وشوکت علی میدان سیاست میں کود پڑے اور مسلم عوام کے دلوں میں جو طوفان چھپا ہوا تھا وہ حکومت کے اس فیصلہ سے پھٹ پڑا۔ اس کے بعد حکومت کے دوسرے فیصلہ نے جلتی آگ میں تیل کا کام کیا۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کا قضیہ نامرضیہ تھا۔ جب ہائی کورٹ ہند نے یونیورسٹی کے قانون اساسی میں ایسی دفعات رکھ دیں جن کی بنا پر یونیورسٹی گورنمینٹ کے کنٹرول میں چلی جائے تو مسلمانوں کا وہ خواب بکھرنے لگا جو اس تحریک کے سلسلہ میں دیکھا تھا۔ ایک طرف صاحبزادہ آفتاب احمد نواب مزمل اللہ خاں، سر علی امام، اور نواب محمد اسحاق تھے دوسری طرف احرار تھے۔ جس میں نواب حمید اللہ خان مسٹر منظر الحق ڈاکٹر بجنوری اور مسٹر جناح وغیرہ تھے۔ آخر میں کانستی ٹیوشن کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی حکیم اجل خاں کی رہنمائی میں شملہ جانے والی تجویز حسب رائے احرار منظور ہوئی حیات اجل

ص ۱۳۴

لیکن حکومت برطانیہ نے اپنے وفاداران اذلی کے بل بوتے پر ایک مفلوج

اور اپنا جیو نیورسٹی مسلمانوں کے سروں پر تھوپ دی۔ حکومت ان فیصلوں کی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان دونوں فرقے برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا ابوالکلام "البلاغ" و "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں میں آزادی کا صور پھونک رہے تھے۔ "الہلال" کا ہر مضمون بقول حضرت شیخ الہند "مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلارہا تھا دوسری طرف رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اپنے انگریزی اخبار "کامریڈ" کے ذریعہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں حریت و خودداری کی بجلیاں چمکا رہے تھے۔ اس سے پہلے جنگ بلقان ۱۹۱۲ء جب چھڑی تھی تو شیخ الہند کے دارالعلوم دیوبند کو بند کرا کر ملک کے اندر مختلف وفود ترکوں کی امداد کے لئے بھیجے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرید شیخ الہند، کاظمی وفد ۱۹۱۳ء میں ترکیہ بھیجا گیا۔ جو چند ماہ رہ کر واپس آیا۔ چونکہ ولی اللہی تحریک خلافت اسلامیہ کی مرکزیت کو شریعت کی روشنی میں قائم رکھنے کی داعی تھے۔

جنگ عظیم کا آغاز کانپور کے حادثے اور مسلم یونیورسٹی کے ہنگامہ نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کیا اس عرصہ میں جنگ عظیم سہ ماہ چھڑ گئی جس کے اندر ایک طرف جرمن و ترک تھے اور دوسری طرف اتحادی برطانیہ و فرانس و روس تھے حکومت کے سیاسی لیڈروں کی نظر بندی میں اپنی عافیت سمجھی یہ وہی لوگ تھے جو تحریک شیخ الہند کے ارکان تھے۔ مولانا ابوالکلام - علی برادران مولانا حسرت موہانی مولانا ظفر علی خاں وغیرہ اس لئے شیخ نے ہندوستان میں مزید کھہرنا مفید نہ سمجھا اور تحریک کے کارکن جو سرحد و یاغستان اور پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے ان کو حرکت میں لانا ضروری خیال فرمایا مولانا سندھی کو ۱۹۱۵ء کا بل اور مولانا سیف الرحمن، مولانا فضل ربی اور حاجی

ترنگ زئی وغیرہ کو یاغستان روانہ کر دیا اور خود حجاز روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ پہونچ کر اپنے رفقاء سے مل کر عملی پروگرام طے کیا۔ اور مدینہ میں گورنر حجاز غالب پاشا، جمال پاشا اور انور پاشا سے مل کر وہ خطوط حاصل کر لئے جو امیر کابل اور مجاہدین باغستان کو جہاد کرنے کے لئے خفیہ روانہ کئے تھے جن میں سے اکثر خطوط مرسل الہیم تک پہونچا دیئے گئے۔ اس اسکیم کے مطابق فروری ۱۹۱۵ء میں ایک دن طے کیا گیا تھا۔ جس دن ہندوستان پر بیرونی حملہ ہونے والا تھا اور پورا ملک بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہونا طے تھا (علامہ حق ص ۱۷)

صرف ایک خط خان بہادر رب نواز کے ہاتھ اس وقت آیا جبکہ جنگ کا پانسہ ہی پلٹ چکا تھا اور اتحادیوں کی فتح سے صورت حال ہی بدل چکی تھی حضرت شیخ حجاز سے باغستان پہونچنا چاہتے تھے۔ لیکن روس نے ایران پر حملہ کر کے راستہ بند کر دیا۔ تب قسطنطنیہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ شریف مکہ نے بغاوت کر کے شیخ کو گرفتار کر کے فروری ۱۹۱۷ء کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

شیخ الہند کی مالٹا میں نظر بندی :- حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء مولانا عزیز گل، مولانا وحید احمد کے ساتھ چار سال نظر بند رہے۔ جہاں ترک، جرمن کے بڑے بلند پایہ مدبر و جرنل افسر برطانیہ کی حراست میں تھے۔ بقول حضرت مدنی مالٹا کا وہ قید خانہ ہمارے لئے سیاست کا درس گاہ بن گیا۔ شروع میں اس قید خانہ میں حضرت شیخ کو کال کوٹھری میں بند کیا گیا۔ جہاں چاروں طرف لوہے کی سلاخیں اس طرح کی تھیں جس کے اندر آدمی کے لئے کھڑ ہونا بھی مشکل ہوتا تھا، ادھر ادھر سہارا لینے سے وہ سلاخیں چبھتی اور جسم کو زخمی کر دیتی تھیں، اس ظالمانہ فعل کا مقصد

یہ تھا کہ حضرت شیخ اور ان کے صاحب جہاڑت ساتھیوں سے اصل منصوبہ کا سراغ لگ سکے۔ لیکن ان کی ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہو گئیں۔

برطانیہ کے جاسوسی نظام کی شکست و ناکامی

حضرت شیخ الہند کی اس خفیہ تحریک کو رازداروں کے ساتھ وسعت اور پھیلاؤ کا ماجرا اس قدر حیرت ناک اور عجیب و غریب ہے کہ برطانیہ جیسی چالاک، عیار و مکار و ہوشیار حکومت کی بے تدبیری اور حضرت شیخ کے کمال تدبیر پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی گورنمنٹ جس کی سی۔ آئی۔ ڈی د محکمہ خفیہ، کاجال ملک کے کونہ کونہ میں پھیلا ہوا تھا اور اس کا تار برقی نظام ملک کے اندر انسانی جسم کے اعصابی نظام کی طرح پورے برطانوی حکومت کے ہر رگ وریشہ میں دوڑ رہا تھا۔ ملک کی رعایا کے ہر اہم آدمی کے اعمال نامے اور ان کے کچے چٹھے برابر لکھے جاتے تھے۔ واقعاً برطانوی سامراج کا جاسوسی محکمہ اس قدر مستعد و فعال اور مضبوط محکمہ تھا کہ اس وقت کی دوسری حکومتیں بھی۔ اس کے نام سے تھراتی تھیں اتنی عظیم حکومت جو نئی اور پرانی دنیا کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ اور قصر بکنگھم سے اس کی ہر نو آبادی کے تار جڑے ہوئے تھے۔ اس کا محکمہ خارجہ ہر تحریک سے باخبر رہتا تھا لیکن ایک فقیر درویش صفت جس کی پوری زندگی دارالعلوم کی چار دیواری میں محصور رہی اور جو عمر بھر اس وقت کی عصری سیاست سے کوسوں دور ہو۔ اور جس کے نہ ارباب سیاست سے ظاہری تعلقات تھے اور نہ خفیہ رابطہ تھا۔ لیکن اس نے بسم اللہ کی گنبد میں بیٹھ کر نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ ملک کے باہر برطانوی سامراج کے خلاف ایک ایسا عالمی محاذ قائم کیا جس کے ارکان جاپان و چین اور برما سے لے کر افغانستان، بلخ و بخارا تک پھیلے ہوئے تھے

لیکن اس کی خفیہ تحریک اور اس کی جاری کردہ تحریک و ہدایات سے برطانیہ کا عظیم جاسوسی محکمہ آخر تک یکساں نواقف رہا۔ اس تیس سالہ تحریک جہاد سے برطانیہ کب واقف ہوئی جب کہ خلافت ترکیہ کے خاتمہ پر تحریک نے ہی پوری طرح دم توڑ دیا۔ ہماری سابقہ مہربان گورنمنٹ اس وقت زندان مالٹا میں اس تحریک کا کھوج لگا رہی تھی۔ جب کہ وہ منصوبہ ہی ناکام ہو چکا اور سلسلہ جہاد کی تمام کڑیاں بکھر چکی تھیں۔ چوں کہ اس منصوبہ کا بنیادی کردار خلافت ترکیہ کو انجام دینا تھا اور دوسری مسلم حکومتیں و معاون بن کر اس کے شریک ہوتیں۔ لیکن جب وہ مرکز اصل قائم نہ رہا تو پوری عمارت ڈھ چکی تھی۔ اس وقت حکومت برطانیہ اس کا سراغ رسائی کا جال پھیلا دیا۔ رولٹ کمیٹی کے ارکان نے اپنی لمبی چوڑی رپورٹ میں جو طومار پر غلط جمع کیا ہے اس سے انکی نااہلی و بے لیاقتی اور بے خبری کا پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ اس رپورٹ کے مطابق مولانا عبید اللہ سندھی اس اسکیم کے بانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے پشت پناہ اور مددگار بتائے گئے ہیں۔ حالانکہ خود مولانا سندھی نے کھل کر اس کا اعتراف کیا کہ شیخ نے ان کو کابل جانے کا حکم دیا تھا تو وہ کسی پروگرام سے واقف نہ تھے۔ لیکن کابل پہنچ کر شیخ کی پچاس سالہ عوامی جدوجہد کا نقشہ سامنے آیا۔ (ص ۳۶)

ارکان کمیٹی کے نزدیک حضرت شیخ کو بہکانے و رغلا نے اور انکی اسلامی تحریک کی طرف گھسیٹنے والے مولانا سندھی تھے اور ان کے خفیہ معاون مولانا آزاد تھے۔ لیکن حقیقت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مولانا سندھی کا بیان گزر چکا ہے اور مولانا آزاد شروع ہی سے ہند کی آزادی کے لئے کسی بیرونی ملک جانے سے قطعاً متفق نہ تھے وہ ملک کے اندر رہ کر تحریک آزادی کو بڑھانے کے قائل و داعی تھے شیخ الہند

نے سرحد پار اس تحریک کے سلسلہ تیس سال کی مدت میں اسے قابل اعتماد شاگردوں کے ذریعہ پھیلایا تھا۔ مولانا آزاد قطعاً نابلد تھے۔

گورنمنٹ برطانیہ کی شیخ کی مالٹا میں نظر بندی اور خفیہ پولس کے ذریعہ پورے ملک میں بھاگ دوڑ اور شیخ کے معتقد لوگوں کی گرفتاری یہ ساری کاریاں بالکل اسی طرح کی تھیں کہ سانپ تو نکل گیا تھا لیکن اس کی لکیر کو پٹیا جا رہا تھا۔ غالب نامہ دوہی مکتوب جہاد جو شیخ نے غالب پاشا سے حاصل کر کے امیر افغانستان اور مجاہدین باغستان کے نام ریشمی پھول کاڑھ کر بھیجا تھا اس کو حاصل کرنے کی پورے ملک میں حکومت نے بڑی دوڑ دھوپ کی، شیخ کے معتقدین کی خانہ تلاشیاں لیں گرفتاریاں کیں۔ جیل خانہ میں ان بزرگوں کو طرح طرح کی دھکیاں دیں۔ لیکن شیخ کی کرامت سے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ نہ کوئی سراغ نکل سکا۔ غرض گورنمنٹ برطانیہ اس تحریک کا پتہ اس وقت چلا جب چڑیاں کھیت ہی چگ چکی تھیں۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ برطانیہ عظمیٰ کے خفیہ محکمہ کی نااہلی و ناکارگی اور ایک فقیر بے نوا کی عزائم کی پختگی کمال راز داری، اور استقامت ایمان کی مضبوط و نقشہ و مستند دستاویز ہے۔

تحریک کی اہم شخصیات :- اس تحریک کے سلسلہ میں جن جن افراد کو ذمہ داریاں سپرد کی جانے والی تھیں ان کی تعداد انڈیا آفس کی ریکارڈ کے اعتبار سے ۲۲۲ تھی، جن کے اندر خلیفہ ترکی، شاہ ایران امیر کابل بحیثیت سرپرست کے اور انور پاشا و وزیر جنگ ترکیہ، عباس حلبی و مصر شریف مکہ، اور نائب السلطنت اور معین السلطنت کابل، نظام حیدر آباد والی بھوپال، نواب رام پور، نواب بھاؤل پور مرکزی شخصیتیں تھیں مرکزی فوج جنود اللہ کے نام سے مقرر کی گئی تھی۔ اس کے سالار اعظم خود شیخ الہند نائب سالار مولانا عبید اللہ سندھی تاج محمد مروٹی (سندھ)

حاجی صاحب ترنگ زنی دسرحد، ملا کوہستانی خاں ہاجوڑ ڈاکٹر انصاری
حکیم عبدالرزاق نابینا مولانا منصور انصاری، مولانا آزاد، مولانا مدنی
مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں کولفٹینٹ جرنل
ہونٹے کیا تھا۔

میجر جرنل میں علامہ سید سلیمان ندوی دہند، کاظم بے (ترکیہ)،
مولانا محمد علی قصوری وغیرہ تھے۔

کرنل کے عہدہ پر مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد صادق کراچی
مولانا عزیز گل، خواجہ عبدالحی فاروقی اور مولانا فضل ربی تھے۔ اسی
طرح میجر اور کی فہرست اس کے علاوہ تھی۔

تحریک شیخ الہند پر تبصرہ

اب ہم اس تحریک کے آغاز و انجام پر ایک اجمالی تبصرہ کرنا اور اس کو نقطہ اختتام بتانا چاہتے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے اس تحریک کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ حضرت شیخ نے ۱۸۷۹ء تا ۱۹۱۲ء میں ایک جمیعت شمرہ التربیت کے نام سے قائم کی تھی حضرت شیخ کی تحریک ولی اللہ جہاد کی کڑی تھی۔ اس کا سلسلہ شاہ اسماعیل شہید، اور سید احمد شہید سے جا کر ملتا ہے دونوں کے مقاصد مسلمانوں کی سر بلندی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے یکساں تھے۔ دونوں ابتدائی سرگرمیوں کے لئے آزاد سرحد (دیاغستان) کو بین الاقوامی دست اندازوں سے محفوظ رہنے کی بنا پر پسند فرمایا۔ حضرت شیخ الہند نے اس دور میں جب کہ سیاسی سرگرمیوں کے لئے وقت سازگار نہ تھا۔ ایک نقشہ عمل مرتب کر لیا تھا۔ یہ ایسا دور تھا کہ مسلمانوں پر بے یقینی، حیرانی افسردگی طاری تھی۔ پھر شیخ اپنے مرکز علمی (دارالعلوم دیوبند) کو فرنگی سامراج کی زد سے بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے مکمل رازداری سے اس پروگرام کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اپنے شاگردوں اور خصوصی معتقدوں میں سے جس کے خلوص پر اعتماد فرما سکتے ہوں ان کو اپنے اکابر کے نقشہ کے مطابق درس گاہ قائم کرنے کی تلقین کرتے ملا صاحب سنڈا کے حاجی صاحب ترنگائی جو شیخ کے معتقدین میں سے تھے اسلامی درس گاہوں کا سلسلہ سرحد میں قائم کیا تھا۔ ان کے استاد مولانا نانوتوی نے بھی

ہندوستان میں یہ اسلامی قلعے قائم کئے تھے۔ جن کے ذریعہ تعلیم دینی کے ساتھ جہاد اسلامی کی تعلیم بھی شامل تھی۔ جیسا کہ حضرت سید شہید نے اپنی تحریک جہاد میں اس زمانہ کے ذوق کے مطابق پیری، مریدی اور بیعت و اصلاح کا رنگ اختیار کیا تھا۔ دس گزشت ۵۵، چنانچہ حضرت شیخ الہند بھی اپنے بزرگوں کے طریقہ پر اس سلسلے میں اپنے مخلصوں سے بیعت جہاد لیتے تھے اس موقع پر اس واقعہ کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ کہ راقم الحروف نے ایک بار حضرت مولانا الیاس صاحب بانی دعوت و تبلیغ سے عرض کیا کہ حضرت اس گشت گرداوری کا مقصد کیا ہے۔ جماعتی چلت پھرت کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ ”مالوفات و مرغوبات کو چھڑا کر امت کو مجاہدہ کی لائن پر ڈالنا۔ جو شخص گھر بار ہی نہ چھوڑ سکتا ہو وہ راہ جہاد پر کیوں کر قدم رکھتا ہے، مولوی صاحب میں نے بھی حضرت شیخ الہند کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔“

حاجی ترنگ زئی فضل واحد عابد، زاہد اور مشہور پیران طریقت تھے۔ ص ۱۸۱ حاجی صاحب کی پوری زندگی انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے وقف ہو گئی۔ ان کے فرزند فضل اکبر عرف بادشاہ گل تھے۔

اور یہ سب روحانی نسبت بھی رکھتے تھے۔ پھر حاجی صاحب ترنگ زئی کے خلیفہ فقیراے پی نے تو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے آزادی ہند ۱۹۴۷ء تک انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیتے تھے۔ بہر حال یہ ایک دور رس اور طویل المیعاد منصوبہ تھا۔ جس کے نتائج کے لئے حضرت نوح کی استقامت اور حضرت ایوب کا صبر درکار تھا۔ وہی اس عوام و خواص کی ضروری بنیادی تعلیم کے ذریعہ ان کی صحیح تربیت کا ایسا تعمیری منصوبہ تھا جو قوم کے لئے ناگزیر تھا۔ بقول مہر صاحب اس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت تباہ کن کوئی نہیں ہو سکتی۔ جس کے عوام پیش نظر مقاصد کی تربیت سے کام لے رہے ہوں۔ دیباچوں کا پانی نہروں کے ذریعہ کھیتوں میں پہنچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار

کے انبار فراہم کر دیتی ہیں۔ لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کر لے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا۔

بہر حال حضرت شیخ الہند اپنے منصوبہ کے مطابق آہستہ رفتار دیا کی طرح اپنے ساحل مقصد کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک دم جنگ عظیم کے سیلاب شدید نے میدان عمل میں ہلچل پیدا کر دی۔ ایک طرف انگریز و فرانسیسی وغیرہ میدان جنگ میں کود پڑے دوسری طرف ترکی خلافت نے جرمنی کا ساتھ دیدیا۔ شیخ کا ہیما نہ صبر جھلک پڑا۔ وہ مجبور ہو گئے کہ جس طرح بھی ہو سکے انگریزوں کی فتح کے درمیان مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیئے جائیں اور ترکوں کے لئے اس سیلاب عظیم سے بچانے کے لئے پشتے باندھ دیئے جائیں۔

چوں کہ یہ دور بقول قاضی عبدالغفار ۱۹۱۲ء نصف آخر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہت سی بہت مصیبتیں لے کر آیا۔ اور عام فضا میں بہت سی بجلیاں ان کے سروں پر چمکی یہ ۱۹۱۳ء کی شورش کا پیش خیمہ تھا۔

طرابلس میں اطالویوں اور عربوں کی شورش جو دول مغرب کے اشارہ پر شروع ہوئی۔ ترکوں کی کشمکش ختم نہ ہونے پائی تھی اگر جنگ بلقان کے شعلوں نے خود ترکی کو گھیر لیا۔ امراء کی غدار یوں سے ایڈرپالوویل کو دشمنوں نے فتح کر لیا اور خود قسطنطنیہ بلقانی فوج کی زد میں آگیا۔ شاہ یونان نے بہ آواز دہل صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا اور سینٹ پیٹرس برگ میں مسجد امسا صوفیہ پر صلیب نصب کرنے کی تمنائیں پرورش پانے لگیں۔

وزیر اعظم برطانیہ نے سالونیکا کی تسخیر پر اظہار مسرت و شادمانی فرمایا۔ اور کہا کہ یہی وہ دروازہ ہے جس سے مسیحیت یورپ میں داخل ہوئی تھی ان واقعات نے مسلم خوابیدہ کو اکٹھا کر بٹھا دیا۔ مولانا محمد علی نے ہمدرد کامریڈ کے ذریعہ زبردست تحریک پیدا کر دی اور ترکی کے لئے ایک طبی وفد کی تجویز ہوئی اور ڈاکٹر انصاری دمرید شیخ الہند کی شرکت نے اس کو

کی شرکت نے اس کو مکمل کیا۔ و حیات اجل ص ۱۳) اسی ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند نے اپنے معتمد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو دہلی پہنچا کر نظارتہ المعارف القرآنیہ کی درسگاہ قائم کی جو شیخ کے تحریک جہاد کی ایک کڑی تھا۔ پھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کو کابل بھیج دیا کہ وہ امیر امان اللہ خاں کو آزاد کی ہند کے لئے تیار کریں اور ایک انجن حدام خلق بنام جنود اللہ بنائی اور ایک ہندوستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی امیر صاحب سے اجازت چاہی برطانوی سفیر کی مخالفت سے اجازت نہ ملی دچٹان ستمبر ۱۹۱۵ء اور دوسری طرف سرحد باغستان میں اپنے معتقدوں کے ذریعہ جہاد کا آغاز بھی کر دیا اور بقول شیخ مدنی ۱۷۰۰ انگریزوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں اور انگریز فوج سے ہتھیار اور رسد و مال غنیمت کے طور پر حاصل کرتے رہے و نقش حیات) پھر جو کچھ ہوا وہ نوشتہ تقدیر تھا۔

البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شیخ کا اس وقت کا یہ اقدام ملکی و بین الاقوامی حالات کے لحاظ بر محل اقدام تھا، یا صرف ایک عاجلانہ جذباتی فیصلہ تھا۔ شیخ الہند کا یہ منصوبہ بقول مہر صاحب جو ترکی، جرمنی مشن کے ذریعہ مولانا برکت اللہ اور راجہ ہندیر پر تاپ کے اشتراک سے رو بہ عمل لایا جاتا امیر حبیب اللہ کی فطری کمزوری اور برطانوی سامراج کے حرص و طمع کے جال میں گرفتاری اس منصوبہ کے لئے سدراہ نہ بنتی اور افغانستان انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو شاید نقشہ ہی کچھ اور ہوتا کیوں کہ اس وقت ہندوستان میں کل برطانوی فوجی طاقت گیارہ ہزار ۱۱۰۰۰ سے پندرہ ۱۵۰۰۰ ہزار سے زائد نہ تھی۔ اور حکومت برطانیہ ان معدودے چند گنتی کے فوجیوں کو ورویاں بدل بدل کر پورے ہندوستان میں گشت کرا کے یہاں کے لوگوں پر اپنا رعب جمائے ہوئے تھی۔

اگر افغانوں اور یاغستانیوں کو وافر اسلحہ مل جائے تو معاملہ ہی

کچھ اور ہوتا لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا کہ ابھی ہندوستان کی آزادی کے لئے قدرت کی طرف سے کچھ اور مراحل درپیش تھے جس سے گزرنا باقی تھا۔ پھر یہاں بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شیخ کی تحریک کے دور میں گاندھی جی عدم تشدد و سببہ گروہ کا حربہ بروئے کار نہ آسکا تھا اور کانگریس کی جو کوششیں اس وقت ہو رہی تھیں ان سے کامیابی کی توقعات موہوم تھیں کیوں کہ برطانوی ڈپلومیسی برہمنوں کی جدوجہد کو ایک لمحہ میں خاک میں ملا دیتی تھی اس لئے شیخ نے اس وقت جو اقدام فرمایا وہ نہایت موزوں و مناسب موقع پر کیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی بدقسمتی نے فرنگی حکومت کی عمر کو اور درازی دیدی بہر حال ولی اللہ سلسلہ کی یہ آخری کڑی حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد پر اختتام پذیر ہوئی۔ اور مالٹا سے واپسی پر آپ نے اپنی حکمت عملی بدل دی

مالٹا کے بعد ۱۹۲۲ء شیخ کی حکمت عملی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا کی چار سال نظر بندی کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو نہ اب وہ زمین کھٹی اور نہ وہ آسمان ہندوستان کیا پورے عالم کی سیاست کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ اتحادی طاقتوں د جس کا سربراہ برطانیہ عظمیٰ ہی تھا نے ترکی و جرمنی کو شکست دیکر اپنی طاقت و برتری کا پرچم اقوام عالم پر ہرا دیا تھا اور مشرقی اقوام پر اپنا پنجد پہلے سے زیادہ مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔

ترکی خلافت جو مسلمانان عالم کو کسی حد تک ایک تنظیم سے وابستہ کرتے ہوئے تھی اس خلافت کی چاک ہو جانے سے مسلمانان پارہ پارہ ہو چکے تھے سلسلہ ملت کی وہ اجتماعی زنجیر جو سب کو جوڑے رکھتی تھی وہی ٹوٹ چکی تھی ولی اللہی تحریک نے ہر خطرناک موقع پر امت کے اس اجتماعی رشتہ کو قائم و برقرار رکھنے کی سعی کی تھی جیسا کہ جنگ بلقان کے موقع پر شیخ نے

دارالعلوم کو بند کر کے ترکوں کے لئے چندہ کیا۔ اس سے پہلے ان کے استاد مولانا
نالوتویؒ نے بھی ایسا ہی قدم اٹھایا تھا۔ بہر حال ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء مالٹا سے ہندوستان
میں آکر ولی اللہی جماعت کے چوتھے امام ہونے کے لحاظ سے شیخ کو اپنے موقف پر غور
کرنا اور پچھلی حکمت عملی کو تبدیل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مجاہدین اسلام کے
اس آخری مرد مجاہد نے اس کو محسوس کیا کہ ولی اللہی تحریک کے مطابق مغربی
سامراج سے ٹکر لینے کا فریضہ دینی اعتبار سے مسلمانوں پر عائد ہوتا تھا اس لئے
آزادی ہند کا سارا بوجھ اب تک تنہا ولی اللہی جماعت نے اپنے سر لے لیا تھا اور
ایک صدی سے زائد مدت تک تنہا اب تک راہ جہاد کی تمام قربانیوں میں
مسلمان ہی پیش پیش رہے اور قائدانہ کردار ادا کرتے رہے۔ اب حالات کا تقاضا
تھا کہ برادران وطن کو اس کے اندر شریک کیا جائے اور اس شرعی فریضہ کی
انجام دہی میں شرعی احکامات کی روشنی میں ان کے ساتھ اشتراک کیا جائے۔ موجود
حالات میں صرف مسلمان یکے تنہا برطانوی سامراج سے نمٹ سکتے۔ برطانوی سامراج
نے اپنی ڈپلومیسی کے ماتحت مسلمان، مسلمان اور مسلمان و ہندو کے درمیان
ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس ملک
میں مشترکہ جماعت بن کر گورنمنٹ سے ملازماتی حقوق کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی
تھی اور حکومت کے پنجے سے باہر نکل آئی تھی۔ چوں کہ کانگریس کی تشکیل ۱۸۸۶ء
میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے دوست مسٹر ہیوم کے مشورہ سے ہوئی
تھی جس کا مقصد راعی و رعایا کے درمیان نظام حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں
سے صرف مطلع کرنا تھا لیکن کانگریس نے ابتدا ہی سے ہندوستان کے مختلف
و متضاد عناصر کو قومیت کے نقطہ پر اکٹھا کرنا اپنا نصب العین قرار دے رکھا
تھا۔ اس لئے یہ نصب العین برطانوی سامراج کی ڈپلومیسی سے ٹکراتا تھا چنانچہ
تھوڑے ہی دن بعد گورنمنٹ نے اپنی خود ساختہ جماعت سے آنکھیں پھیر لیں
کانگریس کو اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے ملک کے مختلف فرقوں کو ایک

مشرکہ پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا مسئلہ سامنے آیا نظر ہے مسلمان جواب تک راہ حریت میں قاتلانہ کردار ادا کرتے چلے آ رہے تھے ان کی شرکت کے بغیر کانگریس قومی جماعت نہیں بن سکتی تھی اس لئے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کا سوال پیدا ہوا، سر سید احمد خاں جو برطانیہ کی ڈپلومیسی کے حامی بن کر مسلمانوں کی قیادت کے لئے آگے بڑھ رہے تھے سب سے پہلے انھوں نے کانگریس کی مخالفت کی یہیں سے مسلم سیاست میں پہلا نقطہ اختلاف پیدا ہوا۔ اس لئے کہ علماء کی ایک جماعت نے جس کے سربراہ مولانا رشید احمد گنگوہی تھے، کانگریس میں شرکت کا فتویٰ دیدیا تھا اس لئے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے کا برطانوی سیاست کا یہ پہلا آزمودہ تیر تھا جو ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اب اس نے اپنے ترکش میں سے دوسرا تیر نکالا اور گورنر لورڈ رینلڈ سرائٹونی میکڈونلڈ نے ۱۹۰۰ء میں ایک گشتی حکم ہندی میں درخواستیں دینے اور ان کو قبول کرنے کا جاری کر کے بقول نہرواردو ہندی کا سدرا بہار فتنہ پیدا کر دیا۔ جس نے ہندو مسلم الگ الگ قومیت کے خیال کی داغ بیل ڈال دی اس کے بعد جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کرانے میں حکومت کو دیر نہ لگی ۱۹۰۶ء میں ایک طرف سر آغا خان کی قیادت میں مسلم لیگ اور دوسری طرف ڈاکٹر مونچے کی سربراہی میں مہا سبھا کے ذریعہ شملہ کی بریلی چوٹیوں سے فرقہ دارانہ سرگرمیوں کو ہوا دی گئی جوں جوں ہندوستانی سیاست آگے بڑھتی گئی بقول اکبر الہ آبادی کے نسخہ گاونڈ بان پلایا جاتا رہا۔ چنانچہ حضرت شیخ جو فرنگی سامراج کی سیاست کے نبض شناس تھے انھوں نے محسوس فرمایا کہ برطانیہ کی جاہلانہ طاقت سے مقابلہ اب طاقت سے نہیں کیا جاسکتا اس لئے حضورؐ کی مکی زندگی سے عدم تشدد کے حربہ کے استعمال کرنے کی تصدیق فرمادی اور برطانوی سیاست کی تفرقہ پر وازی کے جواب میں تمام فرقوں میں اتحاد کی طرف قدم بڑھایا۔ چنانچہ مالٹا آنے کے بعد سب سے پہلے اتحاد بین المسلمین کی طرف قدم اٹھایا اور خود علی گڑھ پہنچ کر اس سیاسی خلیج کو پاٹنے کی

کوشش کی جس نے مسلمانوں میں دو قسم قدیم و جدید خیال پیدا کر کے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اپنے خطبہ صدارت ۲۹ / اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ارشاد فرمایا کہ اے نوہمالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں و کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ، کا رشتہ جوڑا۔ حضرت شیخ کی ملک و ملت کی دل سوزی، ویتابی اور ان کی قلبی تڑپ کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت کا یہ خطبہ ان کی آخری عمر کا ہے۔

”میں نے اس پیرائے سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور، اور ذکر اللہ کی روشنی چمک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا را جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں میں خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا حالانکہ ان کو تو سب سے پہلے جانتا چاہئے کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قہرانہ انتقام ہے (خطبہ صدارت)

پھر شیخ نے اسلامی اتحاد کے بعد دوسرا قدم برادرانِ وطن کی طرف بڑھایا اور جمعیتہ العلماء کے اجلاسِ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں پیغامِ مرض الموت کی حالت میں ارسال فرمایا کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی کثیر التعداد قوم (ہندوؤں) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں معین بنا دیا ہے۔ اور اس دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کو بہت مفید و منتج سمجھتا ہوں۔

حضرت شیخ جب تشریف لائے تو ملک میں علی برادران اور مولانا

عبدالباری فرنگی محلی کے ذریعہ خلافت تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہمارے نزدیک
ہندوستان کی قومی تاریخ کا سب سے زیادہ پُر بہار و خوش گوار دور خلافت
کا زمانہ تھا۔ حضرت شیخ کی روحانیت و شہرت سے ہندو مسلم شانہ بشانہ ملا کر فرنگی
سامراج کے خلاف نبرہ اُڑا ہو گئے۔ حضرت شیخ ہی کی ایمان پر کاندھن جی کو میدان سیاست
میں لا کر کھڑا کیا گیا۔ اور قومی لیڈر کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ اور مسلمانوں کے
مصارف سے پورے ملک کا دورہ کرایا گیا۔ جمیعتہ العلماء ہند ۱۹۱۹ء میں اپنے
قیام کے ساتھ کانگریس سے اشتراک کا فیصلہ کر کے ہندوستانی سیاست میں سرگرمی
پیدا کر دی۔ کانگریس کے ساتھ اشتراک اور کاندھن جی کے انوکھے حربہ ستیہ گرہ سے
فرنگی سامراج بوکھلا اٹھا اور اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکال پھینکا شدھی
سنگٹھن کے ذریعہ تار پیڈ و مارا اور آزادی ہند کو ربع صدی پیچھے ڈھکیل دیا۔
بہر حال خلافت کے اس روحانی بابرکت دور کے علاوہ ہندو مسلم کشیدگی کو حکومت
برابر بڑھاتی رہی اور پھر یہ سدا بہار فتنہ پھلتا پھولتا رہا۔ اس کے بعد دونوں
قوموں میں قومیت کی ایسی چنگاری سلگائی گئی جس نے خرمین اتحاد کو جلا کر خاکستر
بنادیا۔ پھر ملک کے ٹھوارہ ۱۹۴۷ء میں برطانوی سامراج کی قہربانی نے ملتِ اسلامیہ
کو تین تیرہ کر دیا۔ اور ایک ایسی خلیج پیدا کر دی کہ ایک صدی تک اس کا پاٹنا
مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ فرنگی سامراج کا یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس
کے ذریعہ وہ ایشیاء کو نبرعم خود قیامت تک اقتصادی غلامی میں رکھنا چاہتا ہے
جس کو لسان العصر اکبر الہ آبادی نے نصف صدی پیشتر بیاں کیا تھا۔

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیاء تک

شیخ الہند کا سانحہ ارتحال ۱۹۲۱ء

حضرت شیخ کا علی گڑھ کی طرف آپ کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ جو سفر

آخرت سے پہلے جامعہ ملیہ کی تاسیس کے لئے اس عالم میں ہوا تھا کہ بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ دران کا قلب ان کے قد کی طرح بلکہ پورا وجود اپنے محبوب حقیقی کے آگے جھک چکا تھا، جسم کے چراغ کا تیل چل چکا تھا اس چراغ کی طرح جو خاموش ہونے سے پہلے بھرپور اٹھتا ہے وہ آخری بار بھڑکا اور آخری سنبھالا کر اپنا آخری پیغام قوم و ملت کے نام سنانے کے لئے شیخ اٹھ کھڑے ہوئے شیخ کی ذات با برکات وہ تھی جن کی پوری زندگی قرآن و حدیث کے انوار و برکات پھیلانے کے درمیان گزری۔ جنھوں نے اپنے آقائے ولی نعمت آقائے دو جہاں سرور مکاں کے مشکوہ نبوت سے خدا کی معرفت و محبت اور مخلوق خدا کے ساتھ سچی خدمت و شفقت کی روشنی حاصل کی تھی اور وہ مرد مجاہد اپنی ملت کی سرفرازی سر بلندی ملک کی حریت و آزادی کے لئے ظالموں کے خلاف مظلوموں کی حمایت میں سربلک میدان میں اترا تھا جب کہ باشندگان ملک میں سے کوئی دوسرا اس کے ساتھ ہم سفر نہ تھا۔ جس معرکہ حق میں عین نوجوانی میں قدم رکھا تھا آخر دم تک جہاد اور کبھی پشت نہیں دکھائی۔ وہ کچھلے مجاہدین کی آخری یادگار تھے جنھوں نے اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی اور کبھی باطل کے آگے نہ جھکا وہ راہ صداقت کے ایسے مسافر تھے جن کی منزل مقصود رضائے الہی اور اسی راہ میں سینہ سپر ہو کر امتحانات کے سنگلاخ میدانوں سے گذرتے ہوئے آزمائشوں کی وادیوں کو طے کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے رہے اور کبھی پیچھے نہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ زار و نزار روح جو برطانیہ کی قوت قاہرہ سے کبھی مرعوب نہ ہو سکی تھی وہ ضعیف و نحیف جسم جو مسلمانان عالم اور باشندگان ہند کے لئے فرنگی سامراج کی غلامی سے آزادی کے لئے کبھی نہ تھکا تھا وہ مصلح ملک و ملت جس کی ہڈیاں اپنوں و پرائیوٹوں کے غم میں پگھل چکی تھیں۔ جس نے اپنے آقا کی اتباع میں اپنوں پرائیوٹوں کا غم کھایا وہ صاحب عزیمت انسان جس کے دست و بازو آدھی صدی تک دشمن کو ہزیمت

دینے کے لئے متحرک رہے تھے وہ روح اب مضمحل وہ جسم اب بے جان اور وہ دست و بازو اب شل ہو چکے تھے۔

اگرچہ اس بوڑھے مجاہد کا حوصلہ اب بھی جواں تھا اور جہاد کا ولولہ اب بھی تازہ تھا لیکن قوائے ظاہری جواب دے چکے تھے اس نے عفوان شباب سے اپنی بے سرو سامانی اور رفتار کار کی شکستہ حالی کی پروا نہ کرتے ہوئے برطانوی حکومت کی قوت قاہرہ سے مقابلہ کی ٹھانی تھی اور اپنے منصوبہ کی کشتی کو طلاطم خیز موجوں اور ہلاکت خیز طوفانوں کے سمندر میں ڈال دیا تھا اور ایسی جاہلانہ قوت سے لوہا لینے کا عزم کیا تھا جو نمرود سے زیادہ طاقت و قوت اور فرعون سے زیادہ شان و شوکت اور قارون سے زیادہ مال و دولت کی مالک تھی۔ لیکن اس مست خدا فقیر کی نگاہ میں اس کی حیثیت چمچ کے پر کے برابر نہ تھی۔ شیخ کی ہستی اپنی بے نفسی و بے لوثی اور بے غرضی کی وجہ سے ایسی برگزیدہ ہستی تھی جس کے آگے اس کے کٹر دشمن برطانیہ نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ ایسی مسلمہ شخصیت تھی جس کی حق پسندی اس درجہ بلند و بالا تھی۔ جب علامہ شبلی کے حریفوں نے ان کی شخصیت پر تہمت کفر کا گردوغبار اڑایا تو علامہ نے شیخ کے فیصلہ پر اپنا سارا معاملہ رکھ دیا۔ وہ خدا کا سچا عاشق و شیدا تھا جس نے رضائے الہی میں خود کو فنا کر دیا اور شہرت و ناموری کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ اس کی تواضع و انکساری چھوٹوں کو بڑا اور ذرّوں کو مہر و ماہ بنا دیا۔ جو ذرّہ بھی اس کی خاک کف پا سے چھو گیا وہ کندن ہو گیا، اس کے عزم بلند اور ہمت عالی نے آخری سانس تک شکست کو قبول نہیں کیا اب اس حقیقی کے بارگاہ میں اس کا سر بلند جھک گیا جہاں ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوگا۔ جہاں ہر انسان کو اس کی نیک عملی کی جزا اور بد عملی کی سزا دی جائے گی۔

جب وہ اپنا دینی و ملی اور انسانی فریضہ انجام دیکر دربار الہی کی حاضری کے لئے تیار ہو گیا۔ تو اس کے آخری وقت کے مشتاقان جمال و کمال کا بیان ہے کہ

حضرت شیخ پرایک کرب، ایک بے چینی اور ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی کہ کبھی اس کروٹ اور کبھی اُس کروٹ پہلو بدلتے تھے۔ یہ حال دیکھانہ گیا پوچھنے والوں نے پوچھ ہی لیا تو اس مرد میدان و شہید تسلیم و رضا کی زبان حقیقت ترجمان یوں گویا ہوئی۔ عمر بھر کی تمنا اور آرزو یہی تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اسی معرکہ حق میں محمود کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس میدان میں بکھرے پڑے ہوتے۔ خدا کی راہ میں مارا جاتا پھر زندہ ہوتا پھر مارا جاتا پھر زندہ ہوتا پھر مارا جاتا پھر زندہ ہوتا۔ غرض اس عاشق خدا نے اپنے محبوب حقیقی سے لو لگاتے ہوئے ۱۹۲۱ء میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اپنے مخلص مرید ڈاکٹر انصاری کی کوکھ میں رہ کر ائے عالم جاوداں ہوا۔ اس عاشق خدا کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ دہلی و میرٹھ اور درمیان سیٹھنوں پر ہزار ہا اس کے معتقدوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ آخری نماز اس کے وطن کی اس سرزمین دیوبند، میں پڑھی گئی جہاں اس کا خمیر خاکی تیار ہوا تھا۔ اور ہزار ہا انسانوں کے، مجوم و اژدہام میں اپنے محبوب استاد اور شفیع مرتبی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پہلو میں سلا دیا گیا۔ شیخ نے اپنے معاصرین کی طرح زبان و قلم کو زیادہ تکلیف نہ دی۔ اور بہت زیادہ کتابیں نہ تصنیف کیں۔ لیکن اس کی آتش نفسی نے ایسے خصوصی شاگرد اور ایسے اصحاب کمال پیدا کئے جو اپنے وقت کے چاند سورج بن کر افق ہند پر چمکے ان میں ہر ایک اپنے شعبہ کا امام بنا۔ حضرت شیخ کا تقویٰ دطہارت حکیم الامت حضرت تھانویؒ میں ان کی ذہانت و فراست مولانا عبید اللہ سندھی مولانا منصور انصاری میں۔ ان کا تبحر علمی امام العصر انور شاہ کشمیری میں ان کی ریاضت و مجاہدہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی میں، ان کی تحریر و تقریر علامہ شبیر احمد عثمانی میں آپ کی حکمت و فقابت مفتی کفایت اللہ میں اور انکی قوت عمل مولانا عزیز گل میں جمع ہوئیں۔

یہ اس نظام شمسی کے روشنی و درخشاں ستارے تھے جنہوں نے آفاق عالم کو

اپنی روشنیوں سے منور کیا۔ جس طرح امام محمد قاسم نانوتوی کی علمی و عملی میراث شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حصہ میں آئی اسی طرح شیخ الہند کی مولانا مدنی نے فرنگی سامراج کو ایشیا سے بوریابستر باندھتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ لیکن برطانوی سامراج بھس میں چنگاری ڈال کر ایسا روانہ ہوا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ کے دھوئیں سے مشرق اب تک تیز و تار رہے۔ آزادی کا سورج ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کے افق پر خوں فشاں بن کر طلوع ہوا۔ اور فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں لاکھوں انسانوں کی نقشبوں کو خاک و خون میں لتھڑی ہوئی دیکھ کر ملک و ملت کا وہ سچا ہمدرد اپنے اکابر و اسلاف کی آخری نشانی د شیخ الاسلام مدنی، باچشم گریاں بادل بریاں اپنے حذر کے دربار میں ۱۹۵۶ء میں جا پہنچا۔ فغفرلہم اللہ مغفرۃ کاملہ اور تحریک شیخ الہند کا آخری مجاہد بھی سو گیا۔

نواب محی الدین خاں مراد آبادی قاضی ریاست بھوپال

ریاست بھوپال کے علماء و فضلاء کی پوری تاریخ ولی اللہی دعوت کی تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ جس سے ریاست آغاز سے ہی آخری دور تک وابستہ رہی چنانچہ حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد میں بھوپال کا بھی حصہ رہا جب شیخ نے مولانا سندھی کو دیوبند سے بھیج کر ۱۳۰۰ھ میں نظارۃ المعارف القرآنہ کے ذریعہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ربط پیدا کر کے ان کے اندر روح جہاد کو پھونکنا چاہا تو سب سے پہلے مالی تعاون دو سو روپیہ ماہانہ بھوپال سے کیا گیا۔ پھر نواب محی الدین خاں صاحب قاضی ریاست بھوپال کے واسطے سے نواب سلطان جہان بیگم قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہوئیں اس لئے حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ ارشد حضرت شیخ الہند سے قلبی عقیدت رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب شیخ سفر حجاز کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو سلطان جہاں بیگم بھوپال نے

اس کی استدعا کی کہ شیخ بھوپال کے راستہ سے بمبئی تشریف لے جائیں۔ تاکہ ریاست کو حضرت کی زیارت و خدمت کا موقع مل سکے۔ لیکن شیخ سیاسی مصلحت کے تحت انکار فرمایا۔ شیخ کی تحریک کے سلسلہ میں رازداری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے وقت سے پہلے اپنے منصوبہ سے ان ذمہ داروں کو بھی ظاہر نہ فرمایا جن سے آگے کام لیا جانا طے کیا تھا۔

تاریخ قضاۃ بھوپال میں نواب محی الدین خاں کے تذکرہ کو حضرت شیخ کی اس تحریک میں شرکت کی وجہ سے قصداً نظر انداز کیا گیا ہے اس لئے ہم نے ان کا مفصل تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے لیکن یہاں اجمالی تذکرہ کرنا چاہتے ہیں نواب محی الدین خاں کون تھے؟ وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں اقتدار سلطنت اور مال و دولت کے ساتھ ساتھ علم و فضل عرصہ سے چلے آ رہے تھے۔ وہ نواب حاجی رفیع الدین خاں کے پوتے تھے۔ جو ایک طرف نواب عظمت اللہ خاں صوبیدار اودھ کے پوتے تھے دوسری طرف شاہ ولی اللہ دہلوی کے براہ راست شاگرد اور اپنے وقت کے زبردست عالم و مصنف تھے۔ ان کے دو صاحبزادوں نواب شبیر علی نواب بشیر علی نے ۱۸۵۷ء میں آخری مغل شہنشاہ ظفر بادشاہ سے ربط پیدا کر کے مراد آباد میں ہنگامہ جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ کیا۔ اور آخر میں ایک بھائی شبیر علی مجرم بغاوت اقبال جرم پر پھانسی پر چڑھائے گئے نواب شبیر علی پنج گئے ان کے صاحبزادے نواب محی الدین خاں نے عالمانہ درویشانہ ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تحصیل و تکمیل کے لئے امام قاسم العلوم نانوتوی کی خدمت و فیض درجت میں پہنچے۔ حضرت شیخ الہند کے رفیق درس و خواجہ تاشس اور مخلص دوست رہے۔

قاضی محمد ایوب کے انتقال ۱۲۹۷ھ کے انتقال کے بعد جو ولی اللہی خاندان سے تھے، منصب قضاہ خالی تھا۔ اس کے لئے مولانا سراج الحق دیوبندی کو

مقرر کیا گیا۔ ۱۳۲۱ھ لیکن موصوف نے کچھ دن بعد اس سے کمال تقویٰ کی بنا پر انکار کر دیا۔ یہی مولانا سراج الحق ابو سعید بزمی کے جدا مجد ہیں جنہوں نے بھوپال کی سیاست میں زبردست حصہ لیا۔ پھر نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں وہ ریاست کے قاضی ہوئے (۱۳۲۲ھ) اور ایک دو سال تک بھوپال میں قیام رہا۔

جب حضرت شیخ الہند سفر حجاز کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو قاضی محی الدین اپنے استاد کے محبوب شاگرد و جانشین حضرت شیخ کو الوداع کہنے کے لئے بھی تشریف لے گئے اور حکیم محمد اسماعیل اجمیری کے مکان پر شیخ کے دوسرے مخلصوں کے ساتھ چند دن قیام کیا پھر شیخ نے عدل پہنچ کر ایک خصوصی کارڈ قاضی محی الدین خاں کے نام لکھا جس کے اندر اپنے متعلقین کے خیال رکھنے کو کہا گیا۔ درپورٹ رولٹ

جس سے رشتہ لگانگت کا ثبوت ملتا ہے۔ درپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ نے حجاز پہنچ کر اس تحریک میں قاضی صاحب کو شامل فرمایا۔ جس کے لئے مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کو خصوصیت سے بھوپال بھیجا گیا حضرت شیخ کا والا نامہ قاضی صاحب کے نام تھا جس کو دیکھ کر قاضی محی الدین خاں اس تحریک میں شریک ہو گئے بلکہ سرپرستی قبول فرمائی ریاست سے ایک سال کی رخصت لے کر ایسے گئے پھر بھوپال نہ پلے اور اس اہم جلیل القدر مقصد کے لئے ریاست کے منصب کو چھوڑ دیا اور اپنے وطن مالوف پہنچ کر پوری رازداری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ چنانچہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ہے ۱۰ جدہ کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے عبید اللہ نے حضرت مولانا کو جو خط لکھا ہے اس میں نواب محی الدین کا نام ہے یہ شخص اور قاضی محی الدین احمد خاں قاضی ریاست بھوپال ایک ہی ہیں مراد آباد دیوبند کے نواب شبیر علی کافر زند ہے۔ اس کو نواب محی الدین کہا جاتا ہے۔ وہ اور

مولانا محمود الحسن ہم سبق تھے۔ اس وقت سے اُن کے درمیان بڑی گہری دوستی ہے۔ ایم محمود الحسن کی باغیانہ سرگرمیوں سے اس کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ اور سازش جہاد کارکن تھا۔ جب مولانا مکہ روانہ ہوئے تھے تو ان کو رخصت کرنے بھی گئے تھے۔ بحوالہ تحریک ۷۹ء

چنانچہ اسی رپورٹ میں حکیم محمد اسماعیل اجمیری کے ذکر میں ہے کہ مولوی مرتضیٰ حسن، قاضی محی الدین آف بھوپال اور اس کی جماعت کے کچھ لوگ اس کے مکان پر کھڑے تھے (تحریک ۶۶ء)

اسی رپورٹ میں مزید تحریر ہے کہ پھر مولانا مرتضیٰ حسن اور مولانا محمد میاں جب حج سے واپس ہوئے تو ان دونوں نے بھوپال میں قیام کیا۔ باقی جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے بیان میں بڑی قوت سے کہا کہ وہ حکومت کے وفادار ہیں (تحریک ص ۱۱)

حضرت شیخ الہند کے نام جو ایک خط بغیر دستخط مورخہ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء اس کے اندر خط لکھنے والے غالباً محمد میاں ہوں گے، یہ بھی لکھا کہ قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سرپرستی قبول فرمائی جماعت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی اس کام کو باضابطہ بنانے کے لئے ایک سالہ رخصت لینے کا قصد فرما رہے ہیں (تحریک ص ۲۶۹)

اس خط کے آخر میں جو بہت طویل ہے یہ بھی لکھا ہے کہ قاضی صاحب حکیم صاحب، ڈاکٹر ذاکر صاحب رائے والے حضور کی مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں (تحریک ص ۲۲۷)

کمپنی کی رپورٹوں سے قاضی محی الدین خاں اپنے مخلص بزرگ رفیق کی تحریک کے ساتھ بدل و جاں مدد و معاون رہے۔ اور اس کے چلے جانے پر قاضی محمد حسن مراد آبادی کو بھوپال بلا لیا وہ بھی تحریک کے اہم رکن تھے۔ قاضی صاحب نے ۱۳۴۷ھ میں اپنے وطن مراد آباد میں گوشہ گناہی میں

انتقال فرمایا۔

قاضی محمد حسن مراد آبادی قاضی بھوپال

قاضی محمد حسن مراد آبادی کے مورث اعلیٰ قاضی شریعت اللہ مراد آبادی ابتداءً گندہ مکتب شریعت اکبر آباد ہوتے ہوئے پھر محکمہ العلوم سے علوم فقہ حکمت میں کمال حاصل کر کے مراد آباد سکونت پذیر ہوئے بعد ازاں کلکتہ پہنچے اور وہاں برطانوی حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ بنائے گئے۔ ان کے صاحب زادے حسن امام بھی حکومت کے وظیفہ دار رہے۔ قاضی محمد حسن کی ولادت یکم جنوری ۱۸۶۱ء ۱۲۵۶ھ ہے۔ (یکم جنوری ۱۸۶۱ء)

مولوی محمد حسن نے جو قاضی محمد حسن صاحب کے بزرگوار ہیں۔ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے ساتھ شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث کا درس لیا۔ قاضی صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی زیارت کی ہے حضرت نے ان کے لئے دعائے برکت دی تھی ان کے والد ماجد تصوف میں ایسے غرق ہوئے کہ قاضی صاحب کو تعلیم کی طرف توجہ نہ ہوئی والد ماجد کے انتقال کے بعد پورے گھر کا بوجھ آپ کے کاندھے پر آپرہا۔ پہلے کچھ دن ملازمت کی پھر تحصیل علمی کا شوق ہوا۔ رام پور و بریلی میں ابتدائی تحصیل کی پھر مولانا عبدالعزیز امرہوی دشاگرد مولانا عبدالحق خیر آبادی، سے معقولات کی تکمیل کر کے حضرت قطب عالم رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں سن ۱۳۱۲ھ ایسے ہی حاضر ہوئے کہ پھر ان کے ہی ہو کر رہ گئے حضرت کی ہمیشہ آپ کے ساتھ مرتباً نہ شفقت رہی۔ چنانچہ ایک بار حضرت نے فرمایا۔

مولوی محمد حسن نرا مولوی ہی نہیں ہے، سپاہی ہی ہے، منشی ہے۔ محاسب ہے وکیل ہے، زمیندار ہے۔ درزی ہے، باورچی ہے، پہلوان ہے اور حقیقت یہ کہ حضرت الاستاد مرحوم کی سبھی جامع شخصیت علماء میں بہت کم ملتی ہے حضرت گنگوہی کے ارشاد پر مدرسہ شاہی مراد آباد میں ۱۳۰۸ھ مدرس ہوئے

پھر گلاؤ کھٹی کے مدرسہ اسلامیہ میں پھر واپس مراد آباد ہو کر مدرسہ شاہی میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔

پھر جب قاضی محی الدین خاں سے ملاقات کے لئے بھوپال تشریف لائے اور نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست کی خدمت کے لئے مجبور کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے حکم سے مراد آباد میں ہوں۔ چنانچہ جب حضرت کو خط لکھا گیا تو قطب عالم نے لکھا کہ جب سرکار کا اصرار ہے تو وہیں رہ جاؤ۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے وہاں کوئی اچھا کالے۔ چنانچہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء سے مہتمم مدرسہ وقفیہ و واعظ شہر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ مدرسہ کی از سر نو تنظیم کر کے جامعہ احمدیہ کے نام سے موسوم کیا۔ پھر اس مدرسہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس علاقہ میں دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ بنا کہ جس سے بھوپال و بیرون بھوپال کے صد ہا تنگن کان علوم اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۱ء میں قاضی ریاست بن کر ۱۹۴۶ء تک اپنی خدمات مفوضہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا وہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ بہر حال قاضی صاحب حضرت گنگوہی کے مخلص مرید اور اچھے شاگرد ہونے کے اعتبار سے حضرت شیخ الہند اور ان کی تحریک کے خفیہ طور پر مؤید تھے چنانچہ رولٹ ایکٹ کی کمیٹی کی رپورٹ میں ہے کہ ”محمد حسن آف مراد آباد جو دربار کی نظر میں میجر جنرل ہے۔ بھوپال اسٹیٹ کونسل کا ممبر ہے مولانا محمود الحسن کی جماعت کا سربراہ اور دہلی اور ان کے وابستگان میں سے ہے۔ وہ دیوبند کمیٹی کا ممبر ہے۔ دتھریک شیخ الہند“

(ص ۶۵)

مولانا محمد فاضل پھلتی

مولانا محمد فاضل پھلتی جو ولی اللہی خاں وارہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور

ایک عرصہ تک ریاست میں بسلسلہ تدریس قیام رہا۔ حضرت شیخ الہند کے رفیق درس اور حضرت الامام نانوتوی کے شاگرد اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء میں سے تھے۔ جن کو سند فراغ ۱۲۸۹ھ میں دی گئی تھی۔ ان کے رفقاء میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا عبداللہ انصاری، والد ماجد مولانا منصور انصاری، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا احمد حسن امروہی تھے۔ مولانا کے والد ماجد شیخ عبدالماجد تھے۔ قصبہ پھلت جو حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت گاہ ہے، میں مولانا فاضل ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور بعد تکمیل بھوپال تشریف لائے۔ مدارالمہام کے مدرسہ جمالیہ میں درس دیا پھر نواب سلطان بیگم نے اپنے صاحب زادگان عبید اللہ خاں، لقر اللہ خاں کا رتالیق مقرر کیا۔ پھر وطن چلے گئے۔ دوبارہ پھر بھوپال تشریف نہ لائے منصب مقرر ہوا اور پھلت میں ۱۳۳۹ھ میں انتقال ہوا۔

حضرت شیخ الہند سے بے حد خلوص و محبت تھی شیخ ان سے ملنے کے لئے سال میں ایک دو بار ضرور آتے اور مولانا فاضل ایسے بزرگ سا تھی سے ملنے دیوبند پہنچتے۔ شیخ کے محرم راز، اور تحریک کے ہمدرد تھے ان کے علاوہ ریاست میں مولانا سعید الدین رام پوری دیوبند کے قدیمی فارغ التحصیل علماء میں تھے جن کو ریاست بھوپال کی بلند پایہ خدمات کا اعزاز حاصل ہوا۔ ابتدائی حالات سے ترقی کر کے نائب ناظم بن کر معین المہام مقرر ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم ان پر پورا اعتماد رکھتی تھیں۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ وہ آسمان شہرت بن کر چمکنے لگا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی مفتی عزیز الرحمن صاحب، مولانا حبیب الرحمن عثمانی ان کے ہم درس تھے۔ شیخ الہند سے سلسلہ تلمذ رکھتے تھے اور ریاست میں اپنے ملازماتی فرائض کے ساتھ ہمیشہ درس کا سلسلہ جاری رکھے تھے۔ بھوپال میں

۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

ایسے ہی مولانا عبدالرحمن سہواری جو حضرت مولانا احمد حسن امروہی سے تلمذ خصوصی اور عربی کے بلند پایہ کے شاعر تھے۔ ان کے نعتیہ قصائد کو دیکھ کر دور جاہلیت کے شعراء کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ابتداً مدرسہ جہانگیرہ میں مدرس ہوئے۔ آخر میں جامعہ احمدیہ کے مہتمم ہو کر ۱۹۳۲ء بھوپال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ بھی حضرت شیخ الہند کے خاص معتقدین میں سے تھے اور تحریک شیخ الہند سے اندرونی طور پر وابستہ تھے۔ آپ کے بھتیجے مولانا حفظ الرحمن ہندوستانی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔ ان کے علاوہ بھوپال شیخ کے معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا جس کا ذکر طول کا باعث ہوگا۔ آخر میں ایک ایسی شخصیت کے تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔ جنہوں نے خود کو گمنام رکھ کر بھوپال میں زبردست دینی و اصلاحی خدمات انجام دیں

مولانا عبدالرشید صاحب مسکین

مولانا عبدالرشید جو مولانا مسکین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مشہور قدوائی خاندان سے تھے۔ وہ اپنے بڑے گاؤں دبارہ بنکی (میں ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ والدین کا سایہ پیدائش سے ہی ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس لئے ان کے بڑے بھائی عبدالرؤف صاحب نے تربیت فرمائی۔ مڈل تک تعلیم حاصل کی ۱۹۱۲ء میں بھوپال تشریف لائے اور پختہ عمری کے باوجود قاضی محمد یحییٰ کے دامن کو اس قدر مضبوطی سے پکڑا کہ عمر بھر نہ چھوڑا، انھیں کا یہ لقب دیا ہوا ہے۔ مدرسہ سلیمانہ میں تدریسی زندگی گزاری، راقم الحروف کو حروف شناسی کی سعادت اسی بزرگ ہستی سے حاصل ہوئی عربی تعلیم کا آغاز بھی اسی مشفق استاد سے ہوا۔ وہ صرف ایک دینی معلم ہی نہ تھے بلکہ

ملت کے نو بہاولوں کے شفیق مربی اور امت کے بہادر مصلح بھی تھے قدیم بھوپال کی دینی و اصلاحی و معاشرتی خدمات میں اس بزرگ ہستی کا نام سرفہرست ہے۔ انجمن ہدایت الاسلام کے ذریعہ شہر میں سا ہائے سال تک بدعات و منکرات کے خلاف جہاد فرماتے رہے گاؤں گاؤں پہونچکر دینی مکاتیب قائم کرائے۔ بھوپال میں تبلیغی جماعت اور جمعۃ العلماء کے اصل بانی وہی ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کو الہامی جماعتیں کہتے تھے۔ وہ علماء بھوپال میں پہلے عالم تھے جو ہند و بیرون ہند عالم اسلام کے اخبار و کوائف سے باخبر رہتے اور مسلمان ہند کی تحریکات سے دلچسپی لیتے۔ درحقیقت بے نفسی و بے لوثی اور گناہی کے ساتھ ملت کی گوں ناگوں خدمات انجام دیہی کا جذبہ اور ولولہ ملا تھا حضرت شیخ الہند کی سچی ارادت اس وقت استاد مرحوم کے اس پردہ کو اٹھانے کی سعادت ان کے ایک ادنیٰ شاگرد کو حاصل ہو رہی ہے کہ وہ باقاعدہ حضرت شیخ الہند کے مخلص مرید تھے۔ ہمیشہ دیسی اشیاء استعمال کرتے کھدر پہنتے، فرنگی سامراج سے دلی نفرت تھی وہ عمر بھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں سرگرم رہے اور حیرت انگیز مجاہدات کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے ہوئے ۲ جنوری ۱۲۵۷ھ کو اپنے خدا کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ رحمہ اللہ

علامہ سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی قصبہ بہار شریف کے خاندان سادات سے وابستہ تھے۔ ان کے والد ماجد حکیم ابوالحسن اور جدِ مجد حکیم محمدی اس علاقہ کے معروف و مشہور حکماء میں سے تھے۔ سید صاحب کی ولادت ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ ابونجیب کینت اور انیس الحسن نام رکھا گیا۔ لیکن گھریلو نام سید سلیمان سے شہرت پائی۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی ابوجیب

سے حاصل کی جو حضرت شاہ ابوالاحمد مجددی بھوپالی کے خلیفہ تھے۔ پھر بھوپواری شریف میں شاہ محی الدین اور پھر مدرسہ امدادیہ در بھنگہ میں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری سے تحصیل علم کر کے ندوۃ العلماء میں تکمیل کی۔ وہاں کے کامل اساتذہ کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی کے دامن کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے ان کی تعلیمی زندگی ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۶ء تک رہی دور تعلیمی کے بعد اندوہ کی پھر اہلال جیسے وسیع علمی پرچوں کی کامیاب ادارت کی وجہ سے ملک میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر اپنے استاد کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین کی تشکیل کر کے علمی و تحقیقی معارف کے مقالات و شذرات نے شہرت کو چار چاند لگائے۔ اگرچہ سید صاحب کی زندگی کا اصلی عنوان تصنیف و تالیف رہا۔ لیکن وقت کی سیاست نے بھی ان کے دامن کو اپنی طرف کھینچا اور جمیعتہ العلماء ۱۹۱۷ء اور خلافت ۱۹۲۳ء کے مجالس کی صدارت کا اعزاز بھی ان کو حاصل رہا۔ ان کی کتاب زندگی نے اس وقت نیا ورق الاطاب کہ انھوں نے اپنی مقبولیت کے باوجود روحانی تکمیل کے لئے حضرت حکیم الامت سقانی کی بارگاہ ۱۹۳۷ء میں حاضر ہو کر بیعت کی اور مدارج دینی کی تکمیل فرما کے خلافت سے مشرف ہوئے۔

ریاست بھوپال کی خوش قسمت ہے کہ نواب صاحب بھوپال کی دعوت اور اصرار پر ۱۹۴۶ء میں یہاں قاضی القضاۃ اور امیر الجامعہ بن کر تشریف لائے اور یہاں کے مدارس دینیہ سلیمانیہ و احمدیہ کا اصلاحی فریضہ انجام دیا لیکن چوں کہ یہ دور ملک کے سیاسی احوال کے اعتبار سے نہایت کشمکش کا دور تھا لیگ اور کانگریس کی ادھیڑ بن نے پورے ملک میں غیر یقینی حالات پیدا کر دیئے تھے اس لئے خاطر خواہ نتائج نہ حاصل ہو سکے لیکن بھوپال سید صاحب کے فیوض ظاہری و باطنی سے مستفید ہوا۔ آخر تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے سیلاب نے سید صاحب کو پاکستان پہنچا دیا

عوام و خواص نے استقبال کیا۔ لیکن حکومت پاکستان نے ان کے شایان شان معاملہ نہ کیا۔ بالآخر علم و عمل، تحقیق و تصنیف کا آفتاب جو صوبہ بہار سے طلوع ہوا اور پورے ملک کو اپنی علمی، تصنیفی شعاعوں سے منور کرتا رہا کراچی کے افق پر ۱۹۵۳ء میں غروب ہو گیا

مابقہ ریاست بھوپال کے وہ خاتم القضاۃ تھے۔ لیکن یہاں جس اعتبار سے سید صاحب کا تذکرہ لکھا گیا ہے کہ تحریک شیخ الہند کے ایک رکن تھے۔ جیسا کہ رولٹ کمیٹی کے رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ رپورٹ میں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی حضرت شیخ سے کتنی عقیدت تھی اس کا اندازہ اس گفتگو سے کیا جاسکتا ہے جو لندن میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے نوری سعید پاشا خداداد پاشا سے کی تھی

”میں نے کہا کہ مسلمان ہندو یہ تصور کر کے عرب کی مقدس سرزمین بھی ان کے لئے امن و امان کا گھر نہیں غمزدہ ہیں وہ حاجیوں سے یہ سن کر کہ وہاں انگریز فوج برسر اقتدار ہے خون کے آنسو روتے ہیں۔ ہندوستان کے مقدس ترین عالم علمائے ہند کے مسلم شیخ اور ہمارے ملک کے پیشوا ملت و امام شریعت مولانا محمود الحسن صاحب نے ہجرت کر کے بلاد الامین میں پناہ اختیار کی۔ وہ سیاست و پالیٹکس کے نام سے بھی آگاہ نہیں وہ کفرستان سے بھاگ کر نور و ایمان کے مسکن میں گئے۔ لیکن وہاں بھی اکھیں پناہ نہ ملی یہ اس بلاد الحرام کی تحقیر نہیں جو عاصی و مجرم کا بھی حامی ہے لیکن حامی نہیں تو اس مسلمان کے لئے جو ملت بیضا کا ہادی اور شریعت عزا کا شارح ہے ہمارے صوبہ کی کونسل میں جب ان کی قید کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیوں کر کسی عرب حکومت کی خود مختاری کا مسلمانوں کو یقین آئے۔ خداداد پاشا سے ابھی اس کے متعلق کچھ سنا ہے نوری سعید نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ اور

مولانا کا نام ایک پرچہ پر لکھ لیا اس کے بعد شکریہ ادا کیا، دفرنگ،

مولانا عبدالحلیم صدیقی بھوپالی

مولانا عبدالحلیم صدیقی مشہور علامہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے خاندان سے تھے جن کو حکومت شرقیہ نے جوپور نے ملک العلماء کا خطاب دیا تھا۔ جوپور کے بعد یہ خاندان نواح لکھنؤ میں آباد ہوا۔ پھر حکومت اصفیہ لکھنؤ کی افراتفری کے بعد میں مولانا کے اعزہ بھوپال تشریف لائے اور مولانا کی ولادت تقریباً ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ ابتداً حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے جس کا سلسلہ تراویح میں عمر بھر جاری رہا۔ بڑے جید حافظ تھے اور پردہ لہجہ میں تلاوت کرتے تھے اس کے بعد مدرسہ سلیمانہ و جامعہ احمدیہ میں تحصیل فرمائی۔ بھوپال کے مشہور مصنف علامہ ذوالفقار احمد تقویٰ اور مولانا عبد الرحمن سہواروی سے عربی زبان و ادب کی تکمیل کی قاضی یحییٰ صاحب اور دیگر کامل علماء سے تکمیل فرمائی۔ اردو و عربی میں شعر کہتے تھے اور ذکا تخلص تھا۔ ان کی علمی وادبی قابلیت کا جب شہرہ باہر پہونچا تو کانپور میں مدرسہ الہیات میں مدعو کیا گیا۔ جہاں انھوں نے علامہ آزاد سبجانی بانی تحریک ربانی کی معیت میں طلبہ کو فیض پہونچایا۔ پھر ندوۃ العلماء کی نظامت کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہوا۔ مسجد کانپور کے حادثہ ۱۹۱۳ء نے مسلمانان ہند نے برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت کی دعوت دی تھی اس لئے مولانا بھی اپنی آزاد مزاجی و حریت پسندی کی بنا پر میدان سیاست میں کود پڑے۔ خلافتی تحریک میں گرم جوشی سے حصہ لیا۔ پھر ۱۹۱۹ء کے بعد جمیعتہ العلماء ہند کے ناظم ہوئے۔ جس پر قید و بند کی مسلسل دार و گیر پر استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ حضرت شیخ الہند پھر حضرت شیخ مدنی قدس کے سر سے ایسے وابستہ

ہوئے کہ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء عوامی خدمت میں بے نفسی و بے لوثی کے
ساتھ لگے رہے۔ آخر وہ مرد مجاہد فخر ملک و ملت، نازش بھوپال اپنے عہد و
پیمان خدمت کو پورا کرتا ہوا اپنے خدا سے جا ملے۔

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں
اک معرکہ دار و رسن ہم نے بنایا

تاریخ آزادی ہند میں بھوپال کا حصہ

جس کے اندر آزاد فضا اور کھلی آب و ہوا میں ریاست کی ابتدائی
تشکیل یہاں کے نوابوں کے دور میں حریت پسندانہ مساویانہ ماحول میں
عوام سے ارتباط پھر فرنگی سامراج کی معاہداتی سیاست کے ذریعہ جکڑ بندی
اور ان کے خلاف رد عمل، جہاد آزادی، ۱۹۴۵ء میں بھوپال کے آزادی پسندوں
کی شرکت نواب صدیق الحسن خاں کی خفیہ تحریک حریت، مولانا بکٹالنٹر
بھوپالی کی آزادی ہند کے لئے بین الاقوامی سرگرمیاں، ریاست کے آخری
دور میں کانگریس کی تحریک کے ساتھ مقامی انجمنوں کے اشتراک کا ذکر
کیا گیا ہے۔

اثر خامہ

وجہی المحسینی، قاضی بھوپال

تاریخ آزادی کا اجمالی خاکہ

پرانہ ریاست بھوپال سترھویں صدی میں مرکز کی کمزوری اور طوائف الملوکی کی پیداوار ہے۔ آزاد سرحد (سرا) کے ایک آزاد سردار دوست محمد خاں نے ۱۸۵۹ء میں مالوہ کے پرخطر اور جنگلات سے معمور خطہ (گونڈوانہ) میں اس چھوٹی سی ریاست کی داغ بیل ڈالی۔

سردار صاحب اور ان کے اخلاف سیدھے سچے مسلمان اور دلاور و غیور پٹھان تھے۔ انھوں نے راعی و رعایا، راجا پر جا کے درمیان آزادانہ ماحول کے سائے میں ریاست کو پروان چڑھایا۔ جب کہ اپنی بہادر نے اپنی ناپاک استحصالی سیاست کے ماتحت ملک پر اپنے پنجہ جمانا شروع کئے تو نواب وزیرالدولہ والی بھوپال کو اپنی سنہری وروپہلی زنجیروں میں ایک معاہدہ کے ذریعہ جکڑ بند کر لیا جس کے خلاف ارکان ریاست میں اندرونی رد عمل ہوا۔ ان کے صاحبزادے نواب نظیر الدولہ کا قتل اسی کا شاخسانہ ہے۔ نوابوں کے دور کے بعد جب بیگمائی دور میں پورے ملک کے اندر طوفان بغاوت (۱۸۵۷ء کا جہاد آزادی) اٹھ کھڑا ہوا تو سردار فاضل محمد خاں نے (جو اسی خاندان کے معزز ترین فرد تھے) فرنگی سامراج سے کھلے میدان میں ٹکری اور راہ حریت میں جام شہادت نوش کیا پھر نواب صدیق الحسن خاں نے اپنے دور حکومت میں تحریک آزادی کا ایک ڈول ڈالا جو ان کی نوابی سے معزولی و برطانیہ پر ختم ہوا۔ برطانوی سامراج نے ہنگامہ ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اس سے متاثر ہو کر بھوپال کے پرچوش و انقلابی عالم مولانا برکت اللہ بھوپالی نے بیرونی دنیا میں آزادی ہند کے لئے جان توڑ کوشش کر کے اس مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنادیا اور اس راہ میں اپنی زندگی کی بازی لگا کر جلا وطنی کے عالم میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

جب خلافت کانگریس کی سرکردگی نے ۱۹۲۰ء میں آزادی کے لئے وطن

دوست جان بازوں کا قافلہ آگے بڑھا تو ایک طرف بھوپال کے مخلص افراد نے تحریک ہجرت کے سنگلاخ راستہ میں قدم رکھا اور دوسری طرف انجمن خدام وطن (پر جا منڈل) کے کارکن ریاست کے اس گھٹے ماحول میں مردانہ وار آزادی کے جدوجہد کے میدان میں کود پڑے اور ان بہادر وطن دوستوں نے ظلم و ستم اور قید و بند کی ہر دعوت پر لبیک کہا۔

غرض ریاست بھوپال کی آزادی کی راہ میں قربانیوں اور جانفشانیوں کی ایک مسلسل خونی و رنگین ایک شاندار داستان ہے جو تاریخ ہند کا ایک اہم باب ہے اور ابھی تک عام نگاہوں سے اوجھل رہا ہے تاریخ آزادی ہند کے اس مخفی و پوشیدہ گوشہ پر سے اس کتاب میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔

بیسویں صدی اور مغربی اقوام کا عروج

قدرت کا یہ عظیم الشان کارخانہ جو آسمان و زمین کی گردشوں کے درمیان قائم ہے، ہمیشہ سے انقلاب کا گہوارہ رہا ہے بقول اقبال اگر اس عالم میں کسی چیز کو قیام و ثبات حاصل ہے تو وہ خود تغیر انقلاب ہے اقوام عالم لی تاریخ اسی انقلاب کے گہوارہ میں جھولتی رہی ہے کبھی کوئی قوم ترقی کی چوٹیوں پہنچتی ہے تو پھر وہی کبھی پستیوں کے گہرے گڑھے میں جا گرتی ہے خدائے قوموں کو عروج و زوال کے یہ جو قانون مقرر کیا ہے اس کے مطابق ہر قوم ترقی و تنزل کے مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔

دنیا کی پچھلی تاریخ کا ایک ایسا دور گذرا کہ ہر ایجاد ہر ترقی کا سورج مشرق کی سرزمین سے طلوع ہوتا تھا کیا مذہب و تمدن کیا تہذیب و تمدن ان سب کی شاعریں سب سے پہلے مشرق سے پھیلیں مشرقی ترقیات کا آفتاب جب نصف النہار پہنچ کر مغرب کی طرف جھکنے لگا تو یہ روشن علاقہ اندھیرے کی پیٹ میں آنا گیا مغرب کے خطے میں روشنیاں پھیلنے لگیں اور مغرب کی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔

موروں و عربوں کی سرزمین اندلس (ہسپانیہ) غلطی نے علم تجربی دسائنس کا جو بلودا پندرہویں صدی میں لگایا تھا وہ جرمن فرانس اور انگلستان کی ہواؤں میں سو لہویں صدی تک رہا پچھلے ایک عظیم الشان درخت بن گیا لیکن سائنسی پودے کے جو اصل بانی تھے وہ خانہ جنگی،

برادر کشی کے بھنور میں پھنس کر غرقاب ہو گئے اور اہل مغرب اس کے
بانی مہانی بن گئے۔

سولہویں صدیء مغربی فتوحات کا پیغام لے کر آئی سائنسی ترقیات نے
ان کے لئے سمندروں کے راستے کھول دیے اور مغربی سامراج کے جنگجو بیڑے
افریقہ و ایشیاء کے وسیع سمندروں اور کھلے ساحلوں پر غارتگری اور لوٹ مار
کے لیے اترنے لگے جیسا کہ لکھا جا چکا سب سے پہلے ہسپانوی سامراج نے امریکہ
میں اور اس کے دیکھا دیکھی پرتگال نے ایشیائی و افریقی علاقوں میں نوآبادیاتی
جال بچھا دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہالینڈ فرانس اور انگلستان کی سامراجی حکومتیں
مفت کی اس لوٹ مار کے اندر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مقابلہ پر
اتر آئیں جیسا کہ گذر چکا پہلے ان مغربی قوموں نے تاجروں کا بھیس بدل کر ہر
طرف سامراجی ڈور ڈالنے شروع کر دیئے اور افریقہ و ایشیاء کی کمزور اقوام کو
لقمہ ترسمجھ کر ہضم کرنا چاہا اور ان علاقوں کو مفت کا مال سمجھ کر مشرق کے سیدھے
سچے لوگوں کو نرم چارہ سمجھ کر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور
پھرتکا بوٹی کرنے میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے ہر سامراجی قوت نے
یہی چاہا کہ وہ تن تنہا اس خوان یغما پر قبضہ کر لے۔

سترہویں صدیء واٹھارہویں صدیء میں ان یورپی قوموں
نے پادریوں کی فوجوں کو ہر اول دستہ کے طور پر یسوع مسیح کے پیغامِ محبت
کو پہونچانے کے لیے آگے آگے رکھا ان کے لبوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا
پیغامِ محبت تھا لیکن ان کے پیچھے توپیں مشین گنیں اور خون کے برسانے والے
ہتھیار تھے جن کے بل بوتے پر وہ ان پسماندہ قوموں کو غلامی کی زنجیروں میں
جکڑنے کے لیے سرگرم رہے۔

ان پچھلی صدیوں میں یسوع مسیح کے نام لینے والی قوموں نے ایشیا و افریقہ
کے بے گناہ و معصوم انسانوں اور بے زبان مخلوق کی جس قدر خون کی ندیاں بہائیں

ہیں کہ ان کے آگے چنگیز و ہلاکو کی خون خواریاں بھی ماند پڑ گئیں سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت نے اپنے کالے کرتوتوں سے نہ صرف عیسائیت کی طرف سے عام لوگوں کے دلوں میں نفرت و بیزاری پیدا کی بلکہ نفس مذہب کی عظمت کو دلوں سے مٹا دیا

انسانی تاریخ کی ظالمانہ خونیں داستان کا ظالمانہ عروج کچھلی صدیاں ہیں انیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے ایشیا و افریقہ کے بہت بڑے علاقوں پر برطانیہ فرانس اور ہالینڈ کے سامراج نے اپنا خونی پنجہ مضبوطی سے جما دیا جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے اختتام پر ترکی خلافت کے خاتمہ نے برطانوی و فرانسیسی سامراج کو دنیا کا چودھری بنا دیا مگر انیسویں و بیسویں صدی جہاں مغربی سامراج کا نقطہ عروج پہنچا ہوا تھا وہیں مظلوم و کمزور اقوام نئی انگڑائی لے کر مغربی سامراج کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئیں یہی وہ زمانہ ہے کہ ایشیا و افریقہ میں سامراج دشمن تحریکات نے زور پکڑا۔

مصر میں سعد زاعلول پاشا و قد پارٹی الجزائر میں عبدالقادر افریقہ میں سنوسی تحریک اور عبدالرحمن کوکبی ہندوستان میں خلافت و کانگریس اور ولی اللہی تحریک مغربی سامراج سے لوہا لینے کے لیے کھڑی ہو گئی سامراجی طاقتوں نے جس قدر منصوبہ بند طریقوں سے ان تحریکات کو زور و قوت کے دبانے اور کچلنے کی سازشیں کیں اسی قدر یہ تحریکات ابھرتی اور زور پکڑتی گئیں یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء کی عالمی جنگ نے نازیٹ و فسطائیت کی شکست کے ساتھ یورپ کی سامراجی طاقتوں کو بھی ان کی نوآبادیاتی یا بیسی نے شکست فاش سے دوچار کر دیا

انیسویں و بیسویں صدی کا ہندوستان

جب بیسویں صدی نے عالم انسانیت پر اپنا سایہ ڈالا تو ایشیا یا مشرق زوال و انحطاط کے آخری کنارے پر آ رہا تھا ایشیا کی خود مختار حکومتیں مندرجہ

سامراج کے پنجہ غلامی میں گرفتار ہو کر اپنی گلو خلاصی کے لیے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ انگلستان نے ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر اس کے پروبال ہی نہیں اکھاڑے بلکہ یہاں کے باشندوں میں اختلاف و نفاق کا بیج بو کر دائمی خانہ جنگی کے راستہ کو ہموار کر دیا ایشیا کی قومیں صدیوں سے عیش و عشرت اور غفلت کے خواب شیریں میں محو ہو کر اور بیرونی طاقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے جاہ و اقتدار اور حصول سلطنت کے چکر میں مبتلا تھیں باہمی رشتہ کشی کا سلسلہ جاری تھا۔ فرنگی سامراج نے ایسا پرفسریب ہمرنگ زمین جال بچھایا اور جارحانہ قومیت و وطنیت کے ہاتھوں تفریق کی لکیریں کھینچ کر اور جغرافیائی حد بندیوں سے ملکوں کی تقسیم کر کے باہمی جنگ کی بنیادیں استوار کیں اور ایک دوسرے کے درمیان اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیں۔ جب مغربی اقوام کا نوآبادیاتی نظام امریکہ کی سرزمین میں خود دیورپ کے باشندوں کی تحریک آزادی سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا اور امریکی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہوتی چلی گئیں تو ان مغربی قوموں نے مشرقی ملکوں کو اپنی مکارانہ سیاست اور ناجائز قبضہ و اقتدار، ظالمانہ نفع اندوزی کا میدان بنایا پھر جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوستان و دیگر ایشیائی ملکوں کو فرنگی سامراج نے اپنی طاقت و قوت سے زیر نہیں کیا بلکہ سامراجی ڈیلومسی لڑا دیکھنا تو جیسے ہتھیاروں سے فتح کیا اور یہاں کے باشندوں کو مہذب بنانے کے نام پر اپنا خونی پنجہ گاڑ دیا ہمارے نزدیک ہندوستان کے اندر فرنگی سامراج کو اپنے قصر سلطنت کے استحکام و توسیع میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں سب سے پہلے بقول نواب صدیق حسن خاں ہندوستانی ریاستیں ہیں جن کو معاہدات کی زنجیروں میں جکڑ بند کر کے اپنی عظیم سلطنتی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اپنی حکومت کی مدت بڑھائی چونکہ حسب معاہدات مفت کے فوجی و سپاہی آڑے وقت میں ہر طرح کی مالی امداد ریاستوں سے ملتی تھی دوسرے مسلمانان ہند کا ناجائز استحصال اور منصوبہ

استیصال برطانوی سامراج کا مسلمانوں کے ساتھ عمل ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک منتقامتہ رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے دور تک ان کے ساتھ ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو استعمال نہ کیا گیا ہو صاحبان اقتدار مسلمانوں رئیسوں و نوابوں کو خواہ مخواہ اپنی ریاستوں سے بے دخل کر کے دانے دانے کا محتاج بنایا اور نامی گرامی علما و فضلا پر جعلی و فرضی مقدمات قائم کر کے ان کو جیل خانوں میں ڈال دیا گیا اور نامور و مقتدر عالموں کو کالے پانی بھیج کر ان کی توہین و بے عزتی کی گئی بقول سر ولیم ہنٹر مسلمان ۱۸۵۷ء تک برطانوی حکومت کی طرف سے دبائے گئے دہارے ہندوستانی مسلمان) اور ان پر ہندوؤں کو غالب کیا گیا بہر حال جب منصوبہ بند طریقہ سے حکومت برطانیہ برادران وطن کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں کو پس ماندہ بنانے میں کامیاب ہو گئی تو پھر ۱۸۵۸ء میں مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اپنائی گئی خوش قسمتی سے برطانوی سامراج کو سرسید احمد خاں جیسی عظیم شخصیت ہاتھ لگ گئی جو ابتداء سے مذہبی انسان اور محب وطن انسان تھے جیسا کہ لکھا جا چکا انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریز حکام کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ دار کھل کر قرار دیا تھا جس کی بنیاد پر وہ قومی سطح پر ابھر آئے اور پھر سر ولیم میور کی کتاب ”لائف آف محمد“ کے جواب میں خطبات احمدیہ میں سر ولیم کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لیا ان کے ابتدائی خیالات یہ تھے۔

”قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے یا درکھو ہندو و مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو و مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب یہ سب ایک گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک ہے ایک ہونا چاہیے اب

وہ زمانہ نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جاتیں، ”تہذیب الاخلاق“

سر سید سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد ۱۸۸۲ء میں وائسرائے کی کونسل کے پہلے ہندوستانی مسلمان رکن مقرر ہوئے انھوں نے اسباب بغاوت ہند میں یہ تجویز رکھی تھی کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی مقرر کئے جائیں چنانچہ اس زمانہ میں اس کونسل میں ہندو مسلم مسائل کو قومی نقطہ نظر سے دیکھتے رہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بنگال میں قومی حقوق طلبی کا آواز بلند ہو رہا تھا۔ سر سید نے بنگالیوں کو اس وقت قوم کا استخراج کیا تھا۔

سامراجی حکومتوں کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ وہ قوم و ملک کے ان سچے رہنماؤں کو جو اپنی مخلصانہ خدمات سے لوگوں کے دلوں میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا دیتے ہیں یا تو ان کو وہ عہدہ و منصب مال و دولت کا لالچ دے کر خرید لیتی ہے یا اپنی عیاری و فریب کاری کے دام میں پھانس لیتی ہے چنانچہ سر سید پر بھی مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج کے ذریعہ جال بچھا دیا گیا۔ آزادی پسندوں کی طرف سے ان کو خوب خوب بدگمان کیا گیا پھر مسٹر بیک نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں سر سید کے نام سے ان آزادی پسند بنگالیوں کے خلاف سلسلہ مضامین شروع کر دیا اسی زمانے میں مسٹر ہیوم کے ذریعہ کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا تھا حالانکہ کانگریس ابھی تک وہی مطالبات رکھ کر اٹھی تھی جو سر سید نے حکومت سے کئے تھے لیکن اس سامراجی پرنسپل نے کانگریس کے خلاف محاذ بنا کر مسلمانوں میں کانگریس دشمنی کے جذبات کو ہوا دی۔ سر سید نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۵ء میں ایک معرکہ الآراء تقریر کی جس کے نتیجے میں نائٹ ہڈ کا خطاب ملا پھر تو مسٹر بیک مسٹر مارلین اور پھر راج پولڈ جسے برطانوی سامراج کے نمائندوں کے ذریعہ جو بدقسمتی سے علی گڑھ کالج پرنسپل بن کر آئے تھے مسلمانوں کے نام سے متعدد جماعتیں قائم

کر دیں جس کے ذریعہ قومی مطالبات سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہونے
 اور جمہوری اداروں کے قائم کرنے کی مخالفت شروع کر دی اس طرح علیگڑھ کالج
 کے ذریعہ فرنگی سامراج اپنی روپہلی سنہری مصلحتوں کے خاطر مسلمانان ہند کا
 استحصال کر کے اپنا آلہ کار بنانا چاہا تو سرسید نے اپنی ابتدائی دور سیاست میں
 ہندو مسلم دونوں ملک کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا یا تناظر برطانیہ کے سحر سے
 مسحور ہو کر اینگلو مسلم اتحاد کو ضروری اور ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن العمل
 قرار دیا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ وہی سرسید جو وائسرائے کو نسل میں ہندوستانیوں
 کے شامل ہونے کی پر زور تجویز لکھ چکے تھے اب تین سال بعد ۱۸۸۷ء میں ہندوستان
 میں سول سروس امتحان جاری کرنے کے اس لئے مخالف ہو گئے کہ اس کے اجراء
 سے ایک درجہ اور ایک ادنیٰ شخص امتحان دے کر معزز شریف لوگوں میں
 بیٹھنے کے قابل ہو جائے گا گو یا چھوت چھات ذات پات کا وہ مسئلہ جس کو اسلام
 مٹانے آیا تھا اب سرسید اس کے حمایتی بن گئے پھر ۱۸۸۷ء میں میرٹھ کے نوچندی
 کے میلہ میں انھوں نے کانگریس کے خلاف زبردست تقریر کی جس کی بناء پر ہندو مسلم
 نزاع کی دائمی داغ بیل پڑ گئی پھر مسٹر بیک نے سرسید کے ہاتھوں انڈین ہیئر پک
 ایسوسی ایشن (انجمن مجبان وطن) مخالف کانگریس قائم کر کے مسلمانوں میں علیحدگی
 پسندگی کی بنیاد ڈال دی پھر اسی سامراجی نمائندے مسٹر بیک نے مسلمانوں کے
 نام سے جمہوریت کے خلاف ایک غرض داشت پیش کرادی کہ ہندوستان میں
 جمہوری ادارے قائم نہ کئے جائیں جس کی وجہ سے فرنگی سامراج کو موقع ملا کہ
 وہ قومی جماعت کے مطالبہ جمہوریت پر ٹال مٹول سے کام لے اگرچہ دس سال
 بعد ۱۸۹۲ء میں حریت پسندوں کے جمہوری مطالبہ کے آگے حکومت کو سر جھکانا
 پڑا لیکن مسلمان بدنامی سے دوچار ہوئے جیسا کہ لکھا گیا الارڈ کرزن نے
 بنگال کے قوم پرست ہندوؤں کا زور توڑنے کے لیے مسلمانوں کو خوش کرنے
 کے بہانے تقسیم بنگال کا ۱۹۰۵ء میں اعلان کیا کہ ایک اسلامی صوبہ مسلمانوں کو

اکثریت کے لیے بنایا گیا ہے جس کی بنا پر متحدہ بنگال کے ہندو مسلم فرقوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہوئی جو آگے چل کر بڑھتی چلی گئی مگر بنگال کے قوم پرور ہندوؤں نے سخت شورش برپا کر کے ۱۹۱۱ء میں اس فیصلہ کو منسوخ کرادیا بقول نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ اس تنبیج نے مسلمانوں کے دل ٹکرے ٹکرے کر دیئے ان کی وفاداری کا یہ صلہ دیا گیا۔ نواب صاحب نہ صرف سیاست سے دست کش ہو کر بیٹھ گئے بلکہ چند ماہ بعد اسی صدمہ سے انتقال کر گئے۔

نواب وقار الملک جو ہمیشہ طلبہ علیگڑھ کو برطانوی حکومت کی وفاداری کا ہمیشہ سبق پڑھاتے رہتے تھے اس فیصلہ پر تہج اٹھے اور لکھا

دگورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپچانے کے تھی جو مسلمانوں کے مردہ لاشوں پر سے گزر گئی بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی انا اللہ وانا الیہ راجعون “
(روح روشن مستقبل ص ۶)

غرض فرنگی سامراج کی پالیسی کی بدولت جس کے حامی سرسید اور ان حواریں بن گئے تھے سامراج نے مسلمانان ہند کو قومی سیاست کے دھارے سے الگ رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں بلکہ آزادی کی راہ میں ان کو سنگ گراں یا راستہ کا روڑا بنانے کی پالیسی تجویز کی۔

پھر ماسٹر میکڈانلڈ نے ۱۹۰۶ء میں اردو دیوناگری رسم الخط کے اجراء کرنے کے احکام جاری کر کے ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی عمارتیں ڈاؤنٹ ٹاؤن لگا دی جس کی وجہ سے دونوں قوموں کے اتحاد کی عمارتیں مسمار ہو گئیں اگرچہ کلکتہ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گل گراسٹ نے اردو ہندی کے الگ الگ شعبہ قائم کر کے ایک صدی پہلے باہمی تفریق کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن میکڈانلڈ نے اس کی عملی تشکیل کر کے باہمی تفریق کی عمارت کھڑی کر دی۔

اردو مسلمانوں کی قومی زبان تھی نہ ملی زبان۔ ان کی ملی زبان عربی اور قومی زبان فارسی، ترکی وغیرہ تھیں لیکن مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا تو اپنی مادری زبانوں کو قربان کر کے مقامی زبانوں سے مخلوط زبان اختیار کی جسے ابتداء ہندی۔ دکھنی گجری مختلف نام دیئے گئے اور آخر میں اردو کے معنی کا جس نے لقب اختیار کیا۔

مسٹر میکڈانلڈ نے اس طرح ہندوستان میں اس لسانی تنازع کی جڑ بنیاد رکھ دی جو آگے چل کر سدا بہار فتنہ بن گیا آج ملک میں جہاں لسانی و جغرافیائی مزاحمت برپا ہیں ہماری سابقہ مہربان گورنمنٹ کی پالیسیوں کا نتیجہ ہیں۔

اس کے بعد جداگانہ انتخاب کو برطانوی سامراج نے جاری کر کے ملکی متحدہ سیاست کے پرچھے اڑا دیئے چنانچہ فرقہ پرستی کا جو بیج سامراجی مورخوں نے بویا تھا وہ بیج پھوٹ کر پھل پھول لایا فرقہ دارانہ انتخابات کی بیل پر چڑھ جانے کی وجہ سے زبان کا مسئلہ بقول مولانا منگلوری کریلہ اور نیم چڑھا ہو گیا رد و شن مستقبل ص ۹۴ فرقہ دارانہ انتخابات کو برطانوی سامراج نے جس مقصد کے لیے جاری کیا تھا اس کے لیے اس وقت کے ایک اہم برطانوی سیاستداں مسٹر لائٹل کروٹس کے خط سے اس کی حقیقت کھلتی ہے وہ لکھتا ہے۔

دو چند سال ہوئے جب کہ طریقہ انتخاب جاری کیا گیا تھا اس وقت جداگانہ انتخاب کا کہا مانا گورنمنٹ کی سب سے بڑی غلطی تھی جو اس سے ہندوستان میں سرزد ہوئی میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا اصول مستقل طور پر قائم ہو گیا تو ہم ہندوستان میں ذات پات کا ایک نیا طریقہ جاری کرنے کا موجب ہوں گے اور یہ وہ طریقہ ہوگا جو ہندوستان کو سال بسال گھن کی طرح کھاتا رہے گا جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان قومیت کے لحاظ سے کبھی متحد نہ ہو سکے گا جتنے عرصہ تک وہ قائم رہے گا اتنی ہی مشکل اس کے استیصال کرنے میں پیش آئے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر کار اندرونی خانہ جنگی اس

ملک کا خاتمہ کرے گی (بحوالہ سابق ص ۹۴)

سو سال پہلے برطانوی سامراج نے جس تہذیبی سا پنچہ پر ہندوستانی سیاست کو ڈھالا تھا اس کے تلخ نتائج پیدا ہونے اور کڑوے پھل لگنے میں زیادہ دیر نہ لگی جو ہونا تھا وہ ہوا لیکن بآلحوظ خاطر رہے کہ علیگڑھ کی سیاست کا محور مٹھی بھر مخصوص افراد تھے ورنہ عام مسلمانان ہند کو نہ ان امور سے آگاہی دی جاتی تھی نہ ان کو خوشامد پرستانہ سیاست سے دلچسپی تھی وہ ان جلسوں میں گاہے گاہے تماشائی کی حیثیت سے ضرور شریک ہو جاتے تھے عام مسلمان مذہبی و دینی خیالات کے حامل تھے اس لیے وہ علماء کرام کے پیچھے چلتے رہے تھے چنانچہ جب ۱۹۱۶ء جمعیتہ علماء ہند نے میدان میں قدم رکھا اور خلافت کی تحریک ہندوستان بھر میں جنگل کے آگ کی طرح پھیلی تو مسلم عوام اپنے اصلی حریت پسندانہ جذبات کی بناء پر جوق در جوق ملکی سیاست میں امنڈ پڑے۔

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں اتحادیوں کی فتح نے جن کا چودھری برطانیہ بن گیا تھا اس کے سرغزور کو اتنا بلند کر دیا کہ برطانیہ نے ہندوستان کے لیے حقوق ملکی اور آزادی ہند کے پچھلے وعدوں کو پس پشت ڈال کر جلیانوالہ باغ کا تحفہ جرنل ڈائر کے ہاتھوں اہل ہند کو پیش کیا اور ہندو مسلم کے خون سے اس باغ کو لالہ زار بنایا جس کے نتیجہ میں یہ دونوں فرقے فرنگی سامراج سے ٹکر لینے کے لیے میدان میں آ گئے برطانوی سامراج کی اس مغرورانہ پالیسی نے خود اس کے حامیوں میں برہمی پیدا کر دی علیگڑھ کالج کی نصف صدی کی وفاداریاں آزادی پسند قوم پر ور طاقتوں کے آگے راہیگاں ثابت ہوئیں اور خود علیگڑھ کالج سے مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، جیسے حریت پسند رہنما سرسید کی پالیسی کے خلاف برطانوی سامراج کے ساحرانہ سیاست کے دام سے باہر نکل آئے اور میدان سیاست میں کود پڑے تحریک خلافت جمعیتہ علماء ہند اور احرار اسلام جسی قومی و ملی جماعتوں کے

جلوس میں مسلمانان ہند نے اپنی افرادی قوت سے زیادہ قربانیاں دیں۔ پشاور کا قصہ خونیں تاتا رکھتا ہے۔ آزادی ہند کا سنگ میل ثابت ہوا جس کے اندر سرحدی بھٹانوں نے اپنے خون شہادت سے داستان حریت کو رنگین بنایا۔ افسوس ہے کہ مسلم عوام کی مسلسل و عظیم قربانیوں کے باوجود فرقہ پرستانہ سیاست نے ان حریت پسندانہ تاریخ کو مسخ کر دیا اور علماء حق مجاہدین آزادی قوم پرور مسلمانوں کو قصداً پیچھے ڈھکیں دیا گیا اور جو کچھ عام مسلمانوں نے اپنی تعداد سے زائد آزادی کی راہ میں سرفروشتیاں کی تھیں اس کا پھل ان کو نہ مل سکا آزادی سے پہلے بھی آزادی پسند مسلمان اپنی قوم کے اندر نشانہ ملا مت بنے رہے اور آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے ان کو ابھرنے اور پھٹنے کا موقع نہیں دیا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مسئلہ کی تقسیم کے فیصلہ پر وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی اور مسٹر چرچل کو مبارک کا جوتار دیا تھا اس کے اندر لکھا تھا کہ برطانیہ اپنی سامراجی پالیسی میں کامیاب اور علماء حق دوسری سے متحدہ ہند کی آزادی کے لیے خون کی ندیاں بہنے سے روکنے کی خاطر جو جدوجہد کر رہے تھے اس کے اندر ناکام ہو گئے اب دونوں ملکوں میں خون کی ندیاں بہنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی خود مولانا مرحوم نے راقم الحروف سے یہ بات کہی ۔

بہر حال برطانوی سامراج نے ان حریت پسند مسلمانوں کو اپنی مکاری و عیاری کی دودھاری تلوار سے ذبح کر کے انتقام کی پیاس کو بجھایا۔ فرنگی سامراج کی تاریخ نگاروں اور ان کے پیروکاروں نے تاریخ ہند میں ان مسلم بہنوں کو (جوتاج برطانیہ کے وفادار تھے) بہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جن مخلص قائدوں نے ملک و ملت کے لیے مخلصانہ قربانیوں کا غیر معمولی ریکارڈ قائم کیا یا تو ان کو برے القاب و خطابات سے یاد کیا گیا ہے ورنہ زیادہ تر صفات تاریخ ان کی زبردست قربانیوں سے خالی ہیں ہماری کتاب کا مقصد ان مخلص

بزرگوں کا اجمالی تعارف و تذکرہ ہے جن کو خاموش و گم نام مساعی سے ہمارا ملک غلامی کی گرد آج نکل کر ساحل آزادی پر جا لگا ملک و ملت کی راہ میں ان گمنام و خاموش مجاہدوں اور شہیدوں کے جانبازیوں کے لیے ادنیٰ خراج عقیدت ہے۔

ریاست بھوپال بیسویں صدی میں

جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا کہ بیسویں صدی تاریخ انسانی میں اس لیے یادگار رہے گی کہ اس صدی تک پہنچتے پہنچتے مشرقی قومیں اور ایشیائی سلطنتیں زوال کے نقطہ اختتام تک پہنچ گئیں ہمارے ملک پر فرنگی سامراج کی گرفت مضبوط ہو گئی برطانوی سامراج نے اپنے فولادی نظام سے ہندوستان کو شہرے کے بعد مضبوط شکنجہ میں کس لیا بقول غالبؔ

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اٹنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

برطانوی حکومت کی سخت گیری اور پچھلے مظالم کی دہشت انگیزی نے ہندوستان میں قبرستان کا امن پیدا کر دیا تھا۔ برطانوی شہنشاہیت کے سایہ میں رہ کر ہندوستان کی ساڑھے چھ سو ریاستیں من مانی کارروائیاں کرتی ہوئی اور عیش و عشرت کے گلچھرے اڑاتی ہوئی چین کی بنسی بجا رہی تھیں اکثر راجہ مہاراجہ نواب و حکمران برطانوی سامراج کے آغوش میں رہ کر اپنی رعایا کی واقعی ضرورتوں سے غافل و بے پروا تھے اور اپنے اکثر اختیارات فرنگی ماحول کے پروردہ افراد کے ہاتھوں دے کر اپنے محلوں میں داد عیش دیتے رہے ان ریاستوں کا ماحول ایک صدی پہلے کا تاریک ماحول تھا جہاں جدید تعلیم اور عصری تقاضوں کی ہلکی سی روشنیاں بھی نہ پہنچ سکی تھیں یورپ کی ایجادات اور مغرب کی جدید اختراعات یعنی صنعتی ترقیات کی

ہوا تک نہ لگی تھی اس لیے ریاستی باشندے برطانوی ہند کے باشندوں سے ایک صدی پیچھے تھے حقوق شناسی کا پیمانہ تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے خالی تھا۔ کیوں کہ شخصی حکومت میں سیاست ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے ہندوستانی ریاستوں میں پچھلے شاہی نظام کی طرح ترقی کا دار و مدار زیادہ تر سرکار دربار کی خوشامد پر مبنی ہوتا تھا خود دار قوم و ملک کے ہمدرد و غمخوار انسان راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکتے تھے بیدار معز اور رعایا کے سچے ہی خواہ اور ریاست کو ترقی کی شاہراہ پر لے جا کر کھڑے کرنے والے حکمران اولاً تو اس ماحول کی وجہ سے ناپید تھے اور اگر کوئی غیر معمولی آدمی پیدا بھی ہو جاتا تو حکومت کی ساحرانہ سیاست یا تو اس کو تھپکی دے کر سلا دیتی یا سامراج کی مہربانی اس کو اپنے شکنجے میں کس کر بے دست و پا بنا دیتی

عہد سلطانی اور بھوپال

سابقہ ریاست بھوپال مسلمان ریاستوں میں دوسرے نمبر کی ریاست تھی حیدر آباد کو اولیت کا فخر حاصل تھا ریاست بھوپال کی تاریخ البالی مرفہ الحالی کا دور بیگماتی دور تھا جس کی آخری کڑی نواب سلطان جہاں بیگم تھیں نواب صدیق حسن خاں کی تحریک جہاد کی وجہ سے ریاست پر حکومت برطانیہ کی کڑی نظریں لگی رہتی تھیں اس لیے گریفن گروہی کے بعد ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ریاست کے معاملات پر گہری نظر رکھتا تھا سلطان جہاں بیگم ۱۹۰۷ء میں جب مسند نشین ریاست ہوئیں تو ریاست کی حالت خستہ و ابتر تھی ان کی والدہ شاہجہاں بیگم کی غیر معمولی فیاضی و فراخ دلی اور طویل علالت نے ریاستی نظم و نسق کو کمزور کر دیا تھا اور نواب صدیق حسن خاں کی پچھلی حکمت عملی کی وجہ سے وہ ریاستی انتظام حکومت سے علیحدہ کر دی گئی تھیں سلطان جہاں کے

برسر اقتدار آنے پر پچھلے قرضوں کا بار اٹھانا اور سابقہ سیاست کے مطلع کو صاف کرنے کے لیے ہر قدم ان کو پھونک پھونک کر رکھنا پڑا یہ امر مخفی نہ رہے کہ بھوپال کی پہلی ولی صفت فرماں روا قدسیہ بیگم نے عہد میں بھوپال کی رعایا کے علاوہ غیر آدمی کو ملازم نہیں رکھا جاتا تھا رعایا میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ ملازمت عہدوں کے سلسلہ میں یکساں معاملہ کیا جاتا ان کے عہد میں رعایا خوش حال اور شہر سرسبز و آباد تھا (فرماں روا یان بھوپال ص ۱۶۵)۔

پھر عہد جہانگیری اور دور سکندری میں ریاست کے باہر کے علماء و فضلاء کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیری بیگم کو انگریز بہادر نے فرماں روائی سے علیحدہ کر دیا تو ان کے ساتھ جتنے ریاست کے عہدے دار و منصبدار تھے وہ سب ریاست سے علیحدہ ہو کر ان کی ڈیوٹی میں منتقل ہو گئے۔

(تاج الاقبال)

اس لیے ضرورت پڑی کہ باہر کے قابل و فاضل اور تجربہ کار افراد کو انتظام ریاست کے لیے بلایا جائے چنانچہ یہ بیرونی علماء و فضلاء بھوپال آکر بس گئے اور انھوں نے ریاست بھوپال کو اپنا وطن بنا لیا۔

اسی طرح ہنگامہ شدہ بعد ہزاروں خانماں بر باد شرفاء و غریب خانانوں نے بھوپال کو گوشہ عافیت سمجھ کر پناہ لی نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانے میں پچھلے قاضی و مفتی خاندانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا پھر دور شاہجہانی میں جب نواب صدیق الحسن خاں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ دوڑ آئی تو انھوں نے اپنے مخصوص مسلک و سیاست کی وجہ سے پرانے منصب دار و جاگیردار خاندانوں کا صفایا کر دیا جس کی وجہ سے ریاست بھوپال میں ملکی و غیر ملکی کا مسئلہ ابھرا پھر نواب صاحب کی معزولی کے بعد ملکی و غیر ملکی کشمکش دوسرے پیرائے میں ظاہر ہوئی نواب صاحب کی ریاست سے بے دخلی کے بعد انگریز ریزیڈنٹ نے جن وزراء کو نامزد کیا نواب عبداللطیف خاں کرنل وارڈ

منشی امتیاز علی صاحب اور وزیر عبدالجبار خاں یہ سب کے سب باہر کے
 آوردہ تھے بقول شخصے بھوپال میں بڑپکتا دیکھ کر یہ زیرک و دانشمند لوگ اس
 پر ٹوٹ پڑے اور ہر محکمہ میں اپنے آدمی بھرنے شروع کر دیئے بھوپالیوں کے
 حقوق و پامال ہوتے چلے گئے سلطان جہاں بیگم نے برسر اقتدار آکر اپنی حکمت عملی
 فیاضی و رواداری سے اس پھلی کشمکش کو ایک حد تک دبا دیا۔ کیوں کہ وہ خود
 نواب صدیق الحسن خاں کی وجہ سے معنوب ریاست ہو کر ریاست کے پرانے وفاق دار
 خاندانوں سے قریب ہو گئی تھیں اس لیے ایک حد تک اس کشمکش کو دور کرنے
 میں کامیاب ہوئیں شاہجہاں بیگم نے اپنی غیر معمولی سخاوت و فیاضی کی وجہ سے
 اخوان ریاست اور اعیان مملکت کو کسی خدمت کی شرط لگائے بغیر جاگیرات و مناصب
 سے نوازہ تھا اس لیے ان میں سے اکثر افراد لہو و لعب سیر و شکار کے خواہراور مفت خوری
 کے عادی ہو گئے تھے سلطان جہاں بیگم نے ان مناسب و جاگیرات کے متعلق خدمات
 کی شرائط عائد کر دیں اور ان خاندان کے نوہالوں کو اصلی تقاضوں کے مطابق دینی و
 دنیوی تعلیمات کو لازم کر دیا اس لیے قدیم و جدید مدارس اس سچ کے عہد میں کھلتے
 چلے گئے۔

چونکہ سلطان جہاں بیگم ایک دیندار تعلیم یافتہ اور مدبرہ فرمانروا تھیں۔
 اس لیے انھوں نے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی
 خصوصی توجہ دی جہاں مشرقی علوم کے مدرسہ سلیمانیہ اور جامعہ احمدیہ خالص دینی
 مدرسہ قائم کیے اور بیرونی علماء و فضلاء کو بلا کر ان مدارس کو رونق بخشی وہاں
 عصری اور جدید اسکول بھی قائم فرمائے سلطانہ زنا بیہ اسکول صنف نسواں کے لیے
 قائم کیا۔ خود اپنے چھوٹے صاحبزادے نواب حمید الشہ خاں کو علیگڑھ بھیجا وہ پہلی
 مسلمان خاتون ہیں جو مسلم یونیورسٹی کی دوبار چانسلر منتخب ہوئیں اس موقع
 پر ابو سعید بزمی کی کتاب ریاستوں کی سیاست کا اقتباس کا نقل کرنا خالی از لطفی
 نہ ہوگا بزمی صاحب نے لکھا ہے کہ فرمانروا کی ذات کا کوئی فعل حکومت اور اس کے

حکام کو اپنے رنگ میں رنگے بغیر نہیں رہ سکتا مطلق العنان شخصی حکومتوں میں فرمانروا کی ذاتی زندگی کا اثر ملکی سیاست پر پڑنا ناگزیر ہے چنانچہ مہاراجہ پٹیل کو حیب پہلوانی کشتی گیری کا شوق ہوا تو ریاست میں اس کا اسکول کھل گیا اور بے دریغ روپیہ اس پر صرف ہونے لگا نواب صاحب جو ناگڈھ کو کتے پالنے کا شوق ہوا تو ساری ریاست میں کتے ہی کتے نظر آنے لگے نواب صاحب بھوپال کو پولو، ہاکی کا شوق ہے اس لیے عوام بھی اس کمال کے حاصل کرنے میں پیش پیش ہیں آپ کی والدہ سلطان جہاں بیگم کو تعلیم کے فروغ دینے اور بالخصوص لڑکیوں کے تعلیم یافتہ بنانے کا شوق تھا اس لیے اس زمانہ میں ساری فضا میں علم و فضل کا چرچا تھا (ریاستوں کی سیاست ص ۵۵)

بہر حال نواب سلطان جہاں بیگم اپنی صنف میں منتخب روزگار اور اپنے وقت کی فصیح و بلیغ مقررین میں اونچا مقام رکھتی تھیں مولانا شبلی رحمان لکھا ہے

درد مجھ کو حکمران اسلام میں سے متعدد دروساء و فرمانروایان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے ان سے گفتگو و ہم کلامی کی نوبت بھی آئی ہے لیکن میں بغیر کسی قسم کی رواداری اور تعلق اس کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس اور یا والی ملک کو اس قدر وسیع المعلومات خوش تقریر ، فصیح اللسان ، نکتہ سنج اور دقیقہ رس نہیں دیکھا وہ تقریر فرما رہی تھیں اور میں عجیرت تھا کہ دہلی و لکھنؤ کی سرزمین کے علاوہ کسی اور ملک کا آدمی بھی ایسی شہستہ اور فصیح اردو کے بولنے پر قادر ہو سکتا ہے وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو کر رہی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ مخدرات اور حجرہ نشین بھی اس قدر معلومات حاصل کر سکتیں ہیں ،، بہر حال تاریخ بھوپال میں عہد سلطانی اپنی گوناگوں خصوصیات و برکات کے لحاظ سے ممتاز رہا۔

معاشرہ اسلامی نے عورتوں کے حقوق کو پامالی پر سب سے پہلے اکھنوں نے ہی ملک کے نامی گرامی علماء کو مدعو فرما کر حقوق زوجین کا مسودہ مرتب کرایا اور

منفقو و الجہز مطلقہ عورتوں کی گلو خلاصی کے لیے قانون بنوائے جس نے میں بعد میں ناقص صورت میں کاظمی ایکٹ کے نام سے شہرت حاصل کی۔

دورِ حمیدی کی سیاست ۱۹۲۶ء

عہدِ سلطانی تک جو بیگماتی دور کا آخری زریں عہد تھا ریاست قدیم جاگیردانہ گہوارہ میں بھول رہی تھی اور دورِ جدید کی سیاست کی پرچھائیاں اس علاقہ میں نہ پڑی تھیں نواب حمید الشہ خاں (ولادت ۱۸۹۴ء وفات ۱۹۶۷ء) ۱۹۲۶ء میں جب مستند نشین ہوئے تو ریاست کی سیاست نے نئی انگڑائی لی کیونکہ خود نواب صاحب پہلے گریجویٹ رئیس اور علیگڑھ کالج کے پروردہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان اور باب سیاست کے قریب رہے تھے اور مسلم یونیورسٹی کے قضیہ نامرضیہ میں اصرار اسلام کے ساتھ تھے اس لیے گورنمنٹ کی نگاہ میں تاج برطانیہ سے ان کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی اس بنا پر ان کے مستند نشین بنانے پر سلطان جہاں بیگم کوزبردست کوشش کرنا پڑی یہ حقیقت ہے کہ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور علیگڑھ کالج نے ان کی فطری ذوق سیاست کو جلا بخشتی اور عصری سیاست کے میدان کا شہسوار بنایا اس لیے ان کے فرمانروا ہونے سے کچھ عرصہ بعد ہی حقوق طلبی کی سیاست کا ریاست میں غلغلہ بلند ہوا جس نے آگے چل کر تحریک کی شکل اختیار کی اور بہت سی جماعتیں بنتی اور مٹتی رہیں جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کہ انجمن خدام وطن اپنے پرزور و سرگرم حمایتیوں کی وجہ سے ایک فعال جماعت ثابت ہوئی اس جماعت کے ارکان میں ابوسعید بزمی ایک مفکر یا اس جماعت کے دماغ تھے جس پر ان کی کتاب در ریاستوں کی سیاست شاہد ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کتاب کا اقتباس پیش کیا جائے۔

بزمی صاحب لکھتے ہیں:-

ابتداءً سیاست یا حکومت ایک سیدھا سادہ نظریہ تھا اس میں کوئی منطقی الجھاؤ اور نہ فلسفیانہ اشکال تھا لیکن انسانی خود غرضیوں اور خود پرستیوں نے رفتہ رفتہ اس میں الجھاؤ پیدا کرنا شروع کر دیئے جب کسی ناجائز چیز کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو منطقی موٹو گائیڈوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے بغیر کام نہیں چلتا بات میں بات پیدا کی جاتی ہے اور بہت معمولی سی حقیقت کو بھی بحث و نزاع کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جاتا ہے یہی حال سیاست و حکومت کا ہوا۔

امن، خوش حالی، اور ترقی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے دنیا والوں نے حکومت کے نام سے ایک ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد ڈالی تھی لیکن ان کو کیا خبر تھی کہ یہ سیدھی سی بات آگے چل کر بڑے بڑے جھگڑوں کا سبب بن جائے گی اور چند خود غرض عیش پسند اور حیلہ تلاش لوگ اقتدار و بالادستی کی اس امانت سے جس کا نام حکومت ہے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ساری دنیا کو ایک زبردست آفت میں مبتلا کر دیں گے آج دنیا میں جمہوریت، دستوریت، اشتراکیت کے نام سے اصلاح و انقلاب کی جو آوازیں بلند کی جا رہی ہے وہ سب اسی قسم کی ناجائز فائدہ اٹھانے والے چند خود غرض لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

دنیا کی ہر حکومت میں خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو خواہ کتنی ہی مختصر ہو مسائل کی نوعیت یہی ہے یعنی اوپر کے چند مٹھی بھرا افراد نے حکومت و اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر عیش و عشرت کو صرف اپنے لیے مخصوص کر دیا ہے عوام کا رویہ عوام پر صرف ہونے کے بجائے چند مخصوص لوگوں کی کوٹھیوں اور بنگلوں پر صرف ہوتا ہے عوام مال گزاری دیتے ہیں ٹیکس دیتے ہیں اور اس طرح خزانے کی تھیلیوں کو دولت سے پر کرتے ہیں قاعدے کی رو سے یہ رویہ ان کے کاموں پر صرف ہونا چاہیے ان کی تعلیم پر، حفظان صحت پر، سڑکوں کی تعمیر پر، ہسپتالوں کے قیام پر، غرض کہ ان تمام چیزوں پر جس کا تعلق عوام سے لیکن

ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس چند مخصوص لوگوں کے لیے موٹریں۔ ریڈیو،
 بنگلے بنائے جاتے ہیں اور وہ خوب عیش سے اپنے گلچھڑے اڑاتے ہیں لیکن
 لاکھوں عوام بھوکوں مرتے ہیں نہ ان کی تعلیم کا کوئی منقول انتظام ہوتا ہے اور
 نہ ان کے محلوں میں صفائی ہوتی ہے حالانکہ جو کچھ روپیہ محلوں اور کوٹھیوں
 میں صرف ہوتا ہے وہ ان ہی کارروپیہ ہے یہ خیال کر کے قدرتنا ان کے دل میں
 غم و غصہ کی لہر پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے غم و غصہ کو حکومت کے سامنے پیش
 کرتے ہیں حکومت اس غم و غصہ کی طاقت و اہمیت کو محسوس کرتی ہے اسے
 یہ ڈر پیدا ہونے لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام کا غم و غصہ ان کے عیش و عشرت
 کو خاک میں ملا دے اور اس کے جس روپے کو اپنے عیش کے خاطر پانی کی
 طرح بہاتے ہیں اسے عوام واپس لے لیں اس لیے وہ چند لوگوں کو رشوت
 دیتے ہیں یعنی اس ناجائز عیش بازی میں انھیں بھی شریک کر لیتی ہے یہ جس
 کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ رشوت دے کر اپنے ساتھ
 شریک کر لینے کی کوشش کرتے ہیں نئے نئے وسائل پیدا کر کے فلسفیانہ و منطقی بحثوں
 میں عوام کے دماغ کو الجھانے کی کوشش کرنے میں مذہب کے نام کو بیچ میں
 لاتے ہیں غرض کہ جس طرح ڈوبتا آدمی ہر تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے اسی
 طرح ایسے مواقع کو حکومت بھی ہر ممکن طریقہ سے عوام کا منہ بند کر کے اپنے عیش
 کو خطرے میں پڑنے سے بچانے کی کوشش کرتی ہے بالکل یہی حالت ہے جو آج
 میں ہندوستانی ریاستوں میں نظر آرہی ہے خواہ وہ رقبہ و وسعت کے لحاظ سے
 کتنی ہی مختصر اور چھوٹی کیوں نہ ہو (ریاستوں کی سیاست ص ۱۷۳)

آج سے نصف صدی پہلے ریاستی یا ہندوستانی عوام کو مشکلات و پریشانیوں
 کی جو تصویر کسی اس کتابچہ میں کی گئی ہے افسوس کہ آزادی کی ربع صدی گزر جانے
 کے بعد بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ حالات جوں کہ توں ہیں عہد ماضی
 کے آئینہ میں جس روشن مستقبل کی جھلکیاں دکھائی گئیں تھیں نہایت افسوس کے

کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اکثر غریب اور عوام خصوصی طور پر اقلیتوں کے ساتھ ہمارے رہنماؤں کا خواب اب تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا بقول اقبال دیوانہ جہوری قبا میں پائے کو بی کر رہا ہے ہماری حکومت کے بے شمار کاغذی اور غربت و پسماندگی کے دور کرنے کے اعلانات اشتہاری بن کر رہ گئے ہیں۔ یقیناً ہمارے ملک کا دستور اساسی جو آزادی کے بعد قومی رہنماؤں نے بنایا وہ دنیا کے بہت سے ملکوں کے دستور سے عمدہ و بہتر اور مقبولیت پر مبنی ہے لیکن فرنگی سامراج کی باقی ماندہ نوکر شاہی نے ہندوستانی عوام کو یورپی طرح اپنے حقوق سے بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں دیا غالب سے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

ریاستوں کے قیام کی تاریخ

اس سے پہلے کہ ریاست بھوپال کی دور حمیدی کی سیاست اور حقوق طلبی کی تحریک کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کے قیام کی تاریخ کا اجمالی ذکر کر دیا جائے تاکہ اس آئینہ میں سیاسی تحریک کو دیکھا جاسکے ریاستوں کے قیام کی تاریخ جیسا کہ برہمہ صاحب لکھا ہے یہ ہے

اٹھارویں صدی کے اندر جب ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط بڑھتا تو اس نے ریاستوں کو بے دھڑک برطانوی ہند میں ضم کرنا شروع کر دیا سب سے پہلے لارڈ ویلزلے ۱۷۸۴ء تا ۱۷۸۵ء نے اس کام کی ابتداء کی اور ریاستوں پر جاویدا الزامات عائد کر کے ان کو برطانوی مقبوضات میں شامل کیا بعد میں لارڈ ویلزلے ۱۷۸۴ء تا ۱۷۸۵ء نے اس پالیسی پر اور زیادہ شدت سے عمل کیا چنانچہ اس زمانے میں بیسیوں ریاستیں برطانوی علاقوں میں ضم کی گئیں لیکن جب ۱۷۸۵ء میں ہندوستانی باشندوں نے سات سمندر پار گورے آقاؤں کے خلاف ایک انقلابی بغاوت

کمر ہمت کس کر ان کے وجود سے سرزمین ہند کو پاک کرنے میں ان ریاستوں نے
جان توڑ کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ریاستیں اس وقت
انگریزوں کا ساتھ نہ دیتیں تو آج ہماری گردنوں پر برطانوی اقتدار کا جوانہ رکھا جاتا
چنانچہ ندر کے فوراً بعد ہی لارڈ کیننگ نے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جو رپورٹ
پیش کی تھی اس میں ریاستوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

”دیسی ریاستوں کے ان ذرا ذرا سا علاقوں میں مضبوط چٹانوں کا کام
کیا اور ہندوستان کی عام بغاوت کے طوفان کے زور کو بہت زیادہ ہلکا اور بے اثر
کرنے میں ہماری مدد کی اگر یہ ریاستیں نہ ہوتیں تو ہم ختم ہو چکے ہوتے!“

ہندوستانی قومیت و وطنیت کے ساتھ غداری کر کے انگریزوں کے قدموں
کو ہندوستان میں جانے کا کام ایسا نہ تھا کہ جس کا صلہ نہ دیا جاتا چنانچہ عین اس
وقت جب کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہنگامہ محشر بپا تھا اور معمولی سے شک و شبہ
پر انسانی خون کی ندیاں بہائی جا رہی تھیں برطانوی ایوان اجلال میں ہمارے
ان رئیسوں کی خدمات کے اعتراف میں صلہ اور خلعت تقسیم کیے جا رہے تھے اور
جس رئیس کی پیشانی کا داغ زیادہ سے زیادہ بڑا اور زیادہ سے زیادہ سیاہ ہوتا
تھا اس کے انعام کی مقدار بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی تھی ریاست بھوپال
کو خطابات اور تمغوں کے علاوہ رائسین نامی قصبہ دیا گیا اور رائسین کا قصبہ نہیں
بلکہ قصبہ بیرسید دیا گیا۔ وجدگئی، الفرض ہمارے رئیسوں کی اس وفادارانہ
منظاہرہ کے بعد برطانوی شہنشاہیت کے دربار میں ریاستوں کی ضرورت کو
محسوس کیا گیا اور تاج برطانیہ کی طرف سے ان کے تحفظ کا باقاعدہ اعلان کر کے
انہیں اندرونی معاملات میں خود مختار بننے کا یقین دلایا گیا لیکن اسی کے ساتھ اس
کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ سلطنت برطانیہ کی بالادستی ہر وقت ہر لمحہ باقی رہے گی
اور جب ضرورت سمجھے گی ان ریاستوں کے ہر معاملہ میں مداخلت کر سکے گی ۱۹۳۷ء
میں نظام حیدرآباد کے ایک مراسلہ کے جواب میں لارڈ ریڈنگ نے بحیثیت وائسرائے

جو تاریخی خط لکھا تھا اس میں برطانوی بالادستی اور رتبہ کی زیر دستی کو
صاف صاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے (ریاستوں کی سیاست ص ۳۹-۴۰)
بہر حال صدیوں سے ریاستی عوام بلکہ ہندوستانی عوام اپنی غفلت پسندی
و کوتاہ عملی کی وجہ سے پسماندگی کا شکار اور طاقتوروں کے دام میں گرفتار
ہو چکے تھے بقول اصغر

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمجھتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

دورِ حمیدی ۱۹۲۶ء

جب نواب حمید الشہ خاں صاحب ۱۹۲۶ء میں برسرِ اقتدار آئے چوں کہ
الگزرنڈا ہائی اسکول کے طالب رہے تھے اس لیے ان کے استقبال میں
بابو عبدالکریم مرحوم نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے فرماں روا
جو اولڈ بوائے اور گریجویٹ بھی ہیں اہل بھوپال کو توقع ہے کہ بھوپالیوں
کو ان کے دورِ حکومت میں ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے پورے پورے
حقوق حاصل ہوں گے۔ حقوق طلبی کی یہ پہلی اسناد عایدِ درخواست تھی جو
رعایا کی جانب سے راعی کی خدمت میں پیش کی گئی پھر حادرِ رضوی صاحب نے
اسٹیٹ اسمبلی میں اس مسند کو اٹھایا پھر ۱۹۳۱ء میں اصغر انصاری انیس انصاری
نے گریجویٹس ایسوسی ایشن بنائی جو اختلافات کے نذر ہو گئی یہ لکھا جا چکا ہے
کہ نواب حمید الشہ خاں صاحب نے علیگڑھ کالج والے آبادیونیورسٹی میں اپنے
تعلیمی سلسلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا اس لیے ریاست میں باہر کے آنیوالے
عہدیداروں کا حلقہ وسیع ہوتا رہا اور ریاست کے قدیم باشندے پیچھے ڈھکیلے
جاتے رہے ان بیرون ریاست عہدیداروں نے ان کو چاروں طرف سے اپنے
گھیرے میں لے لیا اور نواب صدیقی الحسن خاں کے دور کی کشمکش قدیم و جدید

باشندوں کے درمیان پیدا ہوتی چلی گئی ان کی ہندوستانی سیاست میں دلچسپی میں
 ریاست کے داخلی انتظامی احوال سے یکگوشت بھر واکر دیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگ عظیم
 کی فتح ۱۹۱۸ء کے حکومت برطانیہ فرعونى انداز میں آزادی ہند کے پچھلے وعدوں کو
 ٹھکرا چکی تھی۔ رسوائے عالم جنرل ڈائرنے جلیان والا باغ میں نہتے عوام پر فائرنگ
 کر کے عام ہندوستانیوں کے دل میں غم و غصہ کے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔
 خلافت جمیعت علماء اور کانگریس نے مل جل کر برطانوی سامراج کے خلاف عدم تشدد
 کے ہتھیار جنگ کا بگل بچا دیا تھا یورپ ملک میں تحریک آزادی جنگل کے آگ کی
 طرح پھیل رہی تھی جس کے شعلے دار و گیر اور سخت گیری کے پانی سے بجھ بجھ کر اور
 بھڑکتے تھے جمیعت نے اپنے قیام ۱۹۱۹ء کے ساکھی آزادی کامل کی تجویز پاس کر دی
 تھی جب کہ ملک کی قومی جماعت (کانگریس) کو ہوم رول سے آگے بڑھ کر دس برس
 بعد ۱۹۳۹ء آزادی کامل کو اپنا نصب العین بنانا پڑا برطانوی ہند میں تحریک آزادی
 کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی چنگاریاں اڑا کر ہندوستانی ریاستوں میں بھی
 پہونچ رہی تھیں جس کے نتیجہ میں بھوپال میں ملکی و غیر ملکی قاضی نے اپنا سر نکالا
 غالباً ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے جب کہ نواب صاحب کے دست راست سلام الدین خاں
 چیف جسٹس (پنجاب) اور شعیب قریشی مشیر المہام اور خواجہ اکرم افسر اعلیٰ پولس
 تھے اگرچہ تمام اقتدار نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا لیکن اس اقتدار کے اختیارات
 کا ظہور ان بیرونی حکام کے ہاتھوں میں تھا قدیمی بھوپالیوں نے اپنے حقوق کے
 تحفظ اور ان کے ساتھ نا انصافیوں کے خلاف آواز بلند کی چونکہ نواب صاحب
 کے ارد گرد ان بیرونی افسران کا مضبوط حصار تھا اس لیے بھوپالیوں کی صدائیں
 انفار خانہ میں طوطی کی صدا بن کے رہ جاتی تھیں۔

مغربی سامراج نے جو نوآبادیاتی نظام ایشیا و افریقہ میں قائم کیا تھا وہ
 درحقیقت پرانے دور وحشت کی غلامی کا نیا روپ تھا جس پر غیر مہذب
 قوموں کو مہذب بنانے کا پردہ ڈال دیا گیا تھا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کمزور

وضیف قوموں، مجبور و مقہور لوگوں کے مال و دولت اور محنت کا استحصال کیا جائے ان کے خون پسینہ سے حاصل کردہ منافع پرنا جائز تصرف اور بیجا قبضہ کیا جائے غریب مزدور محنت کش عوام کی محنت کا پھل سرمایہ دار کے ہاتھ آئے یہی وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جو جمہوریت کی نقاب اوڑھ کر اور مشرقی قوموں کو مہذب اور متمدن بنانے کے نام پر ہر جگہ قائم کر دیا گیا تھا ایک طرف تو یورپ نے دور وحشت کی یادگار غلامی کو قانونی طور پر ختم کرنے کا زبردست اقدام کیا لیکن دوسری طرف نوآبادیاتی نظام کو ایشیا و افریقہ پر مسلط کر کے اسی دور غلامی کو نئی شکل دیدی اس میں شک نہیں کہ پچھلے جاگیردارانہ نظام میں بھی نواب راجہ، بادشاہ لوگ عوام کی محنتوں سے گلچھرے اڑاتے تھے لیکن گاہے گاہے غریب کسان اور محنت کش طبقہ کو آنسو پونچھنے کے لیے اکرام و انعام اور حقوق کے نام پر کچھ نہ کچھ دیدیا کرتے تھے لیکن یورپ کا لایا ہوا صنعتی سرمایہ دارانہ نظام اس قدر ظالم و جاہل اور سنگدل بن کر آیا کہ اس نے یہاں کے غریب باشندوں کا خون پھوڑ کر ان کو بے دم کر دیا۔

تاریخ کی صبح نمودار ہونے سے پہلے قوموں، قبیلوں کی آمد و رفت اور ایک مقام سے دوسرے منتقلی اور زور زبردستی یا رضامندی سے ان مقامات پر اقامت فرمائی کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے جو کچھ عرصہ بعد لڑ بھڑ کر یا پریم و پیار سے مقامی و بیرونی لوگ باہمی اختلاط اور ایک دوسرے سے مل جل کر اور شیر و شکر ہو کر رہنے لگتے تھے اس کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کہ کمزور قوموں پر حملہ آور ہو کر طاقتور بادشاہوں اور فاتح سپہ سالاروں کا لوٹ مار کرنا ایک محبوب مشغلہ رہا ہے لیکن ایک قوم کا استحصال کر کے اس کے حاصل کردہ فوائد و منافع کو اپنے ملک کو منتقل کرنے اپنے ملک کو دولت مند و مال دار بنانا اور دوسرے کے ملک کو مفلس و تلاش کرنا، اپنے شہر کو گل و گلزار بنانا، اور دوسرے کے ملکوں کو اجاڑ کر ویرانہ بنانا مغربی سامراج کا لایا ہوا وطیرہ

ہے جس نے پوری دنیا میں خلفشار پیدا کیا اور دنیا کو معرکہ کارزار بن رکھا ہے۔

ریاست بھوپال اگرچہ اس وقت تک جاگیر دارانہ دور سے گزر رہی تھی لیکن سرمایہ دارانہ ہوائیں بھی چلنا شروع ہو گئیں تھیں ان ہوائوں کے اثر سے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا سب سے پہلے ینگ مین نیشنل ایسوسی ایشن کی داغ بیل ۱۹۲۹ء میں پڑی اس کے بنیادی ارکان دیوان دولت رائے، انیسال دین انصاری، گوبند پرشاد آفتاب تھے پھر بابو عبدالکریم سابق سشن جج، عبدالحمید صاحب سابق ہلیٹھ آفیسر محمود اعظم فہمی اور حامد حسین اس کے ممبر تھے یہی وہ حامد حسین بھوپالی ہیں جن کے صاحبزادے ڈاکٹر عابد حسین نے ریاست کو خیر باد کہہ کر اور جامعہ ملیہ کی تحریک میں شریک ہو کر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب صدر کی طرح تعلیمی و تصنیفی میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی بھوپال کے اس فرزند نے یہیں ہوش و شعور کی آنکھیں کھولیں یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر آگے بڑھ کر جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر جامعہ ملیہ کو اپنا مرکز بنایا ایسے ہی بھوپال کے ہونہار فرزند ڈاکٹر اغرا زالدین خان بھی تھے جن کی علمی و فنی صلاحیتوں سے بیرون ریاست مستفید ہوئی لیکن بھوپال میں ان کی ریاستی دور تک کوئی قدردانی نہ ہو سکی اس موقع پر پھر ہم بزمی صاحب کی ریاستوں کی سیاست کا اقتباس اس لیے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے یہاں کی سیاست کا پورا پس منظر آنکھوں کے سامنے آجائے گا وہ لکھتے ہیں۔

ریاستوں میں سیاسی بیداری کو روکنے اور عوام میں طلب حقوق کے احساس و شعور کو مٹانے کی جو کوششیں کی جاتی ہیں اس کی ایک مثال ینگ مین ایسوسی ایشن چند ماہہ تاریخ سے ملتی ہے اس ایسوسی ایشن کی تحریک نے ریاست کے ذہن اور ہر جوش تعلیم یافتہ جوانوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا اگر یہ جماعت زیادہ عرصہ

تک قائم رہتی تو اپنے نصب العین اور اصول کار کے اعتبار سے ہر پھر
کر صحیح راستہ پر آ جاتی لیکن حکومت بھوپال نے جو یہی اس کی آئندہ طاقتوں کا
احساس کیا فوراً اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھنا ضروری سمجھا اور اس کے ممبروں کو
اس طرح خائف و ہراساں کیا گیا کہ چند مہینوں کے اندر اس جماعت کے سارے
اجزاء منتشر ہو گئے۔

بھوپال کے باشندوں کی شکایت کا سبب سرکاری ملازمتوں پر پردیسیوں
کا قبضہ بنا یا گیا۔ اس سوال نے بھوپال میں نہایت شدت اختیار کر لی اور
دیسویوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ینگ مین ایسوسی ایشن قائم کی اس جماعت
نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ بھوپالیوں کی ملازمت میں داخل کرنے کا
مطالبہ کیا اور مقامی لیڈروں نے عوام کے اس مطالبہ کی کونسل میں نمائندگی
کی اس شور و ہنگامہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرمانروائے بھوپال نے پبلک سروس کمیشن
کے نام سے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا اور اس بات پر غور ہونے لگا کہ آیا
بھوپالیوں میں سرکاری عہدوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت ہے بھی
یا نہیں اس کمیشن نے بڑی لمبی چوڑی تحقیقات کے بعد اپنی ایک رپورٹ پیش
کی اس رپورٹ کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب تھی اس کا کاغذ چکنا اور دبیر تھا
اس کی سلائی بنائی بھی نہایت سلیقہ کے ساتھ کی گئی تھی لیکن کیونکہ کمیشن
اہل بھوپال کے منتخب اور قابل اعتبار لوگوں پر مشتمل نہ تھا اس لیے قدرتا معنوی
اعتبار سے اس میں اہل بھوپال کے لیے کوئی خوبی نہ تھی اس میں یہ بتلایا گیا کہ
بھوپال میں سرے سے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے
ان میں نہ تو اعلیٰ تعلیم اور نہ عقل و ذہانت کے اعتبار سے وہ سرکاری کام
چلانے کے اہل ہیں نیز اس میں یہ بھی ثابت کیا گیا تھا کہ اہل بھوپال محنت سے
جی چراتے ہیں اور کاہلوں کی طرح بیٹھے بیٹھے مفت کی روٹیاں توڑنے کے خواہاں
رہتے ہیں اس قسم کی بہت سی باتوں کے لکھنے کے بعد سفارش کی گئی تھی کہ چیرا سیوں

اردلیوں، اور اسی قسم کی گھٹیا ملازمتوں کے علاوہ دوسری اعلیٰ ذمہ داریوں کے پوری طرح اہل نہیں ہیں اس لیے آئندہ سے چہر اسی گیری وغیرہ کی ملازمتیں صرف ان کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے رہ گئیں دوسری اسامیاں اگر موزوں بھوپالی مل سکیں تو حتی الامکان ان کے تقرر کو غیر بھولیوں پر ترجیح دینا چاہیے۔ جب پبلک سروس کمیشن کی یہ رپورٹ شائع ہوئی ریاست مسیس کوئی منظم جماعت ایسی نہ تھی جو عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر کے اس کی رہنمائی کرتی یٹنگ میں ایسوسی ایشن کے نام سے جو جماعت یہاں بنائی گئی تھی وہ رپورٹ کی اشاعت سے بہت پہلے عملاً شکست کرائی جا چکی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس رپورٹ کی سفارشوں سے عوام بالکل مطمئن نہ تھے لیکن ان کی زبانوں پر خوف و دہشت کی مہر لگا دی گئی تھی انھیں لب شکایت و اکرنے سے باز رکھا۔ تاہم چوں کہ دل غیر مطمئن نہ تھے اور حکومت کے بعد کے عمل نے اس بے اطمینانی میں اور اضافہ کر دیا تھا اسی لیے اضطراب و بے چینی کی یہ چنگاریاں آہستہ آہستہ سلگنا شروع ہوئیں اور بالآخر چار پانچ سال کے بعد ۱۹۳۴ء کے وسط میں دفعۃً شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں حکومت کی غیر دانشمندی اور سخت گیری نے اس شعلہ کو ہوا دی پیسیوں گرفتاریاں عمل میں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ ساری ریاست میں پھیل گئی۔ جب اس اشتعال اور ہنگامہ نے نازک صورت اختیار کر لی تو فرمانروائے بھوپال نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ سرکاری نوکریوں کے متعلق اہل بھوپال کے مطالبہ کو جائز قرار دیتے ہوئے آئندہ سے انھیں نوکریاں دینے کا وعدہ کیا علاوہ ازیں دو تین خیراتی فنڈ کھولے گئے جس کا منشا تھا کہ عوام کی معاشی شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے اس اعلان کے بعد ساری نوکریوں میں بھوپالیوں کی بھرتی کا تناسب کچھ بڑھ گیا مگر یہ بھرتی صرف ادنیٰ اور ادنیٰ سے ذرا اعلیٰ ملازمتوں تک محدود رہا۔ نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کو عموماً اس بھرتی کا نقطہ عروج سمجھا چاہیے ریاستوں کی سیاست ص ۱۶ تا ۱۹

بہر حال بھوپال کی پہلی گریجویٹ ایسوسی ایشن کا جو حشر ہوا تھا وہی ننگ میں ایسوسی ایشن کا ہوا نواب صاحب نے ان نوخیز نوجوانوں کا سلک ملازمت سے منسلک کر کے اور عہدہ مناصب دے کر منہ بند کر دیا اگرچہ ان کی دلی ہمدردیاں ملکی تحریک سے وابستہ رہیں مگر ملازمتی زنجیر میں جکڑ بند ہونے کی وجہ سے میدان سیاست سے کوسوں دور رہے۔

البتہ حامد رضوی وکیل جو بھوپالی سیاست کے گاندھی کہے جاتے تھے حقوق طلبی کے میدان میں ۱۹۲۹ء میں انٹرے اور انھوں نے ملکی و غیر ملکی قضیہ کے لیے قانونی جنگ کا بگل بچا دیا حامد رضوی صاحب پہلے سیاسی رہنما ہیں جنہوں نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں اور کتابچوں کے ذریعہ اہل بھوپال میں سیاسی شعور کانچ بویا اور اپنے حقوق کے حاصل کرنے کے لیے میدان میں آنے کی دعوت دی۔ وہ مفکر ہونے کے ساتھ جذباتی و عملی آدمی تھے انھوں نے تجلیات ۱۹۳۳ء کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا

جس کے اندر بھوپال کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ افراد کی فہرست شائع کی ان کی قابلیت و صلاحیت کی نشاندہی کی۔ اور ان کے حق واقعی کی محرومی پر مناسب الفاظ میں روشنی ڈالی جس کی بناء پر ریاست کو پبلک سروس کمیشن کے نام کی ایک کمیٹی تشکیل کرنا پڑی جس کا کچھ حال ابھی گزر چکا۔

انجمن رعایائے بھوپال

ریاست میں حقوق طلبی کا جو پرچم بلند ہوا تھا جس نے ملکی و غیر ملکی کے قضیہ نامرضیہ کی بناء پر شہرت اختیار کر لی تھی یہ پرچم ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو قانونی حدود کے اندر رہ کر اپنی آواز بلند کر رہے تھے اس راہ میں غیر معمولی جرات و بہمت و ارادہ رسن کی دعوت پر لبیک کہنے کی بہت نہ سکتے تھے حالانکہ حق پسندی و انصاف طلبی کے لیے لبدائے مقصد سے ہمکناری

اس دنیا میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس راستہ کا مسافر
 مجنوں نہ بن جائے کیوں کہ حق و انصاف کے حصول کی منزل تک پہنچنے کے لیے
 ایسے مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے جو خطرات سے بھرے ہوئے ہوں اس
 لیے حقوق طلبی کا میدان ایسے مردان کار کی راہ تک رہا تھا جو نن من دھن
 کی بازی لگا کر اس راہ کو پامال کریں یہ حقیقت ہے کہ ریاست کے اہم عہدوں
 پر جو باہر کے افراد قابض بن بیٹھے تھے انھوں نے ریاست کو اپنے مفادات
 کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور مقامی باشندوں کو حقارت کی نگاہ سے
 دیکھتے ان اور ان کے ساتھ اہانت و ذلت کا رویہ اختیار کرتے ان واقعات
 سے شہر کے خود دار لوگوں کے دلوں میں ان احکام بالا کے خلاف نفرت کی آگ
 بھڑک اٹھی۔ پھر عدالت کی طرف سے ایسی ہی ایک واقعہ نے وہ کام جو فیملہ بارو
 کے لیے کام کرتا ہے اس لیے فروری ۱۹۳۷ء میں انجمن رعایا نے بھوپال بنی
 جس کے صدر سعید اللہ خاں رزمی نائب صدر وٹھل واس بجاج، اور ستار جال
 سکریٹری تھے۔ بھوپال کے بابائے سیاست سعید اللہ خاں رزمی بھوپال کے
 ان نوجوانوں میں سے پہلے نوجوان ہیں جنھوں نے تحریک خلافت کی دعوت پر
 لبیک کہہ کر ۱۹۱۹ء میں بھوپال کو خیر باد کہا اور ہندوستانی کی گرم سیاست
 میں کود کر حصہ لیا تھا بعد میں اجیر و راجپوتانہ، ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز
 بنا۔ جب ہندوستان میں تحریک ہجرت کا ۱۹۱۹ء میں آغاز ہوا تو ان کی گرمی
 تقریر سے نوجوانوں کے سینوں میں آگ لگ گئی اور وہ بھوپال کو چھوڑ کر ہجرت
 پر چل پڑے ہوئے جب بھوپال میں ملکی و غیر ملکی قضیہ نے سر نکالا تو رزمی صاحب
 نے یہ انجمن مذکور قائم کر کے سب سے پہلے حقوق طلبی کی آواز کو بلند کیا اور
 ریاست کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا لیکن رزمی صاحب ہندوستانی
 سیاست کی راہ سے ریاستی سیاست میں آئے تھے اس لیے ریاستی اور
 برطانوی سیاست کے مزاج کے اختلاف کی بناء پر عوام و خواص کو ایک

پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

رزمی صاحب ایک پرانے تجربہ کار سیاست داں تھے لیکن تیز مزاجی، زود اشتعالی کی وجہ سے عوام کو اپنے ارد گرد جمع نہ کر سکے انجمن بازی عمر بھر ان کا مشغلہ رہا۔ سب سے پہلے انجمن رعایا بھوپال پھر سوشل سروس لیگ اور پھر آل بھوپال پوٹیکل کانفرنس بنائی اس کے بعد بھوپال اسٹیٹ کانگریس، پھر سنٹرل مسلم بلاک اور آخر میں سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے غرض ہر دور میں وہ اپنی سیاست کیلئے نیا محور تلاش کرتے رہے۔ اور اپنی اس تلون مزاجی کی وجہ سے ریاستی عوام کے مسلم لیڈر نہ بن سکے۔

انجمن خدام وطن کی تشکیل

انجمن رعایا بھوپال کے مقابلہ میں چند نوجوانوں نے انجمن خدام وطن بنائی جس کے پہلے صدر آصف علی تھے جو عدالت کے ایک سربراہ کے توہین آمیز فقرہ کے زخم خوردہ تھے سید حافظ علی، شاکر علی خاں ان کے بنیادی ارکان تھے اس انجمن نے عوام میں حامد رضوی صاحب اور خالد میاں جیسے مدبروں کی پشت پناہی سے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔

جس طرح بارش کا موسم آتے ہی سوکھی زمینوں میں ہریالی اور کھیتوں میں پانی کی قطر افشانی سے سرسبزی و شادابی اور باغوں میں گل و ثمر کی جلوہ نمائی کا منظر ابھر آتا ہے اسی طرح بنجر زمینوں میں گھاس پھوس اور کانس نکل آتا اور حشرات الارض بھی اہل پڑتے ہیں اسی طرح ریاست میں ۱۹۳۴ء میں جب حقوق طلبی کی برسات کا موسم آیا تو بیشمار انجمنیں بن گئیں اور حشرات الارض کی طرح لاتعداد اخبارات اہل پڑے۔ لیکن یہ انجمنیں اور اخبار دو، دو، چار چار قدم چل کر بیٹھ گئے مگر اخبار صبح وطن بار بار ضبط ہو کر عوام کی ترجمانی کرتا رہا اس میدان میں سبب نہ سپر رہا۔ بھوپال کی سیاسی تاریخ میں وہ اندھیری رات

ہمیشہ یادگار رہے گی جس کے اندر چند نوجوان شاکر علی خاں، طہور ہاشمی، نور باز خان وغیرہ قاضی شریف حسین خاں کی مسجد میں جمع ہوئے مسجد کے محراب و منبر کے سایہ میں اپنے خدا سے ملی و وطنی بھائیوں کی سچی خدمت کا عہد و پیمان باندھا یہ عہد و پیمان صبح وطن بن کر نمودار ہوا۔ بھوپال کے دور جدید کے اخبار میں یہ پہلا اخبار تھا جس نے کھل کر ریاست کی پالیسی کی مخالفت کی۔

بھوپال کی صحافت کا آغاز گو ہفت روزہ عمدۃ الاخبار ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء سے ہوا تھا لیکن جس اخبار نے ریاست کے حکمرانوں پر تنقید کر کے پھیل پیدا کی وہ منشی عبدالکریم اوج کا اخبار موج نربد ۱۸۷۳ء ہے جس کی بنیاد پر بھوپال سے ان کا اشراج ہوا۔ منشی صاحب نے ہوشنگ آباد میں پہونچ کر پھر موج نربد کو جاری کیا۔ جس کے اندر ریاستی سیاست پر چٹکیاں لی جاتی تھیں اس کے بعد سے علی و مذہبی اور ادبی اخبار نکلتے رہے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس لیے صبح وطن پہلا خالص سیاسی اخبار تھا جو یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو جاری ہوا۔ ابتداء میں سید رفیق حسین ایڈیٹر تھے بعد میں شاکر علی خاں نے اس کے ساتھ ڈاکٹر دوست محمد خاں نے رہبر وطن نکالا جو ایک قابل اعتراض مضمون کی بناء پر ضبط ہوا اور ڈاکٹر صاحب کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔ صبح وطن کی پیشانی پر ابتداء خدام وطن کا نام نہ تھا بعد میں جون ۱۹۳۶ء میں وہ اس انجمن کا نقیب بن گیا۔ شاکر علی خاں اس کے ایڈیٹر ہوا۔ اس اخبار کے خاص کارٹونسٹ ایم عرفان تھے جن کے کارٹونوں نے غیر ملکی حکام کے خلاف بیجان برپا کر دیا ان کارٹونوں کے چھاپنے سے حکومت کی ڈر کی بناء پر بھوپال پریس انکار کر دیتے تھے اس لیے فضل علی سرور اور عبدالرحمن کو کب منیجر جیسے نوجوانوں نے خفیہ پریس قائم کر کے چھاپنا شروع کیا اب صبح وطن بھوپالیوں کے آرزوؤں کا ترجمان بن چکا تھا۔ اس لیے اس کا لغزہ بھوپال بھوپالیوں کے لیے بن گیا صبح وطن کے دو دور تھے۔

پہلا دسمبر ۱۹۳۳ء سے مئی ۱۹۳۴ء تک دوسرا جون ۱۹۳۴ء سے شروع ہوا
 تھا جس کے اندر شاکر صاحب قدوس صہبائی شامل تھے شخصی حکومت کی
 پابندیوں کی وجہ سے ابتداءً اس کی تحریریں نرم و ملائم اور متوازن لہجہ
 میں رہیں لیکن ان کے بین السطور میں بغاوت کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی تھیں۔
 جب حکومت اس نرم لہجہ سے متاثر نہ ہوئی تو اس کے مضامین سے شعلے بلند ہونے
 لگے اور حکومت کا پنجہ اس کی طرف بڑھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر شاکر علی خاں،
 اور بھگوان دیال نشاط مدیر اعزازی تھے۔ صبح وطن اپنے نرم گرم تحریروں
 کی وجہ سے عوام میں اس قدر مقبول ہوا کہ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بکھل جاتا
 بھوپال میں ایسی مقبولیت اور کسی اخبار کو حاصل نہ تھی اس کا ایک شمارہ
 ۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ء دو آنے کے بجائے پانچ پانچ روپیہ میں بکا جس کے اندر
 ریاستی حکام کے خلاف کارٹون چھپے تھے اس اخبار کے علاوہ اخبار پیام
 ۱۹۳۴ء شوکت علی، ظہیر الدین انصاری آواز ۱۹۳۳ء عبدالکریم، کبیر قریشی
 شریف عظمیٰ، اخبار رہنما ابو سعید بزمی، مشیر وطن ۱۹۳۵ء بھگوان دیال نشاط،
 زبیر قریشی، فدائے وطن عبدالغفار خان، ناخدا عمران انصاری، دہقان
 اخلاق محمد خاں۔ کی ادارت پبلک شائع ہوئے ٹھاکر لال سنگھ نے ہندو مہاسبھا
 کی طرف سے پر جا پکار ہندی ۱۹۳۵ء اور سیٹھ کشمی پر جا پتر ۱۹۳۵ء میں نکالا
 ان اخباروں میں سنجیدہ و سائنشتہ نرم گرم انداز میں حقوق طلبی کے مضامین
 منظر عام پر آنے لگے اور بھوپال کے عوام میں حقوق طلبی کا شعور بیدار ہوتا گیا
 انجمن خدام وطن کے اندر جن نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ابو سعید بزمی
 قدوس صہبائی، طرزی مشرقی، لطف اللہ نظمی فضل علی سرور وغیرہ وغیرہ
 پیش پیش تھے پھر اس انجمن کے گویا مستقل صدر طرزی مشرقی ہوئے اور
 آصف علی خاں نائب صدر رہے اخبار صبح وطن کے خلاف گورنمنٹ نے مقدمہ
 قائم کر کے شاکر علی خاں، احمد علی، عبدالرحمن کوکب وغیرہ کو تین ماہ کے لیے

جیل بھیج دیا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ فرنگی سامراج کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت مسلم علمائے حق نے اپنا مذہبی و ملی فریضہ سمجھ کر اپنے کندھوں پر اس وقت اکٹھا یا جب کہ برادران وطن خصوصاً بنگال کے بابو انگریزی تعلیم و تہذیب کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے اور فرنگی سامراج کے اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے میں پیش قدمی کر رہے تھے چوں کہ برطانوی سامراج نے پورے ملک کو مسلمانوں سے ہی چھینا اور اس پر نا جائز قبضہ جمایا تھا اس لیے وہ اس میدان میں سب سے پہلے کودے۔ برادران وطن کی سیاست کا آغاز تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء سے ہوا تھا جب کہ علمائے حق فرنگی سامراج کے خلاف محاذ قائم کر کے کئی معرکہ سرچکے تھے۔ بہر حال جس طرح ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کے قدم پہلے پڑے تھے اسی طرح ریاست بھوپال کی بھی خوش قسمتی ہے کہ یہاں بھی حقوق طلبی کی جنگ میں مسلمان ہی پیش پیش رہے اور اس سیاسی جنگ کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیا بلکہ اس کی قوم پروری کے سانچے میں ڈھالا ریاست کی ہندو اکثریت اس تحریک سے بے تعلق رہ کر زیادہ تر تجارت کی گرم بازاری میں لگی رہی چنانچہ ماسٹر لال سنگھ جو بعد میں پر جامنڈل کے لیڈر کی حیثیت سے ابھرے ابتدا میں ۱۹۳۴ء مہاسبھا کی داغ بیل ڈالی ایسے ہی پنڈت چترنارائن مالوی پنڈت لکشمں جی رپا اور دیگر برادران وطن اس تحریک میں شامل ہوتے چلے گئے بہر حال ان تحریکات کا سارا بوجھ مسلمانوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا اس طرح ہر آزادی پسند ایک ایک کر کے شامل ہوتا گیا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور قاف بدلتا گیا

ریاست میں پہلی انتخابی کشمکش ۱۹۳۴ء

ریاست بھوپال کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں عہد سلطانی میں دستور ساز اسمبلی (جیسیٹو کونسل) قائم ہوئی جو شہر و مضافات کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن اس کی بنیاد پرانے جاگیردارانہ نظام پر رکھی گئی تھی اس لیے سرکار اپنے و فساداروں خوشامدی لوگوں اور جاگیرداروں کو رکن بناتی تھی اس طرح اس کی بناوٹ الیکشن کے بجائے سلسلشن پر مبنی تھی لیکن جب بھوپال میں سیاسی انجمنیں بنیں اور ان کے ذریعہ عام رعایا میں حقوق طلبی کا جذبہ ابھرا اور سیاسی شعور بیدار ہوا تو اب حکومت کے چٹم ابرو کے اشارے پر نمائندہ منتخب کرنے کے بجائے اپنے پسندیدہ نمائندہ کو کھڑا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا چنانچہ جب کونسل کا انتخابی اعلان ہوا تو سرکار کے حمایتی نصیر الدین وکیل کے مقابلہ میں ستار جمال، بھوپال کے نمائندہ کی حیثیت سے اس میدان میں اترے ان کا یہ اقدام پچھلی روایات کے خلاف غیر معمولی اقدام تھا اس لیے عوام میں زبردست ہماہمی پیدا ہوئی۔ برطانوی ہند کی انتخابی کشمکش کا نظارہ ریاست میں پہلی بار دیکھنے میں آیا عوامی جوش و خروش سرکاری مشنری پوری حرکت میں آنے کے باوجود اپنے نمائندہ کو کامیاب بنایا جس کا سرکاری حلقوں میں سخت رد عمل ہوا ستار جمال کے خلاف ان کی نااہلیت کے عذر داری کا مقدمہ ۱۹۳۴ء میں دائر ہوا اور ان کے خلاف فیصلہ ہوا اس فیصلے نے بھوپال کی سیاست میں نئی کڑوٹ لی عوام میں حکام بالا کے خلاف نفرت کی لہر پھیل گئی تو اب صاحب اس وقت انگلستان میں تھے جب بھوپال واپس ہوئے تو ازراہ سیاست مراجع خسروانہ کے عنوان سے ایک فرمان جاری کیا جس کے اندر ستار جمال کے دوبارہ کونسل کی امید داری کے لیے کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی پھر ستار جمال جب مقابلہ میں کامیاب ہوئے تو صبح وطن نے ”غیر ملکی فرعون

کی شکست فاش کے عنوانوں سے اس خبر کو شائع کیلئے گرم احساسات بظاہر ٹھنڈے پڑ گئے لیکن اندر ہی اندر ہی حکام بالا کے خلاف جذبات پرورش پاتے گئے اور سیاسی انجمنیں اور اس کے سیاسی کارکن اس کو ہوا دیتے رہے۔ اس عوامی فتح نے سیاسی رہنماؤں میں ایک نیا حوصلہ اور نیا ولولہ بکھڑے ہوئے مشیرازہ کو جمع کرنے کا خیال اور حکومت سے سیدھا سیدھا ٹکریلینے کا عزم پیدا کیا اس وقت شاکر علی خاں ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح غیر ملکیوں کے خلاف ایک ہی ہلا بول کر فتح کا جھنڈا لہرانے کا ارادہ کرنے لگے چنانچہ شاکر صاحب نے صبح وطن میں ایسا کارٹون چھاپنا چاہا جس سے عدالت کی تحقیر ہو سکے اور چھپنے سے پہلے کانوں کان اس کی خبر نہ ہو ایم عرفان نے وہ کارٹون بنایا اور صبح سویرے چھپتے ہی سڑکوں پر گوراموں پر لگ گیا پورے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ خفیہ پولیس پاگلوں کی طرح سڑکوں پر دوڑتی اور اس کو بھاڑتی نظر آنے لگی پولیس ساڑھے چار بجے صبح وطن کے دفتر میں شاکر علی خاں، احمد علی، سید حافظ علی، بھگوان دیال نشاط کے نام و رانٹ لے کر پہنچ گئی۔ علوی پریس کی تلاشی لی اور اس کے مالک اصغر حسین صاحب کا ضمانتی و رانٹ لے کر پریس میں حاضر ہوئے مولوی صاحب نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا صبح وطن کی تلاشی پر ہزاروں شہریوں کا سیلاب امنڈ آیا بھوپال کی سیاسی تاریخ میں یہ سب سے بڑا عوامی مظاہرہ تھا جو پولس کے خلاف ظہور میں آیا۔ اخبار کا چارج قدوس مہبانی اور فضل انصاری نے لیا جب ۲۲ اگست ۱۹۳۳ء کو ان کو دہلی سے عدالت لایا گیا تو راستہ میں انسانوں کا دریا لہریں لے رہا تھا بھوپال زندہ باد صبح وطن نیکدہ باد کے نعروں سے پوری فضا گونج رہی تھی۔ حکومت نے عوام کو مرعوب کرنے کے لیے جیل پہاڑی سے عدالت تک دو روپے پولس لائن کھڑی کر دی تھی لیکن عوام بے تحاشا گھروں سے نکل کر ان سیاسی قیدیوں کی پذیرائی کر رہے تھے بعض پر جوش لوگ اسٹکوں سے مسلح ہو کر اپنے محبوب رہنماؤں کو چھڑانے

کے عزم سے آئے تھے لیکن پولس کی مدافعت سے زیادہ ولی عہد عابدہ سلطان کی یقین دہانی اور خود ان رہنماؤں کی کلاپسیل پر جمع پیچھے ہٹ گئے شاہ کریم علی نے بیان دیا کہ میں غیر ملکی جج صاحبان کو جواب نہیں دوں گا اگر بھوپالی جج ہوں گے تو جواب دوں گا۔ میں نے ہی کارٹوں بنایا اور اس کو چھایا ہم نے عدالت کی کوئی تحقیق نہیں کی اگر کرنا ہوگا تو ڈنگے کی چوٹ پر کروں گا ۱۵ اگست ۱۹۴۶ء میں تین ماہ کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا بھگوان دیال نشاط بری کر دیئے گئے یاد رہے کہ یہ سید حافظ علی وہی سیاسی کارکن ہیں جن کو ریاست نے آخر میں سلطان پور میں گوشہ نشین ہونے پر مجبور کیا۔ اسی روز شام کو مولانا رزمی دہلی سے بھوپال پہونچے اور کملا پارک میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ایسی دلولہ انگینر تقریر کی کہ عوام کے دل و دماغ کو گرما دیا۔

پریس ایکٹ کا نفاذ ۱۹۳۶ء

چوں کہ حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں قومی اخبارات خصوصاً صبح وطن کا بڑا ہاتھ تھا اس لیے حکومت نے قانون پریس ایکٹ ۱۹۳۶ء میں اخبارات کا گلا دبانے کے لیے بھوپال کونسل سے پاس کرانا چاہا مولوی عبدالغفور وزیر قانون انصاف نے کونسل میں اپنی رپورٹ کو سنایا جس کے اندر سیٹھ من موہن داس اور مفتی فضل اللہ کا اختلافی نوٹ تھا لیکن حامد رضوی صاحب نے اصل مسودہ سے اختلاف کیا ستار جمال نے کہا میں نے اس مسودہ کو نافذ الوقت پریس ایکٹ کی موجودگی میں قطعاً غیر ضروری اور غیر آزادی تحریر و تقریر کیلئے ناواجبی جکڑ بندیلوں کے مترادف سمجھا ہوں مولانا خالد انصاری نے اصل مسودہ سے مکرر اختلاف کرتے ہوئے دفعہ ۵۳ کے حوالہ سے کہا کہ اس مسودہ کو اجلاس میں پیش کرنا اس لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے پہلے سے مشنہری نہ ہو سکی مولانا کی اس گرفت سے سرکاری پیچ پر سناٹا چھا گیا لیکن جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا

ہے کہ طاقت و اکثریت کے بل بوتے پر یہ کالا قانون اسی طرح پاس کر دیا گیا
جیسا ہماری قوی پارلیمنٹ میں پاس ہو جاتا ہے۔

بھوپال نیشنل لیگ کا قیام

پریس ایکٹ کے اس کالے قانون کے ساتھ مزید ایک اور سنگین قانون
ملا زمان سرکاری کے لیے پاس کر دیا گیا کہ وہ گورنمنٹ کے خلاف کسی تحریک
میں خفیہ یا علانیہ حصہ نہ لیں اس لیے سیاسی کارکنوں کا پہلا جلسہ منصب منزل
احمد آباد اور دوسرا جلسہ حامد رضوی صاحب کے مکان پر زیر صدارت
ملک راج منقدر ہوا صدارت کی تجویز شاکر علی خاں اور تائبہ حکیم قمر الحسن
اور ظہیر الدین انصاری نے کی۔ تائبہ سے پہلے بھوپال نیشنل لیگ کا قیام عمل میں
آیا حافظ نصیر الدین ٹھیکیدار صدر۔ پنڈٹ لکشمی آیانائب صدر شاکر علی خاں
ایدیٹر صبح وطن سکریٹری ظہیر الدین انصاری نائب سکریٹری ملک راج خزانچی مونس
مجاہد کے ارکان میں حامد رضوی مولانا خالد انصاری۔ ابوسید بزمی۔
کھاکر لال سنگھ نصیر الدین وکیل۔ عطیہ اللہ خاں حکیم سید قمر الحسن تھے۔
اس جماعت کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

(۱) نظام حکومت میں مناسب اصلاحات کے پرامن و آئینی ذرائع سے
تجدد و جہد کرنا۔

(۲) ریاست کا ادنیٰ و اعلیٰ تمام سرکاری ملازمین میں اہل بھوپال کو داخل
کرنے کی سعی کرنا۔

(۳) عوام کے داغوں کو تربیت دینا اور ان کو دستوری اصولوں اور
بنیادی حقوق سے واقف کرنا۔

(۴) افلاس و بے روزگاری و جہالت کا کلینہ استیصال کرنے کے لیے بنیادی
اصلاحات کے حصول کی کوشش کرنا

۵، کاشتکاروں اور پسماندہ طبقات کی معاشرتی و ذہنی و اخلاقی سطح کو بلند کرنا دستوری اصول کے مطابق فرقہ اور ہر طبقہ کے جائز اور قانونی حقوق کی حفاظت کرنا۔ (شعلہ حیات یکم ستمبر ۱۹۳۷ء)

اب صبح وطن ثانی کے ایڈیٹر شاکر علی خاں اور اعزازی مدیر قدوس مہربانی ہو چکے تھے اور بھوپال اخبار "نوجوان" عمران انصاری بد مصنف، ششیام بہاری لال نے نکالا۔ حکومت کی طرف سے اخبار ندیم ۱۹۳۷ء محمود الحسن صدیقی کی ادارات میں نکالنا شروع ہو چکا تھا اب ہم سماں اخبار صبح وطن کا ایک ادارہ نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے انداز تحریر کا اندازہ کیا جاسکے؟

دہ بھوپال میں ملکی و غیر ملکی کا سوال جو اہمیت حاصل کر چکا ہے وہ ظاہر ہے یہ امر اہل ملک پر بالبداهت ثابت ہو چکا ہے کہ ملکوں و غیر ملکوں کے درمیان کوئی مستقل حد فاصل قائم نہ کی جائے گی تو ان کے سیاسی و ملکی حقوق محفوظ نہ رہ سکیں گے ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے پیدائشی حقوق کی پامالی ملکی و ملی موت ہے اگر ہمیں اپنی زندگی منظور ہے اگر ہمیں حکومت زندہ رکھنا چاہتی ہے اور بھوپال کے مستقبل قریب میں بھوکے اور ننگ انسانیت افراد کی کوئی شرمناک و ذلیل بستی بنا دینا نہیں چاہتی تو اس کا فرض ہے کہ وہ ہمارے نمائندہ اور دانشمندانہ مشوروں پر عمل کرے ہمارے حیات کے بنیادی اسباب ہم سے نہ چھیننے کہ کسی ملک کی فلاح و ترقی کا راز اس کے پیدائشی حقوق کی حفاظت و اور حیانت میں مضمر ہے صبح وطن ثانی اگرہ ایدیشن یکم نومبر ۱۹۳۷ء

اس کے بعد دوبارہ صبح وطن میں ایک قابل اعتراض کارٹون مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا جس پر حکومت بھوپال کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور ۲۲ سال کی قید بامشقت دی گئی اس کارٹون میں ایک حوض دکھایا گیا تھا جس کا پانی ٹوٹیوں کے ذریعہ سے غیر ملکی حکام بھر رہے تھے اور دیسی لوگ اپنے برتن لیے ہوئے ان کے منہ تک رہے تھے چنانچہ

شاکر صاحب۔ طرزی مشرقی فضل علی سرور۔ عبدالرحمن کوکب سنز یاب ہوتے اس مقدمہ کے سلسلے میں شاکر صاحب نے جیل سے ایک مفصل بیان جاری کیا جس کا قابل ذکر حصہ یہ ہے۔

”تمام انسانوں کا طبعی میلان و شعور تقریباً یکساں رہا ہے یعنی سبھی اپنے وطن میں پھلنا بھولنا چاہتے تھے اور مقام پیدائش سے غذا حاصل کرنا چاہتے ہیں انسان ہی نہیں حیوانات نباتات بھی یہی رجحانات رکھتے ہیں اور وہ حق رکھتے ہیں کہ ان تمام دقتوں کو رفع کریں جو کسی نہج سے ان کے نشوونما میں مانع ہوتی ہوں ان حقائق کے باوجود زندگی اور اس کے بڑھنے کی ہر تڑپ بھوپال میں جرم قرار دی جاتی ہے تو ہم ضرور مجرم ہیں اور یہ جرم ہم سے ہمیشہ سرزد ہوتا رہے گا۔

شاکر صاحب جیل میں ۶ ماہ رہے پھر ان کو والد کی وفات کی وجہ سے رہا کر دیا گیا وہ اس غم کو لے کر بیٹھے نہیں بلکہ پرانی سیاسی سرگرمیوں کا دوبارہ آغاز کیا اور ۱۹۳۷ء تک سیاسی تنظیم میں لگے رہے۔

سیاسی رہنماؤں پر بیجا مقدمات

ریاست میں حقوق طلبی کا وہ قافلہ جو ابتداء میں چند گنے چنے افراد پر مشتمل تھا ریاستی حالات اور برطانوی ہند کی حریت پسندانہ تحریکات کی ہواؤں میں آگے بڑھتا گیا نو جوان طبقہ جن کی رگوں میں ہمیشہ تازہ و گرم خون گردش کرتا رہتا ہے اس قسم کی پر جوش تحریکات میں پیش پیش رہتے ہیں بھوپال میں بھی جید پیشی عمران انصاری، یحییٰ علی خاں وغیرہ جیسے سرگرم نو جوان اس قافلہ میں شامل ہوتے چلے گئے۔

اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ریاستی سیاست کے ساکن سمندر میں غیر معمولی موج پیدا کیا موٹر یونین کے صدر میاں فضل انصاری

نے اپنی یونین کے جلسہ میں حمید قریشی کو دعوت تفریر دی حمید صاحب نے اپنی تفریر میں یونین کے مطالبات کی پرجوش انداز میں حمایت کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ کہے۔

ایسے خداوند جن کی حکومت میں غریب کو روٹی کپڑا اور ضروریات زندگی کا سامان مل سکے ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ان کی زبان سے نکلے ہوئے ان تیروں کا نشانہ حکومت تھی اس کے ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ درج کر لیا گیا جب یہ واقعہ انجمن کے ارکان تک پہنچا تو زیادہ تر لوگوں نے الفاظ کے واپس لینے کا مشورہ دیا لیکن شاکر صاحب نے سختی طرز پر ان سے کہا کہ انسان کے لیے آگے بڑھنا اور لیڈر بننے کے لیے زریں موقع کم آتے ہیں اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے چنانچہ حمید صاحب اپنے موقف پر جیسے رہے اور گرفتار ہو کر نظر بند کر دیئے گئے جب عدالت میں چالان پیش ہوا اور حمید صاحب کو عدالت لایا گیا تو یہ عدالت نے حکم جاری کیا کہ اس مقدمہ کی کارروائی خفیہ ہوگی۔ اس اعلان سے عوام میں جوش و خروش کا سیلاب ابل پڑا اور پریگیٹ سے ہائی کورٹ تک عوام کا سمندر رہا یہیں لینے لگا۔ پولس کی مزاحمت کے باوجود پرجوش عوام کا ایک مجمع عدالت کے کمرے میں گھس پڑا اس کے اندر نشا کر ملیں گے لطف اللہ خاں نظمی وغیرہ بھی تھے اس غیر معمولی ہنگامہ کو دیکھ کر لوگوں کے بھوپال زندہ باد انجمن خدام وطن زندہ باد کے مسلسل نعروں کی گونج نے عدالت کو بوکھلا دیا۔ مقدمہ کی سماعت ملتوی اور خود ملزم پولس کی گرفت سے آزاد ہو گیا عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور حمید قریشی خدام وطن کے ارکان ان لہروں میں بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے پولس ششدر تھی جب عمران انصاری اور دوسرے لوگوں نے قریشی صاحب کو ہار پہنائے تب پولس حمید صاحب کو موٹر میں بیٹھا کر جیل لے گئی لیکن اس حادثہ کی وجہ سے حکومت نے اصل ملزم کے ساتھ انجمن کے ارکان پر بھی دو مقدمہ بلوہ اور نقب زنی کے قائم کر دیئے

قومی رہنماؤں پر یہ انوکھے چارج لگا کر عدالت نے ان سیاسی ملزموں کو اخلاقی مجرموں کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا۔

بجلی کی روشنی میں اس اندھیر نے جاہل و ناخواندہ عوام کے ساتھ سنجیدہ اصحاب فکر کو بھی حکومت سے بدظن کر دیا حکام بالا کے خلاف جو جذبات عوام تک محدود تھے اب ان کا دائرہ خواص تک پہنچ گیا جو جو باغیانہ خیالات سینے میں چھپے ہوتے تھے اب زبان کے ساحل سے ٹکرائے لگے۔ ان مقدمات اور ان کے فیصلوں نے بھوپال کی سیاست کے تھے ہوئے دریا میں روانی پیدا کر دی ان رہنماؤں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دیدی گئی شاکر علی خاں

قدوس مہبائی۔ چتر نارائن مالویہ، نور باز خاں لطف اللہ خاں نظمی حفیظ الرحمن دھورے میاں، غلام رسول قادری عمران انصاری اور حمید قریشی ہیں۔

جب ان رہنماؤں کو دو دو سال کی سزا دی گئی تو میاں اخلاق محمد خاں جو

خدام وطن کے بنیادی ارکان میں سے تھے ایک مضمون در بھوپال قتل گاہ عوام کے عنوان سے مدینہ انبار میں شائع کر دیا ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوا اور وہ اپنے گاؤں سے واپس چلے گئے چھ ماہ کی جلا وطنی کے بعد واپس لوٹے بہر حال قومی رہنماؤں کے ساتھ یہ عجیب و غریب مقدمہ اور اس کا فیصلہ بھوپال کی ان ہنگامی ریاست کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔

عہ پر پروانہ شاید بادبان کشتی مٹی تھا۔

ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

بھوپال کا دوسرا انتخابی ہنگامہ

ایک طرف حقوق طلبی کا قافد بوڑھوں کے ساتھ نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے کر

قدم بڑھا رہا تھا دوسری طرف ریاست میں لیجسلیٹو کونسل کے دوسرے انتخاب کا شور پھیلا سرکار کے حمایتی امیدواروں کے ساتھ انجمن خدام کے کچھ ارکان

ابو سعید بزمی، قدوس صہبائی، محمود الحسن رسیہ پور، اور مدن لال گپتا ہی میدانِ انتخاب میں انترے بزمی صاحب نے اپنی تقاریر کے علاوہ سچی باتیں کر دی باتیں، کے عنوان سے عوام میں حقوق شناسی کے پمفلٹ شائع کئے ایک طرف انتخابات کی وہ شور و شوری رہی کہ الامان والہ نظروں سے گریز نہ ہو یہ بے شک ہوئی کہ جب مدن لال گپتا کے علاوہ عوامی نمائندے کامیاب ہوئے تو بزمی صاحب کے خلاف ان پمفلٹوں کی بناء پر مقدمہ قائم ہوا اور سزایاب ہو کر جیل بھیج دیئے گئے بہر حال ان نمائندوں کے عوام کے حقوق کی ترجمانی کی ان کی وجہ سے کونسل میں ہما بھی رہی۔

پر جامنڈل کا قیام ۱۹۳۸ء

ریاست بھوپال میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز چند گرم جوش منچلے نوجوانوں کے ہاتھوں ہوا تھا جو سب کے سب مسلمان تھے لیکن پچھلی سیاسی کاروائیوں کے اتار چڑھاؤ نے ہر طبقہ خیال کو اپنی طرف کھینچ لیا برادرانِ وطن جو ابھی تک اپنے خول میں بند اور مہاسبھا جیسی جماعتوں کے حصار میں محصور تھے خدامِ وطن کی تحریک نے ان کے اندر زندگی کا ولولہ اور مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا اس لئے جس طرح شیخ الہند کی تحریک جہاد کی ناکامی نے علماء حق کو آزادی ہند کی مہم میں برادرانِ وطن کے اشتراک پر مجبور کیا اسی طرح خدامِ وطن کے کارکنوں نے حقوق طلبی کی تحریک کے اس معرکہ کو یکہ و تنہا سر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے ماسٹر لال سنگھ پنڈت چتر نارائن مالوی اور دیگر برادرانِ وطن کو ایک مشترک جہت بنانے کی دعوت دی کہ وہ فرقہ پرست جماعت کو توڑ کر مشترک جماعت میں شریک ہو جائیں یہ دعوت اس لحاظ سے کامیاب ہوئی کہ برادرانِ وطن میں آزادی پسند افراد اس جماعت کی تشکیل میں شریک ہوئے لیکن مہاسبھا بدستور قائم رہی انجمن خدامِ وطن کو توڑ کر پر جامنڈل ۱۹۳۸ء میں اس طرح بنی کہ روپی ہوٹل میں

اس کے لیے دعوت نامہ چار صاحبان کی طرف سے جاری کیا گیا شاکر علی خاں ،
 ابوسعید بزمی ، ارشد تھانوی ، روی دت شرما ، کل گیارہ آدمی اس میٹنگ
 میں حاضر آئے داعیوں کے علاوہ ٹھاکر لال سنگھ چتر ناتھ مالوی ، جمن پشادکھڑ
 اخلاق محمد خان مشرف محمد خاں غوثی باسط بھوپالی چنا پنچہ اس کے کنوینر شاکر صاحب
 ہوئے اور ممبر سازی کے بعد اس کے صدر ابوسعید بزمی اور بابو لال شرما
 اس کے سکریٹری اور مد کوزال صدر افراد مجلس عاملہ کے ارکان بنائے گئے۔
 پر جامنڈل کا الحاق آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس سے ۱۹۳۹ء میں ہوا جس
 کا پہلا اجلاس لڑھیانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا اس اجلاس
 میں شاکر صاحب نے بھوپال کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔

دیسی اور پردیسی کا مسئلہ

اس وقت تک بھوپال میں جو بھی انجمنیں حقوق طلبی کے میدان میں جدوجہد
 کر رہی تھیں ان کا مطلق نظر دیسی و پردیسی مسئلہ تھا۔ حیدر آباد اور دوسری
 ریاستوں میں بھی یہی مسئلہ اس وقت زور شور سے ہنگامہ پیرا تھا اور اس کا
 حل بقول بزمی صاحب یہی قرار دیا گیا تھا کہ حکومت میں افسران بالا سے لے کر
 نیچے کے درجے تک ملکی باشندوں کو ترجیح دی جائے پہلے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے
 کہ دیسی کون ؟ پردیسی کون ؟ پھر اگر کوئی قانون بنالیا جائے تو اس کی کیا ضمانت
 ہے کہ دیسی لوگوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ملکی باشندوں کے تمام مسائل
 حل ہو جائیں گے کیوں کہ بار بار کے تجربات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اقتدار اعلیٰ
 کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد دیسی پردیسی کے رویہ میں کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر کچھ فرق
 نہ ہوا بقول شخصہ کہ ”ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد“ اقتدار پرستانہ ماحول
 میں پہونچ کر ہر آدمی اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے اس لیے عوام کے جو مسائل
 حل طلب تھے وہ جب بھی حل طلب رہے کیوں کہ مرضی کی صحیح تشخیص نہیں کی گئی

اس لیے وہ علاج بھی کارگر نہ ہو سکا۔

ریاستی باشندوں کی شکایات بقول بزمی صاحب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عوام کے بنیادی حقوق فنڈ منسل رانٹرس ریاستوں میں غیر محفوظ بلکہ مفقود ہیں یعنی نہ تو عوام کی زندگی سدھارنے اور ان کے لیے وسائل معاش فراہم کرنے کی طرف ریاست نے کوئی توجہ کی نہ تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے نہ سرکاری ملازمتوں میں مساوی یکساں حقوق حاصل ہیں شہری ہونے کی حیثیت سے کوئی عزت ہے نہ تعلیم و تربیت کا خیال ہے۔

۲۔ اصول حفظان صحت کے اعتبار سے محلوں، گلیوں، سڑکوں کی صفائی کھلی ہوئی و روشنی کا مفقود اہتمام نہ گندے پانی کی نکاسی کا انتظام ہے نہ ان کے لیے تفریح گاہیں نہ پارک، اس کی مثال قصبہ سہور، بھوپال ہے جب تک ایجنسی کے ماتحت تھا نہایت صاف ستھرا تھا کاروبار کی حالت بھی عمدہ تھی لیکن ریاست میں شامل ہوتے ہی وہ بہتر حالت بدتر اور کاروباری احوال ابتر ہوتے چلے گئے، اس لیے قصبہ میں پہلی سی صفائی ہے نہ رونق و آبادی نہ وہ پہلی سی چہل پہل۔

۳۔ حکومت کی آمدنی کے اصل حقدار عوام ہیں لیکن یہ روپیہ چند مخصوص افراد پر خرچ ہوتا ہے اور عام انسان فاقہ کشی میں مبتلا رہتے ہیں۔

۴۔ عوام کو اعلیٰ تعلیم کی برکات سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان کی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور پھر کہا جاتا ہے کہ ان کے اندر حکومتی ذمہ داروں کے سنبھالنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۵۔ کسانوں کی نہ تعلیم و تربیت ہے اور نہ ان کی کاشتکاری کے لیے سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں لیکن لگان اور ٹیکس ہر وقت بڑھتے رہتے ہیں غرض ان مسائل کا حل دیسی پردیسی میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح حل ذمہ دار حکومت ہے جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو اور عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر آئی ہو رہا اقلیتوں کے مذہبی شعار اور خصوصی مراسم کی حفاظت کا ذمہ دار فرمان روا

ہوگا تلخیص ریاستوں کی سیاست ص ۲ - ۱۹

چوں کہ کانگریس براہ راست ریاستوں سے چھیر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نوع کی جماعتوں کے قائم ہونے میں دلچسپی رکھتی تھی اس لیے پر جامنڈل جو دراصل کانگریس کی ریاستی شاخ تھی اس نے اب آگے بڑھ کر ذمہ دار حکومت کو نصب العین ٹھہرایا مسلم ریاستوں میں مسلم عوام کو اکثریت کے ہوتے سے ڈرایا جاتا تھا لیکن ان کو اس امر کے اعتراف میں ذرہ برابر جھجک نہیں کہ پر جامنڈل کے رہنماؤں میں ہندو مسلم عوام کے ذہن سے اس خوف کو نکالا اور ریاست بھوپال اپنی ہندو مسلم روایتی اتحاد کا آئینہ بنی رہی۔

کیوں کہ ریاستوں کی پسماندگی کی وجہ سے فرنگی سامراج کی ڈپلومیسی کے مکروہ اثرات ریاستوں کے باشندوں تک نہ پہنچ سکے تھے اس لیے برطانوی ہند کی طرح یہاں ہندو مسلم دنگے کبھی نہیں ہوئے اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ فرنگی سامراج کی منحوس سایہ کے پڑنے سے پہلے مشرق کے باشندوں کی رگ رگ میں مذہب و روحانیت رچی بسی ہوئی تھی مسلمان اپنے مذہب میں پختہ اور ہندو اپنے دھرم میں پکا تھا اس لیے اس قسم کے فسادات برپا نہیں ہوئے البتہ مغربی تہذیب کی اثرات سے جب یہاں کی قوموں کا اپنے مذہب و دھرم سے رشتہ کمزور پڑ گیا تب مذہب کے نام پر سامراج اور سرمایہ دار لٹولی نے فسادات اپنے سیاسی و اقتصادی نا جائز مصالح کے لیے شروع کر دیئے اس لیے یہ مذہبی فسادات نہیں بلکہ برطانوی سامراج اور اس کے حواریین کے سیاسی ہتھکنڈے ہیں جو آج تک جاری ہیں بہر حال ان فسادات سے ریاستیں بہت جلد تک محفوظ رہیں ان دور میں مسلم ریاستوں میں ہندو وزیر اعلیٰ اور ہندو ریاستوں میں مسلمان دیوان ہوتے تھے اور دونوں پہیوں سے حکومت کی گاڑی چلتی تھی بہر حال پر جامنڈل کے رہنماؤں کے ذہن میں عوام کے اصلاح حال کے یہ خاکے تھے جس کے اندر رنگ بھرنے کے لیے ملک کی آزادی مطلوب

تھی لیکن آزادی کا ناگہانی سیلاب جس طرح ملک میں آیا اس نے ان سارے
منصوں پر پانی پھیر دیا ہے
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مزدور تحریک اور بھوپال

جیسا کہ بار بار گذر چکا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں انقلاب کا پیش خیمہ
بن کر آئی جس کی بنیاد مشینی نظام پر قائم ہوئی۔ یوں تو دنیا میں غربت و پسماندگی
افلاس و بھکمری کا دور دورہ ہر دور میں رہا ہے قبائلی زندگی ہو یا شہنشاہی نظام
جس کی بنیادیں جاگیردارانہ نظام پر کھڑی کی گئیں تھیں لیکن دنیا کے پردے
پر مشینی نظام نے اپنا پر توڑالا اور انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مشینیں کھرت
میں آئیں تو کارخانہ عالم میں ایک نئی زندگی منظر وجود پر جلوہ گر ہوئی ان سائنسی
اختراعات و ایجادات سے سالوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور
ہفتوں کا کام دنوں میں انجام پانے لگا اور ہر قسم کی مصنوعات کی پیداوار
بہت تیزی سے بازاروں اور منڈیوں میں پہنچنے لگی تصویر کے اس روشن
رخ کے ساتھ دوسرا تاریک پہلو بھی سامنے آیا کہ ان مشینوں نے ہزاروں آدمیوں
کے کاموں کو چند ہاتھوں میں دے دیا جس کی وجہ سے عالمگیر بے روزگاری تاریک
سائے ہر طرف پھیلنے لگے اس حقیقت کو اس طرح تمثیلی پیرایہ میں ادا کیا جاسکتا ہے
کہ پہلے زمانے میں شہروں کے اندر رات کے اندھیرے میں روشنی کرنے کے لیے
سرسام لالٹین میں تیل ڈالنے اور ان کو روشن کرنے کے لیے سیکڑوں آدمی
روزگار سے لگے ہوئے تھے اور جونہی الکٹریک پاور کے ذریعہ بجلی کا جال پھیلا
تو بجلی گھر کے دپاؤر ہاؤس، کتے چنے ملازموں کو چھوڑ کر بقیہ سارے آدمی
بیکار ہو گئے ایسے ہی کلاتھ مل اور مختلف کاربنوں کے قائم ہونے سے لاکھوں
آدمی بے روزگاری اور بھکمری کا شکار ہو گئے اس مسئلہ نے پہلے یورپ

اور پھر ساری دنیا کو عالمگیر خلفشار سے دوچار کر دیا اس صنعتی نظام سے
سرمایہ دارانہ نظام کی داغ بیل پڑی اور مل مالکوں اور سرمایہ داروں نے
دنیا کے غریبوں ضرورتمندوں کا استحصال (نا جائز نفع اندوزی) شروع کر دیا
کیوں کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جائز و ناجائز طریقہ سے دولت
سمٹ کر آتی تھی۔

اس لیے انھوں نے اس محنت کو جو اصل میں دولت کو وجود میں لائی
اور خود اصل دولت ہے جس کو مارکس نے قدر زائد سے تعبیر کیا ہے
اس کو اپنی چابکدستی سے کھوڑی سی اجرت کے ذریعہ قبضہ کر لیا اور مزدوروں
کو صیدِ زبوں بنا لیا بقول اقبالؔ

ہوس کے پیچہ خونیں میں تیغ کا رزاری ہے
تعجب ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

اس ظالم و جابر سرمایہ داری کا توڑ بن کر اشتراکیت و اشتمالیت نمودار
ہوئی جس نے محنت و دولت دونوں ہی کو حکومت کا حق قرار دے کر
معمولی روٹی کپڑا، دیکر اور کلچر پر و گرام کے تماشوں میں الجھا کر عوام کو
اپنے شکنجے میں کس لیا وہاں مٹھی پھر چند چالاک سرمایہ دار تھے یہاں طاقتور
و حریت پسند حکومت جس نے مزدوروں کے نام پر آمریت ڈکٹیٹر شپ،
پردتہ ارکاچولا بدل کر انسانوں کو صدیوں کی محنت سے حاصل کردہ آزادیوں
سے محروم کر دیا اس طرح دنیا دو کیمپوں میں بٹ گئی ایک طرف سرمایہ داری
نے بہترین دماغوں کو خرید کر ان کے ذریعہ اپنا تحفظ کرنا چاہا دوسری طرف
انسان کی بنیادی ضروریات سے محرومی اور عوام کی اکثریت کے افلاس اور
بھکری نے قلب و ضمیر کو دستک دی اس لیے اب ہماری دنیا محنت و سرمایہ کی
داغی جنگ کا اکھاڑہ بن گئی ہے جس کے دو مشہور عالم پہلوان امریکہ و روس
میں ان دونوں نظاموں کے باہمی تصادم سے پوری انسانیت چکی کے دوپاٹوں

کے بیچ پس رہی ہے۔

ریاست بھوپال میں جب دور حمیدی نے ۱۹۲۶ء میں قدم رکھا تو نواب صاحب نے پہلے سیہور شوگر فیکٹری اور پھر بھوپال میں کھانگھل کی بنیاد ڈالی سیکڑوں لوگ جس سے برسرِ کار ہوئے تھوڑے عرصہ بعد مزدور دوسرا یہ دار کی کشمکش کا آغاز ہوا اور خدام و وطن، کے ارکان اس میدان میں بھی کود پڑے جس کے سپہ سالار شاکر علی خاں تھے۔ شاکر صاحب مزدوروں کی حق طلبی کے جرم میں پہلی بار ۱۹۳۹ء میں نو ماہ تک نظر بند رہے پھر عوام کے سیاسی شعور کے ابھارنے اور مظلوم تحریک کو منظم کرنے کی پاداش میں دو سال کے لیے دوبارہ جیل میں ڈال دیئے گئے اس قید سے رہا ہو کر آنے نہ پاتے تھے کہ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں پھر گرفتار کر کے مزید دو سال کے لیے جیل جا پہنچے گویا جیل ان کیلئے صحنِ آئین بن گئی تھی ان کی ان خدمات نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا قید و بند کی ان سزاؤں نے ان مجاہد وطن کی ذوق سیاست کو پختہ و مضبوط کر دیا بقول حاکمی سے

تغزیرِ جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یار سزا کے بعد

ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک اور بھوپال

برطانوی سامراج نے ۱۹۵۷ء کے بعد ہندوستان کو حکومتِ برطانیہ کی ایک ماتحت نوآبادی قرار دیکر آئینی حکومت کے ڈھانچہ کا اعلان کیا بلکہ کٹھن کے اعلانِ معافی کے بعد ہمارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے بے ایمان ظالم اور شتمگر تاجروں کے ہاتھ سے نکل کر براہِ راست انگلستان سے متعلق ہو گیا لیکن برطانوی سامراج نے حکومت کا ایسا آئینی ڈھانچہ تیار کیا جس کی رو سے ہندوستان کی دولت مستقل طور پر انگلستان منتقل ہونے لگی ملک کنگال بنتا گیا تمام کلیدی عہدے

انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں رکھے افسری لائن کی بڑی ملازمتیں انگریزوں کے لیے محفوظ کر دی گئیں اور اپنے دفتری فولادی نظام کے شکنجے میں معمولی سی تنخواہ پر ہندوستانیوں کو جکڑ لیا گیا تحصیلداری ڈپٹی کلکٹری ہندوستانیوں کی ملازمتی ترقیوں کی معراج تھی پھر برطانوی اور ہندوستانی باشندوں کی تنخواہوں میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا غرض برطانوی شہنشاہیت نے اپنی ناپاک اغراض کے ماتحت دستوری طریقہ سے ملکی دولت کو تیزی سے انگلستان پہنچانے کی راہ کو ہموار کیا سب سے پہلے بنگال کے تعلیم یافتہ طبقہ نے حقوق طلبی کا سوال اٹھایا اور پھر پورے ملک میں اس کا احساس جاگ اٹھا اس احساس کو انقلابی کور وکنے کے لیے مسٹر ہیوم کے ذریعہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑ گئی جس کے سالانہ اجتماعات حکومت اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ربط پیدا کرنے کے لیے شاندار ہوٹلوں، اور ڈرائنگ روم میں تجویزیں پاس ہوتی تھیں اس عادت کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ پورے ملک کو ایک قوم مان کر ملکی مسائل کے حل کا بیڑا اٹھایا تھا کانگریس برسوں مسٹر ہیوم کا پڑھایا ہوا سبق دہراتی اور حکومت کے آگے عرضداشتیں پیش کرتی رہی مسلمان علماء شہد کے پر تشدد مظالم اور خوشامد پرستانہ سیاست کے فروغ پانے کی وجہ سے گوشہ نشین ہو کر مستقبل کے لیے نقشہ بنا رہے تھے سرسید کے نام سے علیگڑھ کے انگریز پرنسپل رحمت پسندانہ جماعتیں تشکیل کر کے مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں آگے بڑھنے سے روک بنے ہوئے تھے۔ لیکن جنگ عظیم ۱۹۱۴ء نے دنیا کی پرانی ذہنیت کو الٹ کر رکھ دیا کیونکہ جنگ ایک زلزلہ بن کر دماغوں کو زیر و زبر کر دیتی ہے یعنی جس طرح زلزلہ زمین کی تہوں کو الٹ کرنے کے معدنات کو باہر نکال پھینکتا ہے اس طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے غلام اقوام میں ایک نئی لہر اور نئے انقلابی خیالات پیدا کر دیئے برطانوی سامراج جو ہمیشہ اصلاحات کے کھلونوں سے ہندوستانیوں کو طفلِ نادان سمجھ کر بہلاتا رہتا تھا اس جنگ میں ہندوستانیوں کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ اعلان کر دیں

کہ اب ہم بچوں کی طرح ان جھوٹوں و عدوؤں سے بھلنے والے نہیں ہیں جب تک ہمارے بنیادی حق آزادی کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اتحادیوں کی فتح ۱۹۱۸ء آٹھ تیسو سالہ ترکی خلافت کے خاتمہ کے بھیانک حادثہ

کے جلو میں آئی اس لیے مسلمانان ہند جو علماء حق کے زیر تربیت رہ کر مذہبی جذبات

سے لبریز تھے اس ناگہانی سانحہ سے تمللا اٹھے چوں کہ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم

برطانیہ نے ۱۹۱۷ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا وہ ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی

کو اس کے دار الحکومت سے محروم کر دیں یا اسے ایشیاء کوچک اور اس کا

کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں، مگر فتح کے ہوتے ہی مسٹر ولیم کے اصول

تسلیم کرنے کے باوجود اتحادیوں نے ترکی کے حصے تجربے کر کے ”ترکی تمام شدہ“

کا اعلان کر دیا اس لیے پورے ہندوستان میں برطانیہ کی اس غداری کے

خلاف غم و غصہ کے جذبات بھڑک اٹھے خلافت کمیٹی ۱۹۱۹ء میں قائم ہو گئی

جس کے اندر علی برادران نے مولانا عبد الباقی فرنگی محلی کی قیادت میں ملک

کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک دورہ کر کے ملت اسلامیہ کے جذبات کو گرا دیا

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ولی اللہی تحریک جہاد کے آخری امام شیخ الہند

مولانا محمود الحسن مالٹا سے اپنے جہادی مکتوبے کو ادھورا چھوڑ کر ہندوستان

واپس ہوئے تھے اور علماء نے برطانیہ جیسی فتنہ دار و مغرور طاقتور دشمن کے

مقابلہ میں مسلح انقلاب کے ذریعہ آزادی کو اب ناقابل عمل سمجھا اس لیے مشترک سیاست

میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا چنانچہ اس موقع پر علی برادران نے گاندھی جی کا

ملک سے تعارف کرایا اور ان کو سیاست کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔

مولانا ابوالکلام جو اپنے اخبار ”الہلال“ اور ”البلال“ کے ذریعہ

گاندھی جی کی آمد سے پہلے ۱۹۱۴ء ملک میں آزادی کا صور پھونک رہے

تھے ان کے زرخیز دماغ نے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء میں مقاومت بال صبر کے

عنوان سے سب سے پہلے سول نافرمانی کی تجویز خلافت کمیٹی میں پیش کی اسی

دوران میں حسن اتفاق سے یہی تجویز گاندھی جی نے کانگریس میں رکھی ۔
مولانا ابوالکلامؒ نے اس تحریک کو وقتی و عارضی ضرورت کے اعتبار سے اختیار
کیا تھا لیکن گاندھی جی نے اس کو اپنی زندگی کا مستقل مشن بنالیا جس کی وجہ سے
وہ ستیگرہ کے بانی کی حیثیت سے مشہور عالم ہوئے چوں کہ اب پرانی خوشامد پرستانہ
سیاست نے دم توڑ دیا تھا اور رکھنے مندوں برطانوی سامراج کے خلاف
عوام میدان میں اتر آئے تھے اس لیے ولی اللہی جماعت نے اس میدان میں
۱۹۱۹ء میں جمعیتہ العلماء کے نام سے قدم رکھ دیا اور اپنے پہلے ہی اجلاس میں
اپنے انقلابی عزائم کے ماتحت آزادی کامل کی قرارداد پاس کر دی جس منزل
تک پہنچنے کے لیے ہماری قومی جماعت کو دس سال لگے۔ جمعیتہ العلماء کے اجلاس
لاہور ۱۹۲۱ء میں پانچ سو علماء نے ترک موالات کا فتویٰ جاری کیا جس کے
اندر برطانیہ کے جشن صلح میں شرکت سے انکار سرکاری اداروں سے عدم تعاون
اور ولایتی مال کا بییکاٹ شامل تھا ترک موالات کی اس تحریک سے پورے
ملک میں جرات و ہمت اور جوش و خروش کا دریا ابل پڑا عوام متحد ہو کر جوق در
جوق نافرمانی کے لیے سڑکوں بازاروں میں نکل پڑے حکومت بوکھلا اٹھی
ہندوستانی سیاست کا یہ موسم فصل بہار کا تھا جہاں حوصلوں و دلولوں کے گنگا رنگ
پھول کھل رہے اور کیاں چٹک رہی تھیں اور ملک کے مشام جان کو اتحاد و اتفاق
کی خوشبو میں معطر کر رہی تھیں ہندوستان کی روح مذہبی بیدار ہوئی تھی اور
ہندو مسلم اتحاد کے رو پرور نظارے ملک کے ہر گوشہ میں آنکھوں کی ٹھنڈک
بخش رہے تھے اس وقت خلافت، جمعیتہ، کانگریس و مسلم لیگ تمام جماعتیں
قدم سے قدم ملا کر منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی تھیں برطانوی سامراج
کو یہ ملک کا اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا اس نے ملک و ملت کی متحدہ صفوں میں ایک
شکاف ڈالنے کے لیے شدہی سنگٹن کو قائم کی جس کے جواب میں تبلیغ اسلام کی

جماعت کھڑی ہو گئی حکومت کے ملا اعلیٰ سے شردھاندرجی کے کانوں میں شدھی کی بات پھونکی گئی اور میاں سرفضل حسین نے حکومت کے مخفی اشارے پر تبلیغ کی تجویز مسلمانوں کے آگے رکھ دی آغا فانا ملک میں ہندو مسلم فوج در فوج اس میدان میں انٹر کمر باہم دست و گریباں ہو گئے ایشیائی قوموں کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اور ان کو باہم دست و گریباں سامراج کا پرانا محبوب مشغلہ ہے۔

دانیال فرنگ نے مشرقی قوموں کے برسوں نفسیاتی مطالعہ سے اس راز کو پایا تھا کہ وہ مذہبی جذبات و احساسات سے بہت جلد منفعل و مشتعل اور متاثر ہوتے ہیں ان کے مذہبی احساسات کے تاروں کو چھیڑ کر ایک دوسرے سے با آسانی ٹکرایا جاسکتا ہے خصوصاً ایک ایسے ملک میں جو مختلف مذہبوں و رنگارنگ تہذیبوں کا گہوارہ ہو چنانچہ فرنگی سامراج نے اس دکھتی رگ کو پکڑ کر پہلے آزمایا اور کار آزمودہ نسخہ پایا مشرقی قوموں میں دین و مذہب کے نام پر جتنے فتنے اٹھائے گئے اور فسادات کراتے گئے وہ سامراجی تاریخ کا سیاہ باب ہے اور ہر سامراج آج بھی اس نسخہ کو استعمال کرتا ہے مغربی سامراج نے مسلمانوں میں اختلاف ملی کا پرانا فتنہ رشید و سنی کے ابھارنے کے علاوہ خود اہل سنت کے درمیان وہابی وغیرہ وہابی فتنے کو خوب بھڑکایا جس میں دیوبندی اور بریلی کے نام سے مسلمان ایک دوسرے سے دست گریباں ہوتے رہے بریلی کی طرف سے چھوٹے موٹے الزامات لگا کر علماء حق کے دامن تقدس کو داغدار کرنا چاہا اور ان کو تکفیر کا نشانہ بنایا باہمی مناظروں کی گرم بازاری ہوئی جس نے مجادلہ و مقاتلہ کی صورت اختیار کر لی اور خود پھر سامراج ثالث بن کر فیصلہ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا علاوہ ان مسلمانوں کو مستقل طور پر دو فرقوں میں بانٹنے کے لیے پنجاب کی مردم خیز و فتنہ انگیز سرزمین دقادیان سے ایک مصنوعی اور جعلی اور جھوٹی نبوت کو کھڑا کیا گیا تھوڑے ہی عرصہ میں یہ خود کاشتہ پودا برگ بار لے آیا اور اس شجر خبیث کی شاخیں ملک محروسہ برطانیہ میں پھیلتی چلی گئیں۔

یہ اور اسی نوع کے صد ہا فتنے برطانوی سامراج کے چشم و ابرو کے اشارے پر پیدا کئے گئے تاکہ سامراج دشمن علماء حق کی تولائیاں سامراج کے خلاف صرف ہونے کے بجائے انھیں فتنوں کی سرکوبی اور آپسی کشاکش میں خرچ ہو جائیں چل شدھی سنگٹھن نے ملک کی خوشگوار فضا کو مسموم کر دیا بد قسمتی سے اسی آئنا میں چورا چوری کا پر تشدد حادثہ رونما ہوا گاندھی جی نے اپنی تحریک کو واپس لے کر بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا جس کے اندر تیس ہزار ہندوستانیوں نے جیلوں کو بھر دیا تھا اس التواء سے نہ صرف تحریک کو سخت دھکا لگا بلکہ آزادی کا وہ قافلہ جو منزل سے ہمکنار ہوا چاہتا تھا۔ ٹھٹک کر رہ گیا اور پھر فرنگی سیاست نے ہندو مسلم سمجھوتہ کے رشتہ میں ایسی گریس ڈال دیں کہ ان کا ناخن فکر سے سلجھانا ناممکن ہو گیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی یہ سدا بہار فتنہ آج تک زندہ ہے اسی کے ساتھ یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ جب بھی ہندوستانیوں نے کوئی فیصلہ کن اقدام کیا اور اس راہ میں تن من کی بازی لگائی تو برطانوی سامراج نے اصلاحات کے نام فریب کاری و مکاری کے جال بچھا دیے اور اہل ملک کو اصلاحات کے جھولے میں جھلاتی رہی چنانچہ اس موقع پر لارڈ ارون نے ۱۹۲۲ء میں ایک مبہم اعلان کیا۔

ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ نوآبادیات کا اصول ہے یہ اعلان برطانوی شہنشاہیت کی بدبینی کو پوری طرح واضح کر رہا تھا اس لیے کانگریس نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر کے آزادی کامل کی تجویز پاس کر دی اور سول نافرمانی کی تحریک کا بگل بجا دیا چنانچہ اس تحریک سے حکومت کو سوچنے پر مجبور کر دیا مسلمانان سرحد نے اس تحریک میں بارہ ہزار آدمیوں کو جیل میں بھیجا تھا اس لیے تحریک کو دبانے کے لیے حکومت نے اصلاحات کی پانچویں قسط کا اعلان کر دیا جو ۱۹۳۵ء میں نافذ ہوا یہ اصلاحات ہندوستانیوں کے امنگوں کے لحاظ سے کم تھی اس کے لیے

کہ ہندوستانیوں کے مقابلہ میں گورنروں کو بے پناہ اختیارات سے مسلح کر دیا
تھا اور ان کو ہر طرح بالا دستی دیدی گئی تھی اس لیے کانگریس نے ان کو
مسترد کر دیا جس کے لیے لندن میں گول مینز کانفرنس بلائی گئی اس کانفرنس
میں آزادی کے لیے ہندو مسلم سمجھوتہ کی شرط لگا کر پھر سامراج نے کانفرنس کو
ناکام کر دیا گاندھی جی نے لندن سے واپسی کے بعد جب دوبارہ سول نافرمانی
کو بروئے کار لانا پڑا تو بساط کا نقشہ ہی پلٹ چکا تھا لارڈ ویلنگٹن جو
نہایت سخت گیر اور کانگریس کے مخالف تھے ۱۹۳۱ء میں واپس آئے بنا کر بھیجے
گئے انھوں نے قومی تحریک کو اپنی آہنی طاقت سے دبانا چاہا لیکن اس خطرناک
ماحول میں بھی کانگریس کا جلسہ اپریل ۱۹۳۲ء چاندنی چوک میں منعقد ہوا۔ برطانوی
شہنشاہیت کے اصلی عزائم کو جاننے کے لیے مسٹر چرچل کی تقریر پیش ہے
جو انھوں نے پارلیمنٹ میں ۱۹۳۲ء میں کی تھی یہ تقریر برطانوی سامراج کی حقیقی
ڈپلومسی کی آئینہ دار ہے۔

وزیر اعظم (مسٹر میکڈونلڈ) نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ
دیں گے میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے اگر انھوں نے جملہ جماعتوں کو خوش
کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو بھی خوش نہ کر سکیں گے اہل روم کا اصول نفاق
ڈالو اور حکومت کرو تھا لیکن ہم نے بالاتفاق طے کر لیا ہے مگر اسی کیساتھ
اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیے جو اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ
رعایا کو متحرک کر دیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہو گا دراصل یہ ایک
بڑا خطرہ اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بہت بڑی غلطی میں نہ پڑ جائیں دلیڈر ۱۹۳۲ء
بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۲۰)

غرض ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم سمجھوتہ کی جو شرط برطانوی
حکومت نے سوچ سمجھ کر لگائی تھی اس نے اس رشتہ اتحاد میں مزید ایسی گرمیں
ڈال دیں کہ وہ ناقابل حل پیچیدہ مسئلہ بن گیا پھر حکومت نے ۱۹۳۲ء میں

مسلمانوں کو کانگریس کے خلاف لا کر کھڑا کر دیا ابھی ہندوستانی سیاست کا مابا
 و ناکامی کے مرحلوں سے گزر رہی تھی کہ سامراجی طاقتوں کی باہمی آویزشوں نے
 پھر دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء کی بھٹی میں جھونک دیا برطانیہ کا اس جنگ
 میں بیش از بیش حصہ لینا اس لیے مشکل نہ تھا کہ اس کو ہندوستان جیسے غریب
 ملک کے مفت اور سستے رنگ روٹ آسانی سے مل جاتے تھے لہذا پورے ملک
 میں رنگ روٹوں کے بھرتی کیمپ کھول دیئے گئے کانگریس اور قوم پرور جماعتوں
 نے اس کی مخالفت کی کہ جب تک ہندوستان کی آزادی کی گارنٹی نہ دی جائے اس
 وقت تک وہ فوجی بھرتی کی مخالفت کریں گے مگر مسلم لیگ نے لاہور میں تقسیم ہند
 کی تجویز سن کر ۱۹۱۵ء میں پاس کر کے کانگریس کی آزادی کامل کی تجویز کو مضطرب
 ڈال دیا حکومت برطانیہ اہل ملک کا متفقہ مطالبہ آزادی کو طرح طرح کے حیلوں
 حوالوں سے ٹالتی چلی آرہی تھی اب لیگ کی بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ سیاست
 سے اس کو مضبوط سہارا مل گیا کانگریس نے ۱۹۱۶ء میں مجبور ہو کر کوئٹہ انڈیا
 کا تاریخی اعلان کر دیا جو برطانوی سامراج کے لیے ایک دھماکہ بن کر پھوٹا ہر چند
 مسلم لیگ اس کے آڑے آئی لیکن ہندو مسلم حسرت پسندوں نے اس کے
 اندر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حمد قومی رہنما گرفت کر لئے گئے لیکن تحریک عرصہ تک
 چلتی رہی ہم نے ہندوستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ
 جو کچھ برطانوی ہند میں بڑے پیمانہ پر آزادی کے لیے کوششیں کی جا رہی تھیں
 اس کل کا ایک چھوٹا سا فرد یعنی بھوپال بھی اس پیچھے نہ رہا۔

ریاست میں حقوق طلبی کی جو تحریک ۱۹۱۳ء میں چند افراد سے شروع
 ہوئی تھی وہ ۱۹۱۶ء تک پہنچتے پہنچتے ایک مضبوط جماعت بن کر آگے بڑھتی
 رہی چوں کہ ریاستی سیاست میں مسلم عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس
 لیے تحریک آگے بڑھتی رہی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی
 سیاست میں گرمی اسی وقت آئی جب مسلمان جیسی جوشیلی قوم اس میدان

میں کو دی سرحد کے جنگجو قوم نے خان عبدالغفار خان سہ کی رہنمائی میں
 قصہ خوانی بازار میں جب عدم تشدد کا مظاہرہ کیا تو فرنگی سامراج کے
 پاؤں تلے سے زمین نکل گئی بھوپال ریاست بھی سرحد کے ان پٹھانوں کی
 یادگار تھی جہفوں نے بھوپال کو اپنا وطن بنایا چنانچہ خدام وطن سے لے کر
 پر جامنڈل کے رہنماؤں کی اکثریت انھیں پٹھانوں پر مشتمل تھی اگرچہ ریاستی سیاست
 اور ہندوستانی سیاست کے طریق کار میں کھوڑا بہت فرق رہا لیکن مقاصد
 کے اشتراک کی وجہ سے کھوڑے ہی عرصہ میں ریاستی سیاست ہندوستانی سیاست
 کی دست و بازو بن گئی بہر حال جب گاندھی جی نے برطانوی حکومت کی طول و پل
 گفتگو اور پرزہ ترکیبوں سے اکتا کر سہ ۴ میں دکر ویا مرہ، کانرہ دیا تو
 پر جامنڈل کے رہنماؤں نے اسی نعرہ کو بیانگ دہل دہرایا اور کوئٹہ انڈیا
 کی تجویز پاس کر دی چنانچہ برطانوی ہند کی طرح پر جامنڈل لیڈروں کی ڈھیرا ڈھیر
 گرفتاریاں عمل میں آئیں جن کے نام یہ ہیں شاکر علی خاں، پنڈت چتر نرائن
 مالوی ظہور ہاشمی سعید الشراخاں رزمی، لطف الشراخاں نظمی، بندرا بن داس
 گوہند پرشاد نشاط و الطاف یزدانی جن کو مختلف دفعات کے تحت سزائیں
 دی گئیں۔

آزادی سے پہلے کی ہندوستانی سیاست

جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ دنیا خیر و شر حق و باطل اور نیک و بد کا
 گہوارہ ہے خدا اپنی حکمت بالغہ سے ظلمت میں سے نور خزاں میں سے بہار اور
 شر سے خیر بھی پیدا کرتا رہتا ہے چنانچہ انسانوں کی باہمی جنگ و جدال لڑائی
 بھڑائی شر و بدی کی حامل ہے لیکن خدا اس شر میں سے خیر کی صورت پیدا
 فرماتا ہے اگر قوموں میں حرب و ضرب ایک دوسرے سے جنگ و جدل کا میدان
 گرم نہ ہوتا تو غالب اقوام خود کو دنیا کا ٹھیکیدار سمجھ کر کمزور قوموں کو صفحہ ہستی

سے نیست و نابود کر ڈالتیں یا غلامی کی شکنجہ میں کس کر جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی جب بھی طاقتوروں کو ایسا موقع ملا ہے وہ ایسا کر گزرتے ہیں اس صورت میں نہ مذاہب و ملل آزاد رہ سکتے اور نہ قوموں کی تہذیب و تمدن کو آزادانہ فضاؤں میں نشوونما پانے کا موقع نصیب ہوتا کلیتہاً پسند حکومتوں کی طرح سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے اور دنیا کا باغ جو گلہائے رنگارنگ کا جن ہے وہ اس یک رنگی سے بے رونق ہو جاتا اس لیے جنگ یا لڑائی جہاں انسانیت کے لیے بڑا عذاب و لعنت ہے وہیں خدا کی طرف سے اس کے اندر خیر و رحمت کا پہلو ہے کہ اس کے ذریعہ خدا کمزوروں کو اوپر اٹھاتا اور طاقتوروں کو نیچے گراتا ہے اور ہر قوم کو اس امتحانی میں نیک عملی و بد عملی کی زندگی گزارنے کا پورا پورا موقع فراہم کرتا ہے چنانچہ دنیا کی ہر جنگ میں قوموں کے عروج و زوال کا تماشہ نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے ۔

مغرب کے شیطانی سامراج نے پچھلی نصف صدی میں عالم انسانیت کو دایسی مہیب و خوفناک اور لرزہ بر اندام کرنے والی جنگوں کی بھٹی میں جھونک دیا کہ جس کی نظیر سے تاریخ عالم خالی تھی ۔ مہلک و قاتل ہتھیاروں ، انسانیت کش اسلحوں سے شہروں کی تباہی نہیں ملکوں کی بربادی لاکھوں انسانوں کی ہلاکت سامانی کے خونیں نظارے آنکھوں کے سامنے ہیں اس کے زخموں سے ابھی تک عالم انسانی کراہ رہا ہے چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ترکی و جرمنی کے عالمی سیاست کو ختم کر کے برطانیہ و فرانس کو دنیا کا چودھری بنا دیا لیکن ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگ نے چودھراہٹ کے اس تاج کو ان کے سر سے اتار کر امریکہ و روس کے سر پر رکھ دیا برطانیہ نے اس فتح کو چہر چل کے الفاظ میں ہزاروں انسانوں کی خون کی دھاروں اور خون کی آنسوؤں سے حاصل کیا تھا لیکن برطانوی شہنشاہیت کے لیے یہ فتح عظیم شکست کی تمہید بن کر آئی برطانیہ و فرانس کی نوآبادیاتی اقتدار کا خیمہ لڑکھڑا کر گر گیا ان کی فرعونی گردن جنگی اخراجات کے تلے دب کر رہ گئی ۔

سامراجی عزائم کے دست و بازو شل ہو گئے برطانوی حکومت کو اپنا نوآبادیاتی نظام کا ڈھانچہ قائم کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا اس لیے فرنگی سامراج نے اپنی روایتی مکاری و عیاری کو بروئے کار لا کر اپنی پرانی ڈپلومیسی کے طریقہ پر ملکوں کو تقسیم و رتقیم کی تلوار سے پارہ پارہ کر دیا اور ان ملکوں کے باشندوں کے درمیان مستقل جنگ کی بنیاد رکھ دی برطانوی سامراج کو اپنے اندرونی حالات اور بین الاقوامی دباؤ کی بنا پر ان ملکوں کو آزاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا بیرونی بحریہ کی بغاوت سے اپنے پاؤں کے نیچے زمین سرسختی نظر آئی اس خونی انقلاب کی بوسونگھ لی جو ہندوستان کو برطانیہ کا ہمیشہ دشمن بنادیتی لیکن برطانوی سامراج چلتے چلتے بھی اپنی کرنی سے باز نہ آیا۔ دکھاؤ نہیں نوڈھکاؤ کی ضرب المثل کے مطابق آزادی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں اور ایسا طریقہ اختیار کیا کہ آزادی کے سورج کے طلوع ہونے پر مسرت و خوشی کی روشن شمعیں بھسکی پڑ گئیں خون کی بہتی ہوئی ندیوں، لاکھوں انسانوں کی بے گور و کفن لاشوں کے جلو میں ہندوستان اس طرح آزاد ہوا کہ ہر طرف تباہیاں و بربادیاں منہ کھولے کھڑی تھیں ہمارے نزدیک برطانیہ نے ہندوستان کو اس وقت آزاد کیا جب کہ وہ ہندوستانیوں کے مخصوص طبقہ کو ذہنی طور پر غلام بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب کے سایہ میں پروردہ یہ غلام آزادی کے بھی مغربی سیاست کے خطوط پر ان ملکوں کو چلائیں گے نظام حکومت میں یورپ کو اپنا قائد و رہنما بنائیں گے مشرقی اقوام کی مذہبی و اخلاقی و روحانی اقتدار کو دریا برد کر دیں گے۔ چنانچہ بہت سے ملکوں میں ایسا ہی ہوا آزادی کے مسئلہ میں برطانیہ نے مختلف پیچیدگیاں پیدا کر کے اپنے اقتدار کی مدت کو دراز کرنا چاہا لیکن بین الاقوامی احوال اور قوموں کی امنگوں کے آگے اس کو جھکنا پڑا بادلِ نحواستہ آزادی بصورت بربادی ملک کو تقسیم کر کے ہمارے سروں کو تھوپ دیا۔

اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبہ سے ملک کو تقسیم نہ کرنا چاہئے پھر اس کا جواب یہ ہے کہ فلسطین کے تقسیم کا کن مسلمانوں نے مطالبہ کیا تھا شام و لبنان و دیگر اسلامی ممالک کو (جو ترکی خلافت کے ماتحت متحد ہو کر رہے تھے) ان کو کس نے تقسیم کر دیا بہر حال ہندوستان کی تقسیم فرنگی سامراج کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جب پورے ملک کی سیاست فرنگی ڈپلومیسی کی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی تو ریاستی سیاست کے دریا میں روانی کہاں سے آئی اس وقت پر جامنڈل ایک غیر یقینی ماحول اور مذہب حالات سے گزر رہی وہ حالات کو دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر چل رہی تھی البتہ شاکر صاحب مزدوروں میں کام کرتے رہے اور مختلف یونینوں کے بنانے میں سرگرم رہے۔

جنگ کے بعد ہوشربا گمرانی اور کساد بازاری نے ہندوستانی عوام کی

زندگی کو اجیرن کر دیا تھا اور بڑھتی ہوئی مہنگائی نے پورے ملک کو ہلا ڈالا

ریاست بھوپال جو ایک غریب ریاست وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئی اس لیے خود نمائی کا شائبہ نہ ہوتا تو راقم الحروف اس کا ذکر کرتا کہ اس فقیر نے اگرچہ سیاست میں براہ راست قدم نہیں رکھا لیکن بالواسطہ بھوپال ٹیچرس ایسوسی ایشن اور پھر ریاست کے جملہ ملازمان کے تعاون سے فیڈرل یونین کے ذریعہ سب سے پہلے ریاست میں پر امن ملازمانی تحریک چلائی سلیمان آرزو اس کے سکریٹری تھے اس تحریک سے ملازمین میں ہماہمی و سرگرمی اور عوام میں اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی شہر و اضلاع میں جلسہ کیے گئے یوم و عامنا یا گیا کیوں کہ سبھی باشندے اس گمرانی کی لپیٹ میں آگئے تھے اس لیے ان کی ہمدردیوں کی وجہ سے یہ جلسے عوامی بن گئے اگرچہ اس تحریک سے خاطر خواہ نتیجہ تو نہ نکلا لیکن کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل ہوئی اس وقت کس کو معلوم تھا کہ گمرانی و مہنگائی کا یہ پتلا سانپ سامراج کی اقتصادیات کی کینچلی بدل کر اثر دہا بن کر سارے عالم کو اپنے لپیٹ میں لے لیگا اسی طرح

راقم الحروف اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے ادبی محاذ (انجمن ترقی پسند مصنفین) کے ذریعہ (جو اس وقت تک ہر مکتبہ خیال کے ادیبوں کی جماعت تھی) اور جس کی بنیاد ہمارے ساتھیوں نے سب سے پہلے ڈالی تھی) اس انجمن کے ذریعہ سیاسی رہنماؤں کی فہم تائید کرتے رہے اور اپنی تجویزوں سے پر جا منڈل کو تقویت بخشی جس کا اعتراف بارہا شاکر صاحب بر ملا مجلسوں میں کیا بہر حال جو کچھ بھی کیا تھا وہ ایک فریضہ کی ادائیگی کے لیے تھا جس کے اندر نہ عہدوں کی طلب تھی نہ نام و نمود کی خواہش جب وہ انجمن ایک مکتبہ فکر کی جاگیر بن گئی تو ہمارے ساتھیوں نے بغاوت کی اس اجمال کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

بھوپال میں چیف کمشنری راج

جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی غلامی کی مدت کو دراز کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے اور وہ ناکارہ ثابت ہوئے تو آخر میں متحدہ ہندوستان کے شجرِ عظیم کو تقسیم کی کلہاڑی سے کاٹ کر دو حصوں میں بانٹ دیا پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی ایک اندھیری رات مژدہ سحرے کر آئی ہندوستان و پاکستان دو آزاد حکومتیں دنیا کے نقشہ پر ابھر آئیں ایک طرف خوشیوں و مسرتوں کے شادیاں بچ رہے تھے تو دوسری طرف لاکھوں انسانوں کے قافلے بیکسی و بے سرو سامانی کی حالت میں صدیوں کے وطنی مقامات کو چھوڑ کر ماتم کنساں ادھر ادھر منتقل ہو رہے تھے ان لاکھوں انسانوں کو خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا جس خون ناحق کا وبال یقیناً برطانوی سامراج کی گردن پر ہے۔ بہر حال قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان ہمارے ملک کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا اس پر مسرت واقعہ مگر غمگین صورت حال نے سیاسی باشندوں کو سراسیمہ حیران و پریشان کر دیا تھا۔

اگرچہ صدیوں کی غلامی سے آزادی کی مسرت کی چمک ہر ایک چہرے سے

جھلک رہی تھی مگر کرب و الم و غم کے خطوط بھی ہر ایک کی پیشانی پر نمایاں تھے کیونکہ اس حسرت کدہ عالم میں نہ کوئی مسرت خالص ہے اور نہ کوئی غم خالص اس جہنستانِ دہریہ میں جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی جہاں بہار کی جلوہ آرائی ہے وہیں خزاں کی وحشت سامانی بھی اہل بھوپال نے مسرت و غم کے ان بے جلع جذبات کے ساتھ آزادی کا خیر مقدم کیا شاطرِ برطانیہ نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم ہونے کا اعلان تو کر دیا لیکن ان ساڑھے چھ سو ریاستوں کا کیا ہوگا اور ان رئیسوں، راجاؤں، کاشر کیا ہوگا جو تاجِ برطانیہ کے ازلی و فادار و جاں نثار رہتے ہوئے ہر اڑے وقت میں کام آتے اور ہمیشہ اس کے گن گاتے رشتہ تھے فرنگی سامراج نے اپنی روایتی بے وفائی و غداری سے کام لے کر ان کو بے بار و بکلا و تنہا چھوڑ دیا۔

اس پر آشوب پرخطر دور کے ایک اہم واقعہ کا اظہار ضروری ہے جب کہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں خونی فسادات کا سیلاب امنڈ آیا تھا اور جب کہ جنون و دیوانگی کا پورے ملک پر دور دورہ تھا مارکٹ جاری اور خوفِ دہشت کا ماتول طاری تھا اردگرد کے مسلمان اپنے صدیوں کے ٹھکانوں کو چھوڑ کر بھوپال پہنچنے لگے اس وقت ہندو مسلم بھائیوں نے مل جل کر بھوپال کی قدیم روایاتی اتحاد کے مطابق سب کو گلے لگایا ان کے کھانے پینے کے لیے در در گھر گھر پہنچ کر روٹیاں فراہم کرنے اور ان کے ٹھہرانے کے انتظام میں لگے ہوتے تھے نواب صاحب بھوپال نے بھی بڑی فیاضی و رواداری و فراخ دلی کے ساتھ ان کے ٹھہرنے کھانے پینے کا انتظام کیا بئراگڑھ کیمپ ان کے لیے کھول دیا گیا ان کی پریشانی و خستہ حالی دور کرنے کی تدبیریں اختیار کیں نفرت و بربریت کے ان اندھیریوں میں ریاست بھوپال الفت و محبت کی مینارِ روشنی بن کر چمکی خدا کی مخلوق کے ساتھ بلا تفریق مذہب و ملت کے یہ درخشاں نظارے نگاہوں کو روشن اور دلوں کو سکون بخش رہے تھے بھوپال کے دردمند افراد کمر باندھ کر

ہر باہر کے آنے والے لوگوں کا خیر مقدم کرتے تسلی و دلاسا دیتے خیموں میں
 ٹھہراتے اور پھر کیمپ میں لے جاتے تھے شا کر صاحب و قاسم میاں وغیرہ اس
 کے اندر پیش پیش تھے رافتم السطور بھی ان مہاجرین کے درمیان ہر جمعہ کو
 واعظ کی حیثیت سے اصلاح و دل جوئی کا فرض انجام دیتا تھا نواب صاحب
 بھوپال نے ایوان رؤسا کے صدر کی حیثیت سے ریاستوں کی خود مختاری کا ایک
 پلان رکھا تھا لیکن وہ سیاست کی ہواؤں میں اڑ گیا آزادی سے پہلے برطانوی
 حکومت نے انٹریم گورنمینٹ (عبوری حکومت) بنا کر ملک کی مختلف جماعتوں
 پر مشتمل کابینہ بنائی تھی جو باہمی مرکزہ آرائی کا شکار ہوئی نواب صاحب بھوپال کے
 سیاسی دماغ نے مرکزی نقشہ کے مطابق عارضی حکومت قائم کر دی جو سعید اللہ
 خان رزمی (کانگریس ملک راج)، پولو ٹیکل لیگ، مظفر علی خان (مسلم لیگ)
 کے نمائندوں پر مشتمل تھی اس وزارت نے سال بھر کے قریب کام چلایا۔ پھر جامنڈل
 جو عوامی نمائندہ جماعت تھی اس کو وزارت سے علاحدہ رکھا گیا اس لیے اس
 نے کانگریس ہائی کمان سے مشورہ کیا اور قدوس صہبائی کے ذریعہ نواب صاحب
 کو راست اقدام کی دھمکی دی چونکہ مرکز میں اب کانگریس برسر اقتدار آچکی تھی اور پھر جامنڈل
 اسی کی شاخ تھی اسی لیے نواب صاحب نے پہلی وزارت کو توڑ کر پھر جامنڈل
 کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ دوڑ دیدی چتر نرائن مالوی وزیر اعلیٰ ظہور ہاشمی
 کا منا پر شادا اور محمود حسین اس کے وزیر تھے پھر جامنڈل بھوپال کی آزادی پسندوں
 کی پرانی جماعت تھی جو اس راہ میں قربانیاں دیتی چلی آرہی تھی ایک مشترک مقصد
 نے اس کے ارکان کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اس لیے وہ کاندھے سے
 کاندھا ملا کر منزل کی طرف گامزن رہی جو کچھ اختلاف ابھرتے وہ جمہوریت کے
 اصول پر دور کر لیے جاتے تھے لیکن اب ایک نیا مرحلہ درپیش آیا پھر جامنڈل
 کے رہنماؤں نے اپنی تحریک کا جو پودا لگایا اور اس کو خون پسینہ سے سنبھالتا وہ
 شروار درخت بن گیا اب اس درخت سے حکومت و وزارت کے پھل پٹگنے لگے

اس لیے اس منزل پر پہونچ کر ہر کارکن اس پھل سے نفع اندوز ہونا چاہتا تھا اقتدار و اختیارات حکومت و سلطنت کی کرسی پر پہونچنے کے لیے باہمی کشمکش اور باب سیاست کا ہمیشہ و طیرہ رہا ہے جو جماعتوں کو ٹوڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے بہر حال یہ عوامی وزارت ان پر شور حالات میں پوری طرح قدم نہ جمانے پائے تھے کہ اس کے خلاف انضمام (مرجر) کی تحریک اسی کانگریس کی طرف سے اٹھ کھڑی ہوئی جس نے وزارت بنانے کا مشورہ دیا تھا وزارت کے مخالف گروپ نے جن کو وزارت یا عہدوں کی توقعات وابستہ تھیں جب وہ پوری نہ ہو سکیں تو انھوں نے باہر کے شورش پسندوں سے ساز باز کر لیا جو ریاست کے وحدت کو فوراً تحلیل کر کے قریبی صوبے میں ضم کرنا چاہتے تھے قصبہ بریلی کے فرقہ پرستوں نے باہر کے لوگوں کی شہ پر اس کا بیڑا لگایا اور وہاں کے سیٹھ ساہوکار اس کی پشت پر امداد کے لیے کھڑے ہو گئے چنانچہ ایک ہی فرقہ کے لوگوں کے ذریعہ یہ تحریک شروع کرادی گئی کانگریس ہائی کمان کے مشورے سے جو ذمہ دار حکومت بنی تھی جب صورت حال کی طرف توجہ دلائی گئی تو ہائی کمان نے آنکھیں چرا لیں اور بد میں خلا جانے کن اسباب کے ماتحت اس تحریک کو قوی تحریک مان لیا گیا بہر حال پر جامنڈل کے رہنماؤں کے لیے یہ عجیب کشمکش کا دور تھا کہ ٹر بھر جس مقصد کے لیے پا پڑے بیٹے رہے اور جس منزل تک پہونچنے کے لیے قدم بڑھاتے رہے جب اس بام بلند تک پہونچنے کے لیے دو چار سیڑھیاں رہ گئیں تو وہ کمندی ٹوٹ کر رہ گئی کانگریس ہائی کمان نے پر جامنڈل کو اس لڑکھڑائی سے جوئے حالات میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے اٹھالیا۔

اس سے بھی بڑھ کر اس وزارت پر یہ قیامت ٹوٹی کہ شاکر علی خاں جو پر جامنڈل کے بانیوں میں سے تھے پارٹی سے استعفا دیدیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزان سیدہ اوراق یا پت جھڑ کے پتوں کی طرح اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

آٹھ نو ماہ کے یہ وزیر ارگھروں میں مستعفی ہو کر بیٹھ گئے جب پر جامنڈل کی وزارت کا اس طرح ڈرامہ ڈراپ سین ہوا تو ریاستی سیاست کی سطح پر ڈاکٹر شنکر دیال یکا یک نمودار ہوئے اور اپنی حکمت عملی اور جوڑ توڑ کی سیاست سے جلد کامیابی حاصل کر لی

بھوپال کی اس سیاسی تحریک بلکہ قوم پرور مسلمانوں کی قوم پرور تحریک کا زبردست المیہ یہ ہے کہ مسلم رہنما اور وہ مسلمان عوام جنہوں نے فرنگی سامراج کی غلامی سے آزادی کے لیے اور اپنی مذہبی آزادی کی خاطر تن من و جان کی بازی لگائی تھی اور جن میں سے بہت سے نوجوان جو اس سلسلہ میں وطن سے ایسے بے وطن ہوئے کہ پھر ان کو دوبارہ وطن آنا نصیب نہ ہو سکا بہت سے وہ تھے کہ جو اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کو ٹھکرا کر اس میدان میں کودے اور اپنے روشن مستقبل کو تاریک بنا لیا وہ بھی تھے جنہوں نے اپنی جائیداد و جاگیر کو لات مار کر فاقہ کشی اور بھکمری کے شکار ہونے غرض اس راہ کی کون سی قربانی تھی جس سے وہ نہ گزرے ہوں لیکن اپنے لگائے ہوئے باغ کے پھل کھانے سے محروم رہے یہ قصہ صرف بھوپال کا نہیں بلکہ ہندوستانی مسلم رہنماؤں کا عمومی حال ہے مولانا برکت اللہ بھوپالی۔ مولانا عبید اللہ سندھی مولانا منصور انصاری خاں عبدالغفار خاں اور بھوپال کے شیر دل رہنما شاکر علی خاں اور اسی قسم کے سیکڑوں گننام مجاہدین آزادی میں جو نہ تاریخ کے عنوان بن سکے اور نہ ہماری قومی تاریخ میں اپنے صفحات میں ان کو جگہ دی ان گننام مجاہدین کے حصہ میں آزادی کی راہ میں صعوبتیں۔ مصیبتیں۔ مشکلات و دشواریاں غرض ہر طرح کی قربانیاں ہی ان کے حصہ میں آئیں اس راستہ کے کانٹوں کا ہٹانا ان کی زندگی کا حاصل رہا پھولوں کا چننا اور اس کے پھل کھانا انہوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا ملک کے چمن میں ان کی قربانیوں کے نفموں کی گونج ہے مگر بقول میرؔ

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جمینہ علمائے بھوپال کا ۲۹ء میں قیام

جون ۲۹ء میں نواب صاحب بھوپال نے ریاست کو ایک معاہدہ کے ماتحت انڈین یونین میں ضم کر دیا اور چیف کمشنری راج قائم ہو گیا بھوپال کی زمین پر چیف کمشنری راج بم کی طرح بھوٹا جس کے ایک دھماکے میں نقشہ ہی بدل گیا نہ پچھلی ریاست رہی نہ پرانی سیاست نہ قدیمی ماحول رہا نہ سابقہ فضائیزی کے ساتھ جاری شدہ نئے نئے احکام نے پچھلے دور کے بننے بنائے نقشوں کو یکسر بدل ڈالا تخفیف کی کلبھاری نے پرانے ملازمین کے جنگل کا صفایا کر کے میدان صاف کر دیا ہر سے نئی پلٹیں اتار دی گئیں ان بیرونی حکام نے خود کو فاتح تصور کیا اور بھوپال کی رعایا کو مفتوح گردان کر ان کے ساتھ ویسا برتاؤ شروع کر دیا دل ٹوٹ گئے ہمتیں پست ہو گئیں آزادی کا جو کچھ خواب دیکھا تھا وہ چکنا چور ہو کر رہ گیا سیاسی رہنماؤں نے آزادی کے بعد دودھ کی نہریں بہنے لگیں کہ چراغ جلانے کے جو خواب دکھائے تھے وہ حقیقت کی دنیا میں سراب ثابت ہوئے غرض انقلاب زندہ باد کی ایک نئی تفسیر سامنے آئی بنرجی پہلا چیف کمشنر ایک پرانا، آئی اسی، ایس تھا جس نے آہستہ آہستہ تبدیلیاں لانے کا عملی نظام بنایا لیکن اس کے جانشین و شوانا تھن نے آتے ہی افراتفری پھیلادی۔ زبانوں پر مہر لگا دی گئی اور قلم چلتے چلتے رک گئے آزادی پسند بڑے بڑے سوراچپ سادھو کمر بیٹھ گئے البتہ شیر بھوپال خان شا کر علی خان نے اس نئے راج کے خلاف سخت تقریر کر ڈالی وارنٹ جاری ہوا اور انھوں نے بھوپال سے رنجست سفر باندھ لینے میں ہی خیریت سمجھی اور دارالسلطنت دہلی پہنچ کر جمینہ علمائے ہند کے ساتھ خدمتِ خالق کے نئے میدانِ دنیویہ شورتوں

کی یازیابی کی مہم، میں حصہ لیا۔

اس وقت جب نوابی حکومت کی بساط لپیٹی جا چکی تھی اور چیف کمشنری راج نے پرانے نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا جس کا زیادہ تر نذر عضو صیف (مسلمانوں پر پڑ رہا تھا کیوں کہ ان کی بڑی تعداد ادنیٰ اور درمیانی درجوں کی ملازمتوں میں مست و مگن رہ کر تجارت و صنعت و حرفت سے کوسوں دور جا پڑی تھی۔
تخفیف کے دھچکے سے ان کا معاشی ڈھانچہ ڈھرام سے گر کر رہ گیا ایک طرف اس بیکاری و بے روزگاری کی بھنور میں پھنس کر کچھ لوگ پریشاں حالی میں پاکستان بھاگ نکلے لیکن زیادہ تر لوگ تلاش و معاش میں سرگڑاں ہو کر تجارت و صنعت کی طرف مائل ہوئے ایک طرف مسلمانوں میں بے روزگاری کا یہ طوفان امنڈ پڑا تھا دوسری طرف کسٹوڈین کی جوشاخ بھوپال میں قائم ہوئی اس نے اندھا دھند مسلم جائیدادوں کی ضبطیاں شروع کر دیں پرانے باشندوں کے مکانات پر قبضہ کر کے اندھیر مچا دی اس بے بسی اور پریشان حالی کے ماحول میں راقم الحروف نے اپنے استاد مولانا عبدالرشید مسکین کی صدارت میں اپنے مخلص ساتھیوں کے تعاون سے جمعیتۃ المسلمان کی داغ بیل ڈالی۔
شہر کے سیاسی رہنماؤں اور مخلص بزرگوں نے اس تنظیم میں جس قدر تعاون دیا وہ حد بیان سے باہر ہے بہر حال جمعیت کی طرف سے محلے محلے جلسے کئے گئے مسلمانان بھوپال کی دل جوئی و تسلی دلائی گئی احساس کمتری کو دور کیا گیا تجارت و صنعت کے ذریعہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی دوسری طرف کسٹوڈین نے جو اندھیر مچا رکھی تھی شہر کے معززین کو دعوت دے کر ایک مجلس عمل بنائی گئی اس وقت جو کچھ تھوڑا بہت کیا جاسکتا تھا اس فقیر نے اس فرض کو انجام دیا شہر کے سیاسی و سماجی مسلم کارکنوں کو اس رشتہ سے جوڑا اس

تنظیم کی دعوت پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مجاہد ملت
 حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ بھوپال تشریف لائے ان بزرگوں کی تقریروں سے
 دماغوں میں جو دھند چھائی ہوئی تھی دور ہوئی اور جو ذہنی انتشار اور عملی
 خلفشار پھیلا ہوا تھا وہ ایک حد تک کا فور ہوا پھر حیب راقم کچھ عرصہ کے لیے
 باہر چلا گیا تو مولانا خالد میاں انصاری، صدر اور شرقی عثمانی نے سکریٹری کی
 حیثیت سے اس ذمہ داری کو سنبھالا باہر کی واپسی پر مولانا صدر الدین اور اس
 حقیر نے جماعتی نظام کو مضبوط و مستحکم بنایا اور نئے صوبوں مدھیہ بھارت، مہاراشٹر
 اور وندھیا پر دیش کی جمیعتوں سے رشتہ اتحاد قائم کیا اس دور میں مسلم ممالک
 کے بے شمار مسائل فلسطینی قضیہ الجزائر کی آزادی کا قصہ، مراکش کا واقعہ نے
 پورے ملک میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی اس فقیر نے یہاں کی سیاسی جماعتوں کو فریستوں کے علاوہ
 سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ان کی آزادی و استقلالی کی تجویزیں
 متفقہ طور پر منظور کرا کے بھیجیں۔ اس دوران میں ہندو مسلم فساد کی لگی لہریں
 بھوپال کے امن پر ورسائل سے ٹکرانے لگیں ان کو روکنے اور مظلوموں کی
 امداد کرنے میں جمیعت نے اپنا رول ادا کیا۔ پھر جب بھوپال ایم پی کی راجدھانی
 بن گیا تو صوبائی جمیعت کا مرکز بھوپال ہی قرار پایا اور ایک عرصہ سے مفتی عبد الزاق
 خان صاحب اس نظام کو چلا رہے ہیں اور جمیعت اپنے اغراض و مقاصد کے
 ماتحت مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہے غرض وقت کا قافلہ آہستہ رفتار
 دریا کی طرح گزرتا رہا پچھلے زخم بھرتے چلے گئے پریشان حال مسلم عوام
 جدوجہد کے میدان میں کود پڑے زندگی نے اپنی بقا کے ساز و سامان
 مہیا کیے ہر شخص نئے حالات کے سانچے میں خود ڈھالنے میں لگ گیا آخری
 کمشنر بھگوان سہائے نے اپنی رواداری اور غریب پروری سے کچھلی سخت گیری
 کی تلافی کر کے عوام کو راحت پہنچائی اور بہت سی سہولتیں فراہم کیں پھر
 مرکزی حکومت نے ریاستوں کو تقسیم کر کے ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی

احکام جاری کئے چنانچہ بھوپال پارٹ سی کی ریاست ٹھہری اور عوامی انتخابات میں کانگریس کامیاب ہوئی بھوپال کے پرانے لیڈر ماسٹر لال سنگھ کے سرپرست وزارت کا تاج رکھا جاتا لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور مسٹر شنکر دیال شرمہ جو اپنے جوڑ توڑ اور عوام کے ساتھ رکھ رکھاؤ میں ماہر اور بھوپال کے اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھے ان کے حصہ میں وزارت ۱۹۵۷ء میں آئی طرزی مشرقی جو ناکر علیخان کو شکست دیکر کامیاب ہوئے اور بابو کامتا پرشاد سہنور وزارت میں لے گئے بہر حال چیف کمشنری راج سے بھوپال کو نجات ملی تو دماغوں کا بوجھ اتر گیا اور عوامی وزارت بننے سے مایوسیوں کے اندھیروں سے امید کی صبح نمودار ہوئی شاکر علی خاں دہلی سے واپس لوٹے تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تنگ راہ پارٹی بنائی بال کرشن گپتا گووند بابو مختار پرشاد۔ اکشے کمار موہنی دیوی اس پارٹی کے ارکان تھے نئی راہ نے کچھ عرصہ بعد کروٹ بدل کر کمیونسٹ پارٹی کا جامہ پہنا اور شاکر صاحب مزدور لیڈر کی روپ میں بھوپال کی سیاسی سطح پر نمایاں ہوئے جب کانگریس میں نیا خون دوڑایا گیا تو بھوپال کے پرانے کانگریسی پیچھے ڈھکیل دیئے گئے اور نئے نئے چہرے سامنے آتے گئے جو ڈاکٹر صاحب کی عصری سیاست کی مشاقی کی دلیل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دور حکومت میں بھوپال کو اونچا اٹھانے میں زبردست حصہ لیا ایچ۔ ایل۔ ایشیا میں بجلی کا عظیم کارخانہ ان کے دور کی یادگار ہے پرانے بھوپال نے نئے صنعتی اداروں کی شکل میں ایک نئے بھوپال کو جنم دیا۔

نیا بھوپال ایک جدید ترقی یافتہ شہر اور پرانا بھوپال آثار قدیمہ کی یادگار کے طور پر بدستور سابق قائم ہے اب ہم اس فصل کو ایم عرفان کی ایک تحریر پر ختم کرتے ہیں جس کے اندر انھوں نے بھوپال کی تحریک آزادی کے تاریخی ارتقاء

کا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

جب بھوپال میں جذبہ حریت معدوم تھا

تو فاضل محمد خاں، عارف شاہ، مہاپتھر
ولی شاہ اور مولاسیہؒ میں اپنا سر
دیکر اس کو وجود میں لائے۔

وہ نیم جاں تھا

سنہ ۱۸۸۷ء میں نواب صدیق الحسن خاں
نے اس کے اندر روح پھونکی۔

بے عمل تھا

سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا برکت اللہ بھوپالی
نے عمل سکھایا۔

خیالوں کی بستی میں تھا

سنہ ۱۹۲۲ء میں فیصلہ خان نے اس کو
ہوشیار کیا۔

حسین خواب دیکھ رہا تھا

سنہ ۱۹۲۶ء میں سید عبدالکریم عرف بابو میاں
نے بیدار کیا

ابھی کمسن تھا

سنہ ۱۹۲۹ء میں سید حامد رضوی نے چلنا
سکھایا۔

کم ہمت تھا

سنہ ۱۹۳۳ء میں سعید اللہ خاں رزمی نے
ہمت و جرات پیدا کی۔

عالم انتشار میں تھا

سنہ ۱۹۳۹ء میں شاکر علی خاں نے مستحکم کیا
(شعلہ جیات یکم ستمبر ۱۹۶۲ء)

بھوپال ایم پی کی راجدھانی

جب مرکزی حکومت نے صوبوں کی جدید تشکیل کی تو وسطانی صوبہ

یعنی مدھیہ پردیش، پچھلا اکائیوں (مہاکوٹھ، مالوہ، وندھیا پردیش اور
بھوپال) کو جوڑ کر ملکی سطح پر ابھر آیا یہ صوبہ رقبہ کی وسعت کے لحاظ سے ملک

کا سب سے بڑا صوبہ ہے اگرچہ یوپی، آبادی وغیرہ میں اس سے بڑھا ہوا ہے اس
 صوبہ کی جدید تشکیل کے بعد سب سے اہم مسئلہ راجدھانی کا تھا جس کے اندر مہا کوٹھل،
 اور مدھیہ بھارت کے لوگ اپنے علاقے کے شہروں (اندور، گوالیار اور جیلپور)
 کو راجدھانی بنانے پر زور دے رہے تھے جو اپنی شہریت و آبادی اور صنعتی ترقیات
 کے لحاظ سے راجدھانی بننے کا حق بھی رکھتے تھے ان کے مقابلہ میں شہر بھوپال ایک
 پرانی قدیمی شہر تھا لیکن جس طرح پورے ملک میں مدھیہ پر دیش قلب کی
 حیثیت رکھتا ہے اس لیے مدھیہ پر دیش کا دل بھوپال ہی ہونا چاہیے تھا۔
 چنانچہ بھوپال راجدھانی بناؤ کمیٹی نے اپنے ٹھوس و مضبوط دلائل سے اپنے مقدمے
 کو مرکز میں پیش کیا اس سلسلہ کے خصوصی ارکان ڈاکٹر شنکر دیال، شاکر علی خان
 ظہور ہاشمی اور خود نواب صاحب بھوپال بھی تھے اس صوبہ کے پہلے وزیر اعلیٰ
 روی شنکر شکلا ہوئے لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ
 کا بچونے اس کی باگ دوڑ سنبھالی ان کا وزارت دور افراتفری کا دور رہا ان کے
 ہی دور میں ساگر، جیلپور میں رسوائے عالم فسادات ہوئے جس پر پنڈت نہرو کے
 کہنے کے مطابق ملک کا سرشرم و ندامت سے جھک گیا افسوس ہے کہ ۳۵ برس گزر جانے
 کے بعد بھی ان فسادات کی وجہ سے ہمارا سر جھکا ہوا ہے پھر بھگت راؤ منڈلوی نے
 وزارت بنائی جس سے بہت کچھ توقعات تھیں لیکن کامراج پلان کے نفاذ نے
 ان امیدوں پر پانی پھیر دیا اس عرصہ میں حزب مخالف کی وزارت گووند رائے سنگھ
 نے قائم کی جس کو استیقام حاصل نہ ہو سکا اس کے بعد شیاماچرن شکلا نے
 اپنے اقتدار کا سک جھپٹا اس عرصہ میں اندرا مخالف لہر چلی اور پورے ملک
 میں غیر کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں چنانچہ اولاً کیلاش جوشی اور اور پھر
 ویر بندر گمار سکلیچا کی وزارت بنی جو کچھ عرصہ کے بعد تحلیل ہو گئی اور سن ۱۹۸۰ء کے
 انتخاب میں دوبارہ کانگریس کامیاب ہوئی اور ٹھاکرار جن سنگھ نے ۹ جون ۱۹۸۰ء
 کو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ درمیان میں پرکاش چندر سیٹی کی وزارت قائم ہوئی تھی

ان کا پنج سالہ دور حکومت صوبہ کی ترقیات اور اقلیتی تحفظات کے لیے سہرا ثابت ہوا اس دور میں ہمارا صوبہ فسادات کی دباؤ سے محفوظ رہا، اقلیتی مسائل اور پسماندہ طبقات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی جو کچھ مستقبل کے لیے خاکے بنائے گئے ہیں اگر اس میں عملی رنگ بھر دیا گیا اور نوکر شاہی آڑے نہ آئی جو فرنگی سامراج کی یادگار کے طور پر انتظامیہ پر چھائی ہوئی ہے تو ہمارے صوبے کا مستقبل شاندار ہے اگرچہ ہمارے ملک میں موجودہ جمہوریت باہر سے آئی ہے لیکن اس کی جڑیں اس سرزمین میں پنچائی نظام کی شکل میں پہلے سے موجود تھیں اس لیے یہ پودا حکومت اور عوام کی آبیاری سے ایک تناور درخت بنتا جا رہا ہے لیکن اس کی سست رفتاری اور نوکر شاہی کی رکاوٹیں عوام میں مایوسی پیدا کر دیتی ہیں لیکن امید کی جاتی ہے کہ تعلیم و سیاسی شعور کی ترقی کے ساتھ مطلع صاف ہوتا جائے گا۔

بھوپال ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی

شہر بھوپال جو ملک کے نیک نام و مقبول راجہ بھوج کے نام پر ابتداءً آباد ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں علم و معرفت کی شمع یہاں روشن ہوئی تھی حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں نہ وہ آبادی رہی نہ علم و معرفت کی روشنی یہ شہر اجڑ کر مایوسی کی بستی بنا رہا اس کی قسمت کا ستارہ دوبارہ اس وقت چمکا جب سرحد آزاد کے ایک سیدھے پچھے پٹھان سردار دوست محمد خان نے ۱۸۱۷ء اس کو دوبارہ آباد کیا پرانے باشندوں نے نئے آنے والے قافلوں کا استقبال کیا جو ملک کے مختلف خطوں سے آکر اس کی رونق بڑھاتے رہے سردار صاحب کے جانشین نواب یار محمد خاں نے بھوپال سے باہر کے علماء و فضلاء کو خصوصی طور پر مدعو کیا کہ شہر کی اصل رونق ارباب علم و فضل سے ہوتی ہے بعد کے نوابوں کے دور میں بھی شمال و جنوب سے آنے والے قافلوں کا تانا بندا رہا یہاں تک

بیگمات کے زریں دور میں باقاعدہ مہم کے طور پر ہندوستان کے شرفاء اور علماء و فضلاء کو دعوت دے کر یہاں بلا یا گیا اور جہانگیری و عہد سکندری میں شہر بھوپال میں دلی اور لکھنؤ کی تہذیب نے آکر دم لیا اردو زبان کی طرح بھوپال کی تہذیب مختلف تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف شہروں سے آنیوالے لوگوں کے باہمی ارتباط سے پیدا کر ایک حسین تہذیب کا گلدستہ بن کر نمودار ہوئی جس کی بنیادی خصوصیت باہمی رواداری و انسانی اور آپس کے تعلقات میں خوش گواری رہی اس طرح شہر بھوپال ابتداء ہی سے گونا گوں تہذیبوں اور بوقلموں تمدنوں کا شگم بنتا گیا اور یہاں کے باشندے ہر باہر کے آنیوالے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے بھوپال نے ہر باہر کے بھوپالی بن کر آنیوالے مہمانوں کا دل سے خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے دلوں میں جگہ دی سگدے کے بعد مسلمان مصیبت زدوں کا جس طرح دل کھول کر تعاون دیا اسی طرح پاکستان سے آنیوالے سندھی بھائیوں سے ہاتھ ملایا بھوپال تال کی یہ خاصیت مشہور چلی آرہی ہے کہ جس نے اس کا پانی پی لیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا چنانچہ بھوپال مرکزی راجدھانی دہلی کی طرح مختلف صوبوں کے باشندوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ بن گیا ہے حکومت ہند نے اس خصوصیت کو مخصوص کر کے یہاں بھارت بھون تعمیر کرایا جس کی بنیاد رکھنے والوں میں ایک راقم الحروف بھی ہے۔

بھارت بھون ہندوستانی قوموں کے ادب شاعری کا مرکز ہے جہاں آئے ادیبوں شاعروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شہر بھوپال کو پورے ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی ہونے کا حق حاصل ہے۔

تاریخ آزادی کا گم کردہ ورق

ہندوستان جنت نشان

رنگارنگ بھولوں کا ہے گلشن مراہندوستان
 اس چمن کے حسن پر نازاں ہے ارض ایشیا
 باغ جنت کے مانند ہے اس کے باغوں کی بہار
 اس کی ہر کھائی ہے تاباں اس کی ہر وادی چین
 خوبصورت خوش فضا ہیں اس کے محرا اور پہاڑ
 اس کے دریا بہہ رہے ہیں تپج و خم کھاتے ہوئے
 جوڑے چلے اس کے میدانوں کی وسعت الہا
 کس قدر شاداب ہے۔ دو آبہ گنگ و جمن
 کوہ ہندھیا چل کا پھیلاؤ نظر میں ہے بسا
 اس چمن کا گل کدہ کشمیر ہے جنت نظیر
 بسم و زر، نعل و گہر سے ہے بھرا کان و کن
 ساحلوں پر سرچکنے والی موجوں کا سماں
 آئینہ میں اس کے ہر ملک کی ہیں جھلکیاں
 باغبانِ بزمِ فطرت نے سجایا ہے اسے

ہر روش پر جلوہ فرما رنگ و بو کا کارواں
 دل رہا ہر خط اس کا ہر علاقہ دل کش
 آسماں سے باتیں کرتے ہیں یہاں کے کوہسار
 مہر گردوں کی طرح روشن ہمار کی جبین
 کیا بھلے لگتے ہیں میدانوں میں سرسبز جھاڑ
 جانب منزل رواں ہیں خوب اٹھلاتے ہوئے
 یا اتر کر آگیا ہے اس زمیں پر آسماں
 نور عرفاں کی شعاعیں ہر طرف جلوہ فگن
 اونچے نیچے ہے پہاڑوں کا سنہری سلسلہ
 ہر نظارہ جاں فزا ہر ایک منظر دل پذیر
 دل کش و دل چسپ اس خط کے ہیں کوہ و من
 دیکھنے سے اس قدر ہوتا ہے ہر دل شادماں
 ساری دنیا کے نمونہ ہے مراہندوستان
 خوشنما، گلستا قدرت نے بنایا ہے اسے

روزِ اول سے بنا ہے فیضِ انساں کا وطن
 خلد کی خوشبو سے مہکا ہوا میرا چمن

ہندوستان میں اسلام کا داخلہ

حضرت آدم کا لنگا میں ہوا پہلے نزول
حضرت شیت نبی کا بن گیا پھر جلوہ گاہ
قافلے انسانیت کے پے پے آتے رہے
قافلے گزر رہے ہیں کتنے اس کی ارض پاک پر
مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا گہوارہ وطن
سب سے آخر میں عرب کا قافلہ اتر آیا یہاں
تاجروں کا، صوفیوں کا کارواں باصفا
کو بج اٹھا نعمۂ توحید سے یہ گلستاں
اک نئی آواز شرق و غرب لہرانے لگی
شوق عرفاں کا پیام جاں فزا پسنے لگا
داعیان حق کی کتنی آواز صورت ارتقا
ہند کے ظلمت کدہ میں جگمگانی شمع نور
نور حق کی جگمگاہٹ سے جبیں روشن ہوئی
فاتحوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے شمشیر و سناں
فاتحوں کے دل میں لرزاں ہیں شرار اقتدار

اقتدار ان کا فقط جسموں پر ہوتا ہے ضرور
ان کی شخصیت مگر حسن عقیدت سے ہے دور

صوفیہ کرام اور اسلام

اصل دعوت کے امانت دار ارباب یقین
صوفیانے ذوق عرفاں کا جلایا ہے جبراع
بے غرض بندوں سے کھیلا ہے جہاں میں صلہ میں
آبیاری سے انہیں کے لہلہا اکھٹا یہ باغ

صوفیا ہیں نوع انساں کے حقیقی خیر خواہ
عشق حق سینوں میں ان کے الفت نوع بشر
ساری مخلوق خدا کا ان کے دل میں ہے پیار
خلق کے ہر اک ستم پر ہوتے ہیں سینہ سپر
ان کے دل پاکیزہ حب جاہ و حب مال سے
ان بزرگوں نے یہاں پھیلا یا روحانی نظام
ملک میں پھیلا جو ہے روحانیت کا سلسلہ
جلوہ نور قطب سے ہند روشن ہو گیا
اس گلستاں کے ہنکتے پھول ہیں بابا فرید
خواجہ صابر علی احمد ہے جن کا پاک نام
حضرت اقدس نظام الدین امام الاولیا
حضرت خواجہ نصیر الدین دہلی کے چراغ
ماہ و انجم کی طرح ہیں آسماں پر صوفشاں

ان کے دل ہمدردی انساں سے پہلے الفت پناہ
آئینے شان ربوبیت کے ہیں قلب و نظر
خلق کے ہر ایک دکھ پران کی آنکھیں اشکبار
رنج و راحت میں ہیں مخلوق خدا کے ہم سفر
ہر طرح فارغ اور یکسوچی کے اس جنجال سے
حضرت خواجہ معین الدین ہیں سب کے امام
خواجہ چشتی کے ہے فیض نظر کا ماجرا
فیض روحانی سے عرفاں کا نشیمن بن گیا
بارگاہ خلق میں مقبول ہیں بابا فرید
ان سے پھیلا اس علاقہ میں محبت کا پیام
ان کے نور قلب سے روشن ہوئی ساری فضا
ان سے تاباں ہو گئے ہندوستان کے باغ و مرغ
ان بزرگوں کی ضیاء باری سے روشن گلستاں

صوفیا چشت سے پر نور افغانوں کا دور
ملک میں پھیلا ہوا تھا معرفت کا زور و شور

دور مغلیہ میں دعوت تجدید حضرت مجدد الف ثانی

یک بیک تار کج تے تیزی سے الٹا اک ورق
اک بنا عہد سیاست ملک بھر میں چھٹا گیا
پھر چمک اٹھا جہاں کے پردہ پر ہندوستان
ذوق روحانی کے جھوٹے مدعی پیدا ہوئے
اس جفا پیشہ جماعت نے بگاڑا دین کو
عہد اکبر میں سیاست کو فروغ حاصل ہوا

شام کے پردہ پر چھایا جلوہ رنگ شفق
مغلیہ دور حکومت کا علم لہرایا گیا
اکبر اعظم کا عہد زریں کار و زرفشاں
پیشہ ور صوفی اور جھوٹے مولوی پیدا ہوئے
اپنی ادھی حرکتوں سے ہے اجاڑا دین کو
تبغ بے دینی سے دین مصطفیٰ گھائل ہوا

یوں چلی آندھی کہ جس سے ہو گیا تاراج باغ
دعوت تجدید سے جسکی کھلاک تازہ باب
اس نے دین مصطفیٰ کو پھر تروتازہ کیا
اپنے سینہ پر ستم کے تیر کھائے تھے بہت
اسکے سر پر سے تھے گزرے ظلم کے طوفاں ہزار
تافلے کو مل گئے پھر رہبران باصفا
شاہ عالم گیر و شاہ شاہ جہاں پیدا ہوئے
عام ہے قانون قدرت ہر کمالے راز و ال
خاندان مغلیہ کا کرد و فر جاتا رہا
سامراجی پنجم میں گویا ہوئے قید و اسیر

سازشوں کا جال سارے ملک میں بچھتا گیا
رفتہ رفتہ سب کو زنجیر غلامی میں کا

ہندوستان میں سامراج کا حملہ

آگے خطرہ میں سارے صاحبان تخت و تاج
سامراج اٹھا کر گویا فتنہ گر شیطان اٹھا
اپنے مکر و دجل سے سب کو بنا ڈالا غلام
ملکوں کو باہم لڑا کر فتنوں کو برپا کیا
نت نئے طوفان لے کر جیسے شیطان آگیا
تو ظلمت کے جلو میں آگے بڑھتی ہے حیات
جد و جہد زندگی سے ملتی ہے راہ نجات
جس کے ہاتھوں مٹا ہے آفاق سے شر و فساد
قوت باطل سے پنجم آزما پیدا ہوئی

نور علم و معرفت کا بجھ گیا روشن چراغ
مطلع سرہند سے نکلا درختاں آفتاب
جمع اس نے ملت بیضار کا شیرازہ کیا
راہ دعوت میں مصائب گواٹھائے تھے بہت
اپنی دعوت پر رہا قائم وہ مرد پُر وفار
قافلہ اسلام کا پھر راہ حق پر چل بیڑا
نسل تیموری میں فخر خاندان پیدا ہوئے
قعر پستی میں ہو کر ناہر بلندی کا مال
نت نئے فتنوں کا طوفاں چرخ پر چھتا رہا
بن گئے کمزور و بے بس ملک کے شاہ و وزیر

حملہ آور ہو گیا اب ایشیا پر سامراج
نہیب و تہذیب پر حملوں کا اک طوفاں اٹھا
مغربی ملکوں نے پھینکا ایشیا میں پنا دام
خانہ جنگی کے نئے ماحول کو پیدا کیا
ہند کی روشن فضا میں اک اندھیرا چھا گیا
بزم فطرت میں جہاں دن ہے وہیں موجودات
حق و باطل کا تصادم سرخی نقش حیات
جد و جہد زندگی کا صفحہ روشن جہاد
اک جماعت حق پسند باصفا پیدا ہوئی

وہ جماعت برسر میدان باطل آگئی سامراجی فوج کے مد مقابل آگئی
ملک میں قائم ہوا دعوت کا روحانی نظام
حضرت شاہ ولی اللہ ہیں اس کے امام

دعوتِ ولی اللہی اور ہندوستان

وہ حکیم الہند، فخر کشور ہندوستان
اس کے خامہ نے انوکھی شرع کی تفسیر کی
سب سے پہلے اس نے کھولی حکمت قدر معاش
جب تک قائم نہ ہو موزوں معاشی انتظام
اسکی دعوت کی ہے عالمگیر قدرون پر اس
سب سے پہلے اس نے چھیڑا ہے معاشیات کو
انقلابی فکر سے روح عمل بیدار کی
شاہ صاحب کی ہے دعوت، دعوتِ علم و یقین
پھونکی اس دعوت نے اہل دین میں فوج انقلاب
اس کی شاخیں پھوٹ نکلیں ملک کے اکناف میں
داعی اکبر بنے اس کے شرع عبدالعزیز
شارح قرآن و سنت، مجدد عظمت کے نشان
کس قدر نئی تیغ بُرائی وہ تیغ و تیغ مسلم
ملک کے ہر گوشہ میں کھلبلی سی مچ گئی
ظلم و دہشت کے پہاڑ اس ذات پر توڑے گئے

جس کی حکمت کی زباں ہے زندگی کی تر جہاں
دین فطرت کی نرالی شرح عالمگیر کی
کر دیا اسرار دین کو اپنی تحریروں سے فاش
کار فرما ہو نہیں سکتا شریعت کا نظام
اس کے قامت پر اگرچہ زیب و تن ملکی لباس
سب سے پہلے اس نے پرکھا عصر کے حالات کو
سامراجی طاقتوں کو دعوت پیکار دی
فکرِ روشن سے منور اس کی تابندہ جہیں
جاگ اٹھے اس کو سن کر خفتگانِ بزم خواب
خوب پھیلی یہ جماعت ہند کے اطراف میں
نابغہ اس عصر کے اور صاحبِ فضل و تمیز
حکمت و فکر ولی اللہ کے تھے ترجمہاں
فتویٰ دارالحراب کا دبکرا اٹھایا اک قدم
سامراجی طاقتوں کو آگئی اک جھرجھری
اس کے جسم زار پر یہ ستم توڑے گئے

راہ حق کا وہ مجاہد آگے ہی بڑھتا رہا
کوہ طور امتحاں پر بے تکاں چڑھتا رہا

دعوتِ جہاد اور سید احمد شہید

فوج باطل کے مقابل ہو گئی اگر کھڑی
 قافلہ سالار اس کے سید احمد شہید
 خلق کی رشد و ہدایت کے لیے دورہ کیا
 ہر طرف ذوق شہادت ہو گیا جلوہ فشاں
 لا کر میدان میں عدو سے معرکہ آرا کیا
 ہو گئے ظاہر افق پر فتح یابی کے نشاں
 جاگ اٹھا ذوقِ عبادت، بندگی کا اہتمام
 سر زمین کوہ و صحرا، وادی ایمن ہوئی
 منظر عہدِ نبوت ہر نظر میں چھا گیا
 کر دیا شیطان نے سرداروں کو آتش زیر پا
 اک شب میں ذبح کر ڈالے جو قاضی تھے وہاں
 اہل دل کی آنکھوں کو اشکوں سے پرہم کر دیا
 قصر دیں کو ڈھا دیا باطل سے رشتہ جوڑ کر
 کس مسرت سے شہید راہ الفت ہو گئے
 مہرِ خن خون شہادت سے ہے تاباں بالا کوٹ
 کر لیا ان جاں نثاروں نے نیا اک بند و بست
 فوج سے برطانیہ کے معرکہ فسر مار ہے
 سلطنت برطانیہ کی جڑ ہی کٹ کر رہ گئی

اس چمن میں داغ بیل اسکی جماعت پیڑی
 ہر مجاہد اس جماعت کا جواں بخت وسیع
 دعوت ارشاد کا اک سلسلہ برپا کیا
 نور عرفاں کی شعاؤں سے چمک اٹھا جہاں
 سرحد آزاد جا کر نظم ملت کا کیا
 کچھ دنوں میں کامیابی نے قدم چومے وہاں
 جلوہ فرما ہو گیا سرحد میں اسلامی نظام
 جلوہ ایشارہ الفت سے فضا روشن ہوئی
 ایسا لگتا تھا صحابہؓ کا زمانہ آگیا
 جب مسلسل فتح یاب ہوتے گئے اہل غزا
 عہدِ گنی پر ہوئیں آمادہ خفیہ بستیاں
 غدر کر کے نظم اسلامی کو برہم کر دیا
 نذر سازش ہو گئے سردارِ پمیاں توڑ کر
 یہ مجاہد نذر میدان شہادت ہو گئے
 ملک کی تاریخ آزادی کا عنوان بالا کوٹ
 قافلہ نے اہل ہمت کے زمانہ یہ شکست
 ایک نیا عزم جواں لے کر نبرد آرا رہے
 یہ جماعت برسرِ پیکار آخر تک رہی

دعوتِ ارشاد

ایک نیا نقشہ جہاد حق کا ابھرا ہند میں اس نئے نقشہ سے اک سیلاب اٹھا ہند میں

غازیوں کی اک جماعت مصلحوں کا اک گروہ
 ملک بھر میں داعیانِ حق کا سچا فائدہ
 تحفہ علم و عمل تقسیم فرمانے لگا
 ہیبتِ حق کی ضیائے ان کے چہرے پر شکوہ
 پھر لگا پھیلانے ایمان و یقین کا سلسلہ
 دعوتِ ایمان و عرفان عام فرمانے لگا
 ہو گیا تھا ملک میں کمزور مرکز کا نظام
 جہل میں ڈوبے ہوئے تھے ملک کے اکثر عوام

فرنگی سامراج اور ہندوستان

سرزمین ہند میں لہرا سکے ان کا علم
 دھیرے دھیرے ہو گیا غالب فرنگی سامراج
 رفتہ رفتہ ملک میں اس کے قدم بڑھنے لگے
 ظلم کے ہاتھوں مخالف اک فضا پیدا ہوئی
 آگ سینوں میں بھڑک کر تیز تر ہونے لگی
 رکھے انگریزوں نے پردہ میں تجارت کے قدم
 ظلم و دہشت اس کی فطرت، لوٹ مار اس کا فراموش
 مکر کی سیڑھی لگا کر بام و در چڑھنے لگے
 اپنے ہتھ کھنڈوں سے خود ہی مکین بنی رہا ہوئی
 ملک کی ساری فضا زیرِ سر ہونے لگی
 ساری قویں سینہ تانے آگئیں میدان میں
 تہلکہ اک مچ گیا اقلیم ہندوستان میں

معرکہ جہاد سنہ ۱۸۵۷ء

بے محابا اس جماعت نے اٹھایا پھر قدم
 اس جہاد حریت میں سب ہی حق آگاہ تھے
 حضرت قائم، رشید احمد تھے اس میں سربراہ
 فتح کر کے بڑھ رہے تھے اہل عرفان و یقین
 غدر سے اپنوں سے پھر پانسہ پلٹ کر رہ گیا
 خوب ڈھایا ملک میں جو روستاں انگریز نے
 ظالموں کے پنجہ میں جب نظم ملکی آگیا
 اپنے کندھوں پر اٹھایا پھر بغاوت کا علم
 قافلہ سالار اس کے حاجی امداد اللہ تھے
 تھے دلی الہی جماعت کے یہ سب نور نگاہ
 شاہرِ عادل ہے اس پر شامی کی سرزمین
 سارا ہنگامہ بغاوت کا سمٹ کر رہ گیا
 لال قلعہ پر اٹھایا پھر علم انگریز نے
 ملک جو دہ ظلم کی تلوار سے تھرا گیا

تعلیمی دعوت اور دیوبند

اک نیا خاکہ بنایا ربط خاص و عام کا
ملت بیضار سے تازہ رابطہ قائم کیا
نسخہ تحریک آزادی سمجھیں آگیا
اوج رفعت سے لڑھک کر قعر پستی میں گری
خانہ دل تیرگی سے اس کا دیرانہ رہا
اس زمیں سے آسماں تک علم کی ہے جلوہ گاہ
علم کے زیر نگین ہے محفل کون و مگیاں
ظاہر و باطن کی آمیزش سے ہے علم یقین
روح و تن کے رشتہ سے قائم ہے جیسے زندگی
یعنی پورب جاگ اٹھا اور ایشیا سوتا رہا
انقلابی روح پیدا ہوتی ہے تعلیم سے
قوت باطل سے پنجہ آزما ہوتا نہیں
یہ جہاں رنگ و بو، اک عرصہ پیکار ہے
نیوکوکاری سے جہاں میں کھلتی ہے راہ معاد
محو ہو جاتا ہے دل سے زندگی کا خوف و غم
ہند میں جس نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
تربیت پلنے لگے آ کر ملت کے حوال

اس جماعت نے نیا نقشہ بنایا کام کیا
درس گاہوں کا سفری سلسلہ قائم کیا
ملک کے ہر گوشہ میں اک جال سا بچھتا گیا
جہل کے ظلمات میں جو قوم پھنس کر رہ گئی
علم کے ذوقِ تجسس سے جو بے گانہ رہا
علم اک نورِ سحر ہے جہل اک شام سیاہ
علم ہے تسخیرِ فطرت علم ہے تسخیرِ جاں
علم ظاہر علم سائنس، علم باطن، علم دین
علم دین و علم دنیا میں ہے ربط باطنی
غفلتوں میں علم کی میراث کو کھوتا رہا
قوم بنتی ہے جہاں میں قوت تنظیم سے
آدنی جب تک کہ حق سے آشنا ہوتا نہیں
حق شناسی آدنی کے واسطے تلو الہ ہے
ہر عمل نیکی کا انساں کے لیے ہے اک جہاد
لوح دل میں جب ہوا نقش صداقت مرسم
علم کا مرکز بنی پھر سر زمین دیوبند
بن گیا اک قلعہ آزادی پسندوں کا جہاں

ہو گئے پھر جمع اس مرکز میں ارباب نظر
شورِ حریت سے گونج اٹھے بام و در
شیخ الہند کی دعوت جہاد

جادۂ حق کا مجاہد، رہ نما پیدا ہو

اس جماعت میں سے مرد با صفا پیدا ہوا

عشق حق کے واسطے اسکی خوشی تھی اس کا غم
 عشق حق کی راہ میں سرمست دیوانہ رہا
 جلوہ اخلاص کامل اس کے چہرہ کا تھا نور
 کم رہا پردہ میں گمنامی کے مرد خوش سیر
 وہ مجاہد جس کی ہستی خود بجاتے انجمن
 اس مجاہد نے مذاق حریت تازہ کیا
 جس نے آزادی کی پھر تحریک کو جاری کیا
 بیچ دعوت کا وہ ارض ہند میں بوتا رہا
 شیخ کا حلقہ عقیدت کا تھا پھیلا ہوا
 ملک کے مشہور رہبر شیخ کے تھے ہاں نشان
 اس قدر دعوت یہ خفیہ ملک میں چلتی رہی
 اس کے دل کی آگ پھیلی ارض یاغستان تک

ہر طرف بڑھتا رہا اس کے ارشاد کا دائرہ

شعلہ خاموش کے مانند اس کا سلسلہ

جنگِ عظیم اور شیخ الہند

ناگہاں یورپ میں بھڑکا اک شرار جنگ کا
 یہ تباہی دیکھ کر دل ہو گیا اس کا دو نیم
 روشنی آئی نظر ظلمت میں صبح عید کی
 باندھ لی اپنی کمران تازہ احساسات سے
 راہ ہجرت پر ہوا مرد مجاہد گامزن
 جا کر مکہ اور مدینہ میں بچپانی اک بساط
 ہند کا آزاد کرنے کا نیا نقشہ بنا

پھیلتا بڑھتا گیا، خونیں نظارہ جنگ کا
 جنگ کے شعلے جو بھڑکے بن گئی جنگِ عظیم
 اس اندھیرے میں سے کھوئی اک کرن امید کی
 صبر کا پیمانہ چھلکا ان نئے حالات سے
 اپنے نصب العین کی خاطر لیا ترک وطن
 ترک کے سرداروں سے قائم کیا پھر ارتداد
 جس کا ہر اک مرحلہ تھا پرخطر صبر آزما

پر خطر میدانوں میں ہر اک فدائی کھٹا کھڑا
 سلطنت برطانیہ سے کھٹا اضافت کا نظام
 سوز دل سے چرخ پر برق و شر پیدائے
 ایک کو اک نئے عبید اللہ سندھی جن کا نام
 حضرت شیخ حسین احمد ہوتے جو بالمشین
 برکت اللہ مطاع بھوپال کے ماہ تمام
 سیکڑوں انجم تھے اس چرخ ملکوبیں جڑے
 دوسرا جنگی محاذ پھر شیخ نے قائم کیا
 پھل رب مرجھارے تھے اس میں سرودیا من
 ہند کی آزادی ملی اب حکومت بن گئی
 ایشیا کے چرخ پر پھر کالی بدلی چھا گئی
 دیکھتے ہی دیکھتے پانسے پلٹ کر رہ گیا
 اتحادی طاقتوں کا بول بالا ہو گیا
 اپنے موقف پر رہا قائم وہ مرد خدا
 ہے شکست و فتح کا قصہ خدا کے ہاتھ میں
 رشتہ جد و جہد کا انساں کے ہاتھوں میں دیا
 خالق کمال نے کیا انسان کو پابند عمل
 ہر نتیجہ کا ہے مالک، مالک ہر دوسرا
 تخم زمین کی ہے حد تک محنت ہر کاشتکار
 ان بزرگوں نے ہے ڈالا تخم محنت کا یہاں
 انکے خوابوں سے اس گلشن میں آئی ہے بہار
 اس چمن میں پھول پھل ان کی ہی محنت سے لگے
 راہ حق پر گامزن ہر دم رہے مردان کار

جاں نثاروں نے کیا اپنے فریضہ کو ادا
 ریشمی سازش کا جس کو دیر یا بد نام نام
 مطلع اخلاص سے شمس و قمر پیدا ہوئے
 چرخ پر قربانیوں کے ان کا ادبچاہے مقام
 چمکے جو عالم میں بن کر یادگار آخر میں
 صفحہ تاریخ عالم پر درخشاں جن کا نام
 صفحہ عالم میں جن کے جا بجا جھنڈے گڑے
 سوئے کابل شیخ سندھی کو روانہ کر دیا
 بن گیا تھا شہر کابل انقلابوں کا چمن
 یہ حکومت ثمرۃ تاریخ دعوت بن گئی
 پھول بننے سے ہی پہلے یہ کلی مرجھا گئی
 شیخ کا منصوبہ ملوثانوں میں گھر کر رہ گیا
 ایشیا کا چرخ پھر ظلمت سے کالما ہو گیا
 شہسوار حریت ہے وہ اسیر مالٹا
 جیت کا اور بار کا رشتہ خدا کے ہاتھ میں
 عہد و پیمان عمل قدرت نے ہم سے ہے لیا
 ہر نتیجہ کا ہے مالک خود خدا نے لم یزل
 فیصلہ ہے "یس للانسان الا ما سعی"
 فیصلہ کا انسان قدرت پروردگار
 پھوٹ کر پودا ہوا تازہ ہواؤں سے جواں
 جلوۂ خون شہادت سے گلستاں لالہ زار
 کس مزد سے ان پھولوں کو سارے انسان لہار
 خلق کی خدمت خلوص دل سے ان کا تھا شعار

پردہ ہیں خلاص کے ہر طرح پوشیدہ رکھا
 یہ نفوس قدسیہ مہر و مہ افلاک ہیں
 صفحہ تاریخ گویا ہے ان کے نام سے
 حلقہ اہل سیاست حلقہ نام و نمود
 ہر عمل شہرت کی خاطر ہر قدم بھر دیا
 یہ نفوس قدسیہ ہیں نازش انسانیت
 چہرہ تاریخ نورانی ہے ان کے نام سے

ان کا ہر ہر کار نامہ حسینۃ الشریعہ ہا
 شہرت و نام آوری سے ان کے دامن پاک ہیں
 ہر عمل ان کا تھابے پر داغ انجام سے
 ان کے دام مکر سے نالاں ہے بزم ہست بود
 پاک ان ذہنوں سے یکسر دامن اہل صفا
 نے سیاست ان کا مقصد نے حصول سلطنت
 مفتخر یہ بزم انسانی ہے ان کے نام سے

ان کے اخلاص عمل سے دہر کا قائم نظام
 ان نفوس پاک پر ہو حق کی رحمت اور سلام

(ختم شد)